MAAR202CCT

بلاغت وعروض

ایم۔اے،عربی

(سمسٹر-II)

پرچہ دوم

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

حیدرآباد،تلنگانہ،انڈیا-500032

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

ISBN: 978-93-80322-59-9

First Edition: July, 2020

Second Edition: November, 2022

ناشر	:	رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
اشاعت	:	نومبر 2022
تعداد	:	1100 کاپیاں
سرورق	:	ڈاکٹر محمد اکمل خان، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
مطبع	:	اریہنت آفسیٹ، نئی دہلی

Rhetoric & Prosody

for

M.A. Arabic 2nd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in **Publication**: ddepublication@manuu.edu.in

Phone: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher(registrar@manuu.edu.in)

کورس کوآرڈینیٹر

پروفیسر سید علیم اشرف

مصنفین	اکائی نمبر
اجمل فاروق (انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی)	1 تا 4
ڈاکٹر سید محمد عمر فاروق (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)	5
ڈاکٹر محمد رحمت حسین (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)	6
ڈاکٹر ثمینہ کوثر (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)	7,15,16
محمد اعظم ندوی (المعہد العالی الاسلامی)	8 تا 14

مدیران

محمد اعظم ندوی (المعہد العالی الاسلامی)

ڈاکٹر محمد فضل اللہ شریف (عثمانیہ یونیورسٹی)

ڈاکٹر ثمینہ کوثر (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)

ڈاکٹر محمد عبدالعلیم (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)

ڈاکٹر سید محمد عمر فاروق محمد موسی (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)

ڈاکٹر محمد رحمت حسین (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)

فہرست

پیغام		وائس چانسلر	6
پیغام		ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم	7
کورس کا تعارف		کورس کوآرڈینیٹر	8
بلاک	**I**	**علم بلاغت کی تاریخ**	
اکائی	1	علم بلاغت	11
اکائی	2	فصاحت وبلاغت	32
اکائی	3	اسلوب اوراس کی قسمیں	41
اکائی	4	عظیم علمائے بلاغت	51
بلاک	**II**	**علم البیان**	
اکائی	5	علم بیان کی اہمیت وارتقا۔تشبیہ اوراس کی قسمیں	61
اکائی	6	مجازمرسل،مجازعقلی وکنایہ	88
اکائی	7	استعارہ:تعریف اوراقسام	104
بلاک	**III**	**علم المعانی**	
اکائی	8	علم المعانی کاارتقا	114
اکائی	9	خبراس کی اغراض وانواع	133
اکائی	10	انشاءاوراس کی قسمیں	151
اکائی	11	قصر،وصل،فصل	169
اکائی	12	ایجاز،اطناب،مساوات	186

بلاک IV علم البدیع

اکائی	13	علم بدیع کا ارتقا	199
اکائی	14	علم بدیع کی قسمیں	214
اکائی	15	عروض وقافیہ: تعریف واہمیت	235
اکائی	16	بحر اور اس کی قسمیں	256
		ماڈل پیپر برائے امتحان	**279**

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1)اردو زبان کی ترویج وترقی (2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور(4)تعلیم نسواں پرخصوصی توجہ۔یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کوفروغ دینے کا واحد مقصد ومنشا اُردوداں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کردیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت وبقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد وپیش ماحول کے مسائل ہوں،عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کردی ہے۔یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اوراس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرینِ علم کے بھر پور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منارہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہورہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم ازسرنو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہورہے ہیں۔گرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل وابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن
وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگراور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اوراس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہورہے ہیں۔مولانا آزادنیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِتعلیم کواختیارکیا۔مولانا آزادنیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اورٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوااوراس کے بعد2004میں باقاعدہ روایتی طرزتعلیم کا آغاز ہوااور بعدازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔نو قائم کردہ شعبہ جات اورٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپورتعاون سے مناسب تعداد میں خودمطالعاتی موادتحریرو ترجمے کے ذریعے تیارکرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یوجی سی۔ڈی ای بیUGC-DEBاس بات پرزوردیتارہاہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اورنظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اورنظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اورروایتی طرزِتعلیم کی جامعہ ہے،لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یوجی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اورروایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کوہم آہنگ اورمعیار بلند کر کے خوداکتسابی موادSLMازسرِنو بالترتیب یوجی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیارکرائے جارہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یوجی،پی جی،بی ایڈ،ڈپلوما اورسرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلارہا ہے۔بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔متعلمین کی سہولت کے لیے9علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اورسری نگراور6ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد،لکھنؤ، جموں،نوح، وارانسی اورامراوتی کاایک بہت بڑانیٹ ورک تیارکیا ہے۔ان مراکز کے تحت سرِدست144متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres)20 پروگرام سنٹرس(Programme Centres) کام کررہے ہیں، جوطلبا کوتعلیمی اورانتظامی مددفراہم کرتے ہیں۔نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اورانتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کردیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کوخوداکتسابی موادکی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جارہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ویڈیوریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پرفراہم کیا جائے گا۔اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جارہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن،مفوضات،کونسلنگ،امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اورمعاشی حیثیت سے پچھڑی اردوآبادی کومرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسرمحمدرضاء اللہ خان

ڈائرکٹر،نظامت فاصلاتی تعلیم

کتاب کا تعارف

عربی زبان دنیا کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ زبانوں کے افرو-ایشیائی خاندان کے ایک بڑے لسانی گروہ سامی زبانوں کا حصہ ہے، دوسری سامی زبانوں میں عبرانی، آرامی اور امہری وغیرہ شامل ہیں۔ عربی اقوام متحدہ میں استعمال ہونے والی چھ رسمی زبانوں میں سے ایک ہے، بائیس عرب ممالک کی سرکاری زبان اور کئی ملکوں کی دوسری سرکاری زبان ہے جیسے: مالی، چاڈ، اریٹیریا اور صومالیہ وغیرہ۔ عربی زبان عہد وسطی میں علم و حکمت اور سائنس وٹکنالوجی کی زبان تھی، اس حیثیت کے سبب اس نے دنیا کی تقریبا سوزبانوں کو متاثر کیا ہے اور انھیں ہر دو علمی ولغوی اعتبار سے مالا مال کیا ہے، جن میں سرفہرست فارسی ترکی اور اردوزبانیں آتی ہیں۔ آج کے تناظر میں بھی عربی ایک اہمیت کی حامل زبان ہے۔ شرق اوسط میں تیل کی دولت سے مالا مال ملکوں کی موجودگی نے اس زبان کی اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے اور عربی زبان اور اس کے متعلمین و مکتسبین کے لیے کئی نئے امکانات کے دروازے کھول دیے ہیں۔

زیر نظر کتاب فاصلاتی نظام تعلیم کے ایم اے عربی سمسٹر-II کے طلبہ کے لیے تیار کی گئی ہے جو روایتی طرز تعلیم کے طلبہ کے لیے بھی یکساں طور پر مفید ومعاون ہے، کیونکہ یہ بیورو برائے فاصلاتی تعلیم (DEB) کی ہدایات مجریہ 18-2017 کے مطابق ہے، جس کے بموجب فاصلاتی اور روایتی دونوں طرز تعلیم کا نصاب یکساں ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ کورس مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں جاری روایتی طرز تعلیم کے ایم اے کے نصاب کے عین مطابق ہے۔

یہ کتاب چار بلاک اور سولہ اکائیوں پر مشتمل ہے جو علم بلاغت اور عروض سے متعلق ہے۔ اس کا مقصد طلبہ میں بلیغ اور غیر بلیغ کلام میں فرق کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ نیز علم البیان، علم المعانی اور علم البدیع کے اسرار و رموز اور ادبی اہمیت وافادیت سے واقف کرانا ہے۔ اسی طرح علم عروض وقافیہ کے ذریعے طلبہ میں شعری ذوق پیدا کرنا اور شعری اوزان کے پرکھنے اور سمجھنے کی قدرت پیدا کرنا مقصود ہے۔ واضح رہے کہ ابتداءً یہ کتاب 20 اکائیوں پر مشتمل تھی جن میں سے بعض کو حذف کر دیا گیا ہے اور بعض کو دوسری اکائیوں میں ضم کر دیا گیا ہے اور یہ تبدیلی بیورو برائے فاصلاتی تعلیم (DEB) کے اصول وضوابط کے مطابق کی گئی ہے۔

اس کتاب میں جو بنیادی تبدیلی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بلاک نمبر ایک میں اکائی نمبر 1 (علم بلاغت: تعریف واہمیت) اور اکائی نمبر 2 (علم بلاغت: آغاز وارتقا) کو باہم ضم کر کے ایک ہی اکائی بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح بلاک نمبر دو میں اکائی نمبر 5 (علم بیان کی اہمیت وارتقا) اور اکائی نمبر 6 (تشبیہ اور اس کی قسمیں) یہ دو الگ الگ اکائیاں تھیں جنہیں آپس میں ملا کر ایک اکائی بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح تیسرے بلاک میں اکائی نمبر 4 (قصر، وصل اور فصل) اور اکائی نمبر 5 (مساوات، ایجاز اور اطناب) کو باہم ضم کر دیا گیا ہے۔ چوتھے بلاک میں اکائی نمبر 1 (علم العروض: تعریف و اہمیت) اور اکائی نمبر 3 (قافیہ: تعریف واہمیت) جو مستقل علیحدہ علیحدہ اکائیاں تھیں جنہیں تکنیکی ضرورت کے پیش نظر باہم ضم کر دیا گیا۔ اس طرح

اب یہ کتاب چار بلاک اور سولہ اکائیوں پر مشتمل ہے۔

کتاب کے پہلے بلاک میں فصاحت و بلاغت کی تعریف و اہمیت، اسلوب اور اس کی قسمیں اور عظیم علمائے بلاغت کی سوانح حیات اور ان کی خدمات کا مفصل بیان ہے۔ دوسرے بلاک میں علم بیان کی اہمیت و ارتقا، تشبیہ کے اقسام اور استعارہ کی تعریف و اقسام پر بہت ہی جامع انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا بلاک علم معانی پر مشتمل ہے جس میں علم معانی کے آغاز و ارتقا کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ نیز خبر و انشاء کے اغراض و مقاصد اور ان کی اقسام سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح قصر، وصل، فصل، ایجاز، اطناب اور مساوات کو مثالوں کے ذریعے بہت سے سمجھایا گیا ہے۔ چوتھے اور آخری بلاک میں علم معانی کے نشو ونما اور اس کی تمام اقسام کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح علم عروض و قافیہ کی تعریف و اہمیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ بحر اور اس کی قسموں کو بھی مع امثلہ قلم بند کیا گیا ہے۔

چونکہ اس کتاب کو ''خود اکتسابی مواد'' (S.L.M.) کے طور پر تیار کیا گیا ہے لہٰذا ان اصولوں اور طریقوں کی پوری طور پر رعایت کی گئی ہے جن کی روشنی میں اس قسم کا تعلیمی مواد تیار کیا جاتا ہے، تاکہ فاصلاتی نظام کے طلبہ کو ان اسباق کے پڑھنے اور سمجھنے میں نہ کوئی دقت آئے نہ کسی بیرونی ذریعے یا خارجی مدد کی حاجت پیش آئے۔

پروفیسر سید علیم اشرف

کورس کوآرڈینیٹر

اکائی 1 علم بلاغت

اکائی کے اجزا

1.1 تمہید

1.2 مقصد

1.3 تعریف

1.3.1 علمائے بلاغت کے اقوال

1.3.2 مختلف تعریفات کے نتائج

1.4 اہمیت

1.4.1 تاثیر کلام

1.4.2 ذوق کی تشکیل

1.4.3 فرد کی تعمیر

1.4.4 معاشرتی انقلاب

1.5 عروج وارتقا

1.5.1 زمانۂ جاہلیت

1.5.2 عہدِ نبوت اور خلافتِ راشدہ

1.5.3 اموی دورِ حکومت

1.5.4 عباسی دورِ حکومت

1.6 اکتسابی نتائج

1.7 فرہنگ

1.8 امتحانی سوالات کے نمونے

1.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.1 تمہید

انسان اپنی زبان سے جو باتیں نکالتا ہے وہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا اور کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کو ادا کرنے والا کوئی خاص مقصد رکھتا ہے۔ ایسے بامعنی کلام کو ہی حقیقت میں کلام کہا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ جس بات کا کوئی مطلب ہی نہ ہو، اس کو زبان سے ادا کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے اصل کلام وہ ہے، جس کا کوئی مطلب ہو اور جس کو پڑھنے یا سننے کے بعد قاری یا سامع کوئی بات سمجھ سکے۔

یہ بامقصد کلام کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، جس کو سن کر یا پڑھ کر انسان اس میں کہی گئی پوری بات تو سمجھ جاتا ہے، لیکن اسے وہ کلام پڑھنے یا سننے میں بالکل مزا نہیں ملتا۔ اس کے برعکس کبھی کبھی یہ کلام ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بات بھی سمجھ لیتا ہے اور اس کلام کا سننا یا پڑھنا اسے لطف بھی دے جاتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ متکلم جب اپنی بات کو اچھے کلام کے اصول وضوابط کے مطابق ادا کرتا ہے تو وہ پڑھنے والے کو ایک خاص انداز سے لطف اندوز بھی کرتا ہے، لیکن جب متکلم ان اصول وضوابط کا خیال نہیں رکھتا تو پڑھنے والا بات سمجھنے کے باوجود اس کا لطف حاصل نہیں کر پاتا، بلکہ وہ کلام بسا اوقات اپنا مفہوم ادا کرنے کے باوجود باذوق انسان کے ذہن ودماغ یا سماعت کو ناگوار بھی ہوتا ہے۔ وہ کلام جو پڑھنے یا سننے والے کو بھاتا ہے، اسے کلامِ بلیغ اور جو پڑھنے یا سننے والے کو ناگوار ہوتا ہے، اسے کلامِ غیر بلیغ کہتے ہیں اور ان امور کی طرف رہنمائی کرنے والے علم کو علم بلاغت کہتے ہیں۔

کسی بھی انسان، علاقے یا علم کے متعلق گہری معلومات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ہمیں اس کی تاریخ بھی معلوم ہو۔ تاریخ کی معلومات کے بغیر ہم کسی بھی چیز سے مکمل باخبری یا کسی بھی فن پر مہارت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جب ہم کسی چیز کے آغاز، نشوونما اور ارتقا کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں تو ہماری نظروں میں اس چیز کا پورا خاکہ آ جاتا ہے۔ اس سے ہمیں اس علم کی ضرورت، اہمیت اور اس کے اہم ادوار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ معلومات اگرچہ اُس علم کی تاریخ ہوتی ہے اور اُس علم کے اصول وضوابط سے اس کا راست تعلق نہیں ہوتا، لیکن اُس علم پر عبور حاصل کرنے میں یہ تاریخ بہت بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم کسی بھی علم کو پڑھتے وقت اس کی تاریخ بھی ضرور پڑھیں۔

بلاغت پر مشتمل اس اکائی میں علم بلاغت کے آغاز وارتقا کی معلومات فراہم کی جائے گی۔ بلاغت کی تاریخ کے ذریعے ہم اس علم کے آغاز وارتقا اور اس کے مختلف ادوار سے بھی آگاہی حاصل کریں گے اور اس ضمن میں ہمیں اس علم کی ضرورت واہمیت سے بھی واقفیت حاصل ہوگی۔

1.2 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ:

☆ علم بلاغت کسے کہتے ہیں؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور کسی کلام کے بلیغ ہونے کے کیا تقاضے ہیں؟

☆ مختلف مثالوں کے ذریعے ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ بلیغ اور غیر بلیغ کلام کے درمیان کیا فرق ہوتا ہے؟ اور ہم کیسے معلوم کریں گے کہ جو کلام ہم پڑھ یا سن رہے ہیں، وہ بلیغ ہے یا نہیں؟

☆ اس اکائی میں ہم علم بلاغت کے آغاز وارتقا کے متعلق معلومات حاصل کریں گے اور ہمیں معلوم ہوگا کہ اس علم کا آغاز کب ہوا؟ کس طرح ہوا؟ کیوں ہوا؟ کس کے ذریعے ہوا؟ اور یہ علم کس طرح منزل بہ منزل آگے بڑھا؟ جب ہمیں یہ معلومات حاصل ہوں گی، تبھی ہم

اس علم کی گہری معلومات حاصل کر سکیں گے۔

1.3 تعریف

ماہرین علما کی اختلاف رائے ایک عمدہ اور اعلی فکر کو وجود بخشتی ہے۔ان اختلافات کی وجہ سے علم وفن عروج وارتقا کے مختلف ادوار سے گزر کر ایک عمدہ اور بہترین شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔علم بلاغت کا عروج وارتقا بھی ان علمی اختلافات کے مختلف ادوار سے گزر کر ایک مستقل فن کی شکل میں رونما ہوا اور ہر دور میں علمائے لغت نے اس کی الگ الگ تعریفیں کیں۔ان تعریفات میں بعض ایسی ہیں جس سے اس علم کی پوری ترجمانی ہوتی ہے اور اس تعریف کو جامع ومانع تعریف کہا جاتا ہے اور اسے بقیہ تمام تعریفات سے افضل اور عمدہ سمجھا جاتا ہے۔اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جن تعریفات کو جامع ومانع نہیں کہا جاتا وہ ناقابل قبول اور غلط ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس تعریف کو اختیار کیا جارہا ہے، وہ زیادہ بہتر اور زیادہ جامع ہے۔

علم بلاغت کے سلسلے میں بہت سے ماہرین کے ذریعے بیان کی گئیں تعریفات میں یہاں چند پیش کی جارہی ہیں، تاکہ اس سلسلے کی تمام اہم باتیں سامنے آ سکیں اور آپ ان کی روشنی میں حقیقت تک پہنچ سکیں۔

لغات کشوری میں بلاغت کے معنی یہ لکھے ہیں:

''حسب موقع گفتگو کرنی، جیسا حال دیکھا ویسی بات کرنی۔''

مختصر اردو لغت میں ہے:

''مقتضائے حال کے مطابق کلام کرنا۔اصطلاح میں علم بیان وہ علم ہے، جس میں اعلیٰ درجے کی خوش بیانی کے قواعد بتائے گئے ہوں۔''

1.3.1 علمائے بلاغت کے اقوال

عربی زبان وادب میں علم بلاغت کو علما نے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ان میں چند حسب ذیل ہیں:

عرب ماہرین بلاغت میں ایک مشہور نام علی بن عیسی الرُمّانی (۳۸۴ھ) کا ہے انھوں نے بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"إيصال المعنى إلى القلب في أحسن صورة من اللفظ۔"

نہایت مناسب الفاظ کے ذریعے بات کو سامنے والے کے دل تک پہنچا دینا۔

قزوینی (۷۳۹ھ) نے لکھا ہے:

"مطابقة الكلام لمقتضى الحال مع فصاحته۔"

بات کو مقتضائے حال کے مطابق پوری فصاحت کے ساتھ بیان کرنا۔

ابو ہلال عسکری (وفات ۳۹۵ھ) نے بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"البلاغة بكل ماتبلغ به المعنى قلب السامع، فتمكّنه في نفسه، كتمكنه في نفسک مع صورة مقبولة و معرض حسن۔"

بلاغت ہر اس طرزِ کلام کو کہتے ہیں، جس کے ذریعے سننے والے کے دل میں بات اتر جائے اور اس کے دل میں اسی حسن وادا

کے ساتھ اسی طرح پیوست ہوئے جیسا کہ وہ بولنے والے کے دل میں موجود ہے۔

جرجانی (۴۷۱ھ) نے بلاغت کی تعریف اس طرح کی ہے:

"البیان هو تأدیة المعاني التي تقوم بالنفس تامّة علی وجه یکون أقرب إلی القبول وأدعی إلی التأثیر۔ وفي صورتها وأجراس کلمها بعذوبة النطق، وسهولة اللفظ والإلقاء، والخفّة علی السمع۔

علم بلاغت باتوں کو اس طرح ادا کرنے کا نام ہے، جو قبولیت کے لحاظ سے آسان، تاثیر کے لحاظ سے اثر انگیز ہو اور اس کا ظاہری ڈھانچہ اور الفاظ کا رکھ رکھاؤ ایسا ہو کہ زبان سے ادا کرنے میں شیریں اور پیش کرنے میں آسان ہو۔ ساتھ ہی کانوں پر بار بھی نہ ہو۔

آمدی (۳۷۰ھ) نے بلاغت کی تعریف میں لکھا ہے:

إصابة المعنی وإدراک الغرض بألفاظ سهلة عذبة مستعملة، سلیمة من التکلّف، لا تبلغ القدر الزائد علی قدر الحاجة، ولا تنقص نقصانا یقف دون الحاجة۔

اپنی بات اور مقصود کو آسان، شیریں اور عام مستعمل الفاظ کے ذریعے بغیر کسی تکلف کے بیان کرنا۔ اس طرح سے کہ ضرورت سے زیادہ الفاظ وتعبیرات استعمال نہ ہوں اور نہ انھیں ضرورت سے کم استعمال کیا گیا ہو۔

عبداللہ ابن المقفع نے بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

البلاغة اسم جامع لمعان تجري في وجوه کثیرة، فمنها ما یکون في السکوت، ومنها مایکون جوابا، ومنها مایکون شعرا، ومنهامایکون سجعاوخطبا، ومنها مایکون رسائل، فعامّة مایکون من هذه الأبواب الوحي فیها، والإشارة إلی المعنی والإیجاز هو البلاغة۔

بلاغت مختلف انداز سے متعدد باتوں کو بیان کرنے کا ایک جامع طریقہ ہے۔ کبھی خاموشی میں بھی بلاغت ہوتی ہے اور کبھی جواب میں بھی۔ کبھی شعر کے انداز میں ہوتی ہے تو کبھی یہ مسجع اور مقفی عبارتوں اور خطبات کی شکل میں ہوتی ہے تو کبھی یہ بلاغت خطوط ورسائل کا روپ دھار لیتی ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ان تمام طریقوں میں انسان فطری استعداد کو کام میں لاکر اپنی بات کو مختصر انداز میں بیان کرتا ہے۔ اسی کو بلاغت کہتے ہیں۔

سکاکی (۶۲۶ھ) نے لکھا ہے:

> **"هي بلوغ المتکلم في تأدیة المعاني حدا، له اختصاص بتوفیة خواصّ التراکیب حقها، وإیراد أنواع التشبیه والمجاز والکنایة علی وجهها۔"**

بلاغت متکلم کے ذریعے اپنی بات کو مخصوص حدود اور تراکیب کے مناسب استعمال کے ذریعے سامع کے دل تک پہنچانے کا نام ہے، جس کلام میں تشبیہ، مجاز اور کنایہ کی اقسام کو بھی مناسب انداز میں اختیار کیا گیا ہو۔

ابن اثیر (۶۳۷ھ) لکھتے ہیں:

البلاغة شاملة الألفاظ والمعاني، وهي أخص من الفصاحة کالإنسان من الحیوان، فکل إنسان حیوان ولیس کل حیوان

إنسان, البلاغة لاتكون إلا في اللفظ و المعنى معا بشرط التركيب, لأن اللفظة الواحدة لايوجد فيها وصف البلاغة لخلوها من المعنى الذي ينتظم كلاماً۔

بلاغت الفاظ و معانی دونوں کو شامل ہوتی ہے۔ یہ فصاحت کے مقابلے میں اسی طرح زیادہ خاص ہے، جیسے کہ انسان حیوان کے مقابلے میں۔ ہر انسان حیوان ہوتا ہے، لیکن ہر حیوان انسان نہیں ہوتا۔ بلاغت ترکیب کی شرط کے ساتھ لفظ و معنی دونوں میں بیک وقت پائی جاتی ہے، کیونکہ ایک لفظ جب تک فصیح نہیں ہوگا، تب تک وہ بلیغ بھی نہیں ہوسکتا۔ یعنی جب تک اس میں فصاحت کا سب سے امتیازی وصف یعنی حسن نہ پایا جائے تب تک کلام بلیغ نہیں ہوسکتا۔ لیکن بلاغت کا امتیازی وصف ایک لفظ میں نہیں پایا جاتا، کیونکہ کبھی کبھی اگر اس کو منظم انداز میں ترتیب نہ دیا جائے تو وہ معانی سے خالی ہوجاتا ہے اور بلیغ نہیں رہتا۔

1.3.2 مختلف تعریفات کے نتائج

متقدمین کی ان مختلف تعریفات کو پڑھنے کے بعد ہمارے سامنے بلاغت کی تعریف پوری طرح کھل کر واضح ہوجاتی ہے۔ ان تعریفات کی روشنی میں ہمارے سامنے جو نتائج آتے ہیں، انھیں مختلف نکات کی شکل میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) علم بلاغت ایک اہم علم ہے۔ اس علم کے بغیر زبان و بیان کی خوبیوں کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ انسان چاہے کسی سے گفتگو کرے، کسی سے تحریری طور پر گفتگو کرے یا خط لکھے، ہر صورت میں اس کا کلام اسی وقت اثر انداز ہوسکتا ہے، جب اس کے کلام میں بلاغت کے عناصر پائے جائیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو کلام مؤثر نہیں ہوسکتا۔ کلام کا مؤثر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے، بلکہ یہ ایک انتہائی اہم انسانی صفت ہے، جس کا پایا جانا انسان کی شخصیت پر غیر معمولی اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان کا کلام بلیغ ہو اور بلاغت کے محاسن لیے ہوئے ہو۔ یہ صفت دنیا کے ہر مؤثر کلام میں پائی جاتی ہے۔ مذہبی کتابوں سے لے کر انسانی کتابوں تک، تمام کتابوں میں بلاغت کے عناصر پوری طرح کارفرما نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو، وہ اپنے مذہب کے علاوہ کسی مذہب کے صحیفے کو پڑھتا ہے تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اثرات قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ایک علیحدہ شئے ہے، لیکن وہ کلام کے حسن و خوبی سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ توریت، زبور، انجیل، صحف ابراہیم، صحف سلیمان اور سب سے آخر میں آخری آسمانی کتاب قرآن کریم آج تک انسان کو اپنی بلاغت کے سحر میں لیے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر قرآن کریم سب میں ممتاز ہے کسی اور صحیفہ سے اس کا تقابل کرنا بالکل دوالگ معیار کے ادب میں تقابل کرنا ہے جو ایک غیر علمی طریقہ ہے۔

(۲) علم بلاغت کے اندر اس بات کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی کلام کو قاری یا سامع کے دل کی گہرائی تک پہنچا سکتا ہے۔ متکلم جو بات کہہ رہا ہے یا جو بات کہنا چاہتا ہے، وہ بات بلاغت کے اصول وضوابط کے ذریعے ہی مخاطب کے دل و دماغ تک منتقل کی جاسکتی ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلام بلیغ کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس کے ذریعے کوئی بھی بات اپنی اصل شکل اور اصل کیفیت کے ساتھ دوسروں تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ اگر بلاغت کے اصول وضوابط کا خیال نہ رکھا جائے تو ہم اپنی بات دوسروں تک پہنچا تو سکتے ہیں، لیکن جو جذبہ ہمارے دل میں کارفرما تھا، اس جذبے کا پوری طرح اظہار ممکن نہ ہوگا۔ گویا یہ علم ایسے انداز پیشکش اور طریقۂ اظہار کا مطالعہ کرتا ہے جس کے ذریعہ کسی معنی میں وضاحت، شگفتگی، دلکشی، جدت اور ایجاز کی خوبی پیدا ہوتی ہے۔

(۳) علم بلاغت کے اصول وضوابط جاننے اور سمجھنے کے بعد انسان اپنی بات کوآسان الفاظ اور تکلفات سے پاک اسلوب کے ذریعے قاری یا سامع کومتاثر کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔یعنی علم بلاغت اسے یہ بات سکھادیتا ہے کہ کلام جتنا زیادہ تکلفات سے پاک ہوگا اور جتنا عام فہم ہوگا، اتنا ہی مؤثر ہوگا۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی کے شکار رہتے ہیں کہ کلام میں جتنے زیادہ ثقیل اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کیے جائیں، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔حالانکہ یہ ایک واہمہ ہے۔ایک ایسی غلط فہمی ہے جوانسان کواچھاادب تخلیق کرنے سے روکتی ہے۔

اوپر ہم نے بلاغت کی جوتعریفات پڑھی ہیں،ان سے یہ وہم پوری طرح ختم ہوجانا چاہیے۔ماضی میں جاحظ،حریری،طبری، جرجانی،ابن مقفع اور پچھلی صدی میں مصطفی لطفی منفلوطی،احمدامین،طہٰ حسین،ابوالحسن علی ندوی، رافت پاشا،علی طنطاوی اور نجیب محفوظ جیسے ادبا کے یہاں یہ وصف بہت نمایاں نظرآتا ہے۔ان تمام کے یہاں بڑی سے بڑی بات کوعام فہم اسلوب میں بیان کرنے کارویہ ملتا ہے۔اپنی فکر کودوسروں تک منتقل کرنے کے لیے یہ مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کا استعمال نہیں کرتے۔ بات بہت صاف کہتے ہیں اور حتی الامکان سادہ اسلوب میں کہتے ہیں۔اسی کا نام بلاغت ہے۔مشکل الفاظ وتعبیرات کا استعمال کلام کو بوجھل بنادیتا ہے اور سامع کی سماعت پر گراں ہوتا ہے۔اس سے متکلم اپنی بات کودوسرے تک منتقل کرنے میں پوری طرح ناکام ہوتا ہے۔اس کی مثال یوں سمجھیے کہ کوئی شخص اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہوئے کہے:

''چاردانگِ عالم میں صبح ومسا میرے محبوب کا مماثل تلاش کرتے پھروگے،توبھی نامرادی ہی تمھارا مقدر ٹھہرے گی۔''

اس کے برخلاف کوئی یہ کہے:

''اس کائنات میں میرامحبوب اپنی مثال آپ ہے۔''

دونوں جملوں کوغور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں بات ایک ہی کہی گئی ہے،لیکن اندازِ بیان میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ پہلا جملہ بہت طویل بھی ہے اور سخت الفاظ سے بوجھل بھی۔ جب کہ دوسرا جملہ مختصر ہے اور اس میں کوئی مشکل لفظ نہیں ہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ پہلے جملے کوسننے کے بعد سامع نہ تو پوری بات سمجھ سکے گا اور نہ اس جملے کودوبارہ پڑھنا چاہے گا۔ جب کہ دوسرے جملے میں جوبات کہی گئی ہے،وہ ہر خاص وعام بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ دونوں جملوں میں یہی بات کہی گئی ہے کہ میرے محبوب جیسا کوئی دوسرانہیں ہے۔اس بات کو پہلے جملے میں پیچیدہ انداز میں اور مشکل الفاظ کے ساتھ غرورآمیز اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرا جملہ نہایت آسان بھی ہے اور عام فہم بھی۔اسی کا نام بلاغت ہے۔

(۴) بلاغت کے لیے نظم ونثر کی کوئی خاص صنف یا ہیئت مخصوص نہیں ہے۔یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بس فلاں صنف ہی بلیغ ہوسکتی ہے اور فلاں صنف بلیغ نہیں ہوسکتی۔ایسا ہرگز نہیں ہے۔انسان کلام کی جس صنف کو بھی اختیار کرے،وہ اس میں بلاغت کے اصول کی پاس داری کرسکتا ہے۔متکلم چاہے خطبہ دے رہا ہو،خط لکھ رہا ہو،مضمون لکھ رہا ہو،ناول،افسانہ یا کہانی تخلیق کررہا ہو، پابند یا آزادنظم کہہ رہا ہو،غرض یہ کہ نظم ونثر کی کوئی بھی صنف اختیار کررہا ہو،اس میں بلاغت کے اصولوں کا خیال رکھا جاسکتا ہے۔یعنی اصولِ بلاغت کسی ایک صنف کے لیے خاص نہیں ہیں، بلکہ یہ نظم ونثر کی ہر صنف کومحیط ہیں۔

(۵) بلاغت کا ایک اہم حصہ تشبیہ،استعارہ،مجاز اور کنایہ بھی ہے۔ یہ تمام چیزیں مختلف انداز اور اسلوب میں حسبِ ضرورت استعمال کرنا بھی علم بلاغت کا ایک اہم خاصہ ہے۔یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جملے میں ان میں سے کسی چیز کو برتا جائے لیکن جہاں ان میں سے کسی چیز کے استعمال سے

کلام زیادہ مؤثر ہوسکتا ہو، وہاں اسے ضرور استعمال کرنا چاہیے۔تشبیہ، استعارہ، مجاز اور کنایہ کی تعریفات اور اقسام ہم اگلی اکائیوں میں پڑھیں گے۔

1.4 اہمیت

اب تک کی گفتگو سے ہمارے سامنے بلاغت کی تعریف اور اس کی حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی۔ ہمیں معلوم ہوگیا کہ بلاغت کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ ہمارے لیے کس طرح مفید ہوسکتی ہے؟ ان مباحث سے واقفیت کے بعد ضروری ہے کہ ہم علم بلاغت کی اہمیت وافادیت کو سمجھیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ مختلف علوم کے درمیان علم بلاغت کا کیا مقام ہے؟ بلاغت کی اہمیت وافادیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں موجود ہیں۔ ہم یہاں ان سے چند اہم نکات ذکر کر رہے ہیں۔

1.4.1 تاثیر کلام

علم بلاغت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان اپنے کلام کو مؤثر سے مؤثر تر بنا سکتا ہے۔ ویسے تو ایک شیر خوار بچہ بھی اپنے جذبات کی عکاسی کر دیتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اپنی بات سمجھا لیتا ہے۔ لیکن تاثیر کلام ایک دوسری چیز کا نام ہے۔ یہ کبھی کسی بادشاہ یا صدر مملکت کے تاریخی خطاب میں بھی ظاہر ہوسکتی ہے اور کبھی بھیک مانگتے ہوئے فقیر کی صداؤں میں اور کبھی سنسان راتوں میں اپنے بچے کو لوری سناتی ہوئی ماں کی زبان سے بھی یہ کلمات نکل سکتے ہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ بلیغ کلمات ادا کرنے والے شخص کو بلاغت کے تمام اصول وضوابط سے آگاہی حاصل ہو۔ البتہ یہ ناممکن ہے کہ بلاغت کے اصول وضوابط سے خالی کلام اپنے سننے والے کے دل ودماغ پر اثر انداز ہو۔

کلام کے مؤثر ہونے کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ بلاغت کے اصول وضوابط پر پورا اترتا ہو، خواہ بولنے والے کو معلوم نہ ہو کہ وہ کتنا مؤثر کلام اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ لیکن غیر ارادی طور پر اس کے دل کا درد ایسے خوب صورت الفاظ اور مناسبِ حال تعبیرات میں ڈھل جائے کہ سننے والا متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

غرض یہ کہ کلام کا مؤثر ہونا علم بلاغت کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ آج دنیا میں جو کتابیں لوگوں کو اپنے سحر میں لیے ہوئے ہیں، وہ سب اس صفت پر کم وبیش پوری اترتی ہیں۔ خاص طور پر قرآن کریم میں بلاغت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

" الرَّحْمٰنُ۝عَلَّمَ الْقُرْآنَ۝خَلَقَ الْإِنسَانَ۝عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۝"

(اللہ ہی) رحمان ہے، جس نے قرآن کا علم عطا فرمایا، انسان کو پیدا فرمایا اور اس کو اپنی بات اچھی طرح بیان کرنا سکھایا۔

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

" إنّ مِن البيانِ لسحرا۔"

بہت سی باتیں تو بڑی سحر انگیز ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن وحدیث میں اور دوسرے اسلامی مآخذ میں ایسے بے شمار ارشادات اور واقعات موجود ہیں، جن سے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاثیر کلام بلاغت کا ایک انتہائی اہم وصف ہے۔ اس وصف سے انسان نے ہر دور میں بے شمار فوائد حاصل

کیے ہیں۔ مستقبل میں بھی کوئی بڑا انسانی انقلاب بغیر موثر کلام کے وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔ یہ تاثیر کلام ہی علم بلاغت کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔

1.4.2 ذوق کی تشکیل

بلاغت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسانی ذوق کی تشکیل ہوتی ہے۔ ذوق کی تشکیل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اچھے برے، کھرے کھوٹے اور تلخ وشیریں کا شعور ہوجاتا ہے۔ وہ کسی کلام کو پڑھ یا سن کر سمجھ جاتا ہے کہ اس میں اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے؟ کلام اچھا ہوتا ہے تو وہ جھوم جاتا ہے اور اس کی طبیعت وجد میں آ جاتی ہے۔ کلام اچھا نہیں ہوتا تو اس کی طبیعت پر بار ہوتا ہے اور وہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی سننا گوارا نہیں کرتا۔ لیکن جس شخص کے اندر ذوق نہ ہو، وہ اچھے برے کی تمیز نہیں کر پاتا۔ اُسے غیر معیاری کلام سنائیے یا اعلیٰ اور مرصّع کلام سنائیے، اُس کے لیے دونوں برابر ہوتے ہیں۔ نہ وہ اچھا کلام سن کر خوش ہوتا ہے اور نہ خراب کلام سن کر گرانی محسوس کرتا ہے۔ اُس کی حالت ہر حال میں یکساں ہوتی ہے۔ علمی، ادبی اور شعوری لحاظ سے یہ صورت حال بہت خطرناک ہوتی ہے۔ پڑھے لکھے انسان کو باشعور اور باذوق ہونا ہی چاہیے۔ اچھے برے اور کھرے کھوٹے کی تمیز ہونی ہی چاہیے۔ اسی لیے بلاغت کے بڑے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی گنایا جاتا ہے کہ اس فن کے ذریعے انسان کا شعور پروان چڑھتا ہے اور اس کا ذوق تشکیل پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اساتذہ اپنے تلامذہ کو اہل علم کی صحبت اختیار کرنے اور اصحابِ فن کا کلام پڑھنے کی تاکید کرتے رہے ہیں۔ اس کے بغیر کتابیں تو پڑھی جاسکتی ہیں، ڈگریاں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں، لیکن ذوق کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔ وہ علمی شعور پیدا نہیں ہوسکتا۔ جس کے ذریعے اچھے کلام کو سنتے ہی طبیعت وجد میں آ جائے اور خراب کلام سنتے ہی طبیعت پر بار محسوس ہونے لگے۔ سچ یہ ہے کہ جو لوگ اس پاکیزہ ذوق کے حامل نہیں ہوتے، وہ اکثر علمی و ادبی مجلسوں میں غالب کے اس شعر کے مصداق ہوجاتے ہیں:

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور اس قدر
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

اس لیے کثرت کے ساتھ فصیح وبلیغ کلام کو پڑھنا سننا، اہلِ بلاغت کی مجلسوں میں بیٹھنا اور علم بلاغت کے لحاظ سے حسن وقبح کا فرق سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارا ذوق تشکیل پاتا ہے اور اعلیٰ ذوق ہماری روحانی، ذہنی اور فکری صحت کا باعث ہوتا ہے۔

1.4.3 فرد کی تعمیر

یہ بات بہ ظاہر بڑی عجیب لگتی ہے کہ علم بلاغت کا فرد کی تعمیر سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ لیکن کچھ گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ علم بلاغت صرف ایک چٹخارے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ علم فرد کی تعمیر کا بھی اہم ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

ایک انسان جب اچھا کلام سنتا یا پڑھتا ہے تو وہ اس کا اثر لیتا ہے۔ اُس کلام میں اُسے جو مؤثر بات زیادہ اچھی لگتی ہے، وہ اُسے اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اُس کی روشنی میں اپنی زندگی کا سفر آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ تاریخ میں دو چار نہیں، ایسی سینکڑوں مثالیں ملیں گی، جن میں ایک عظیم شخصیت کی تعمیر وترقی کا ذریعہ کوئی بلیغ کلام ہوگا۔ عظیم فرمانروا اسکندر (356-323 ق م) کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہمیشہ ایلیڈ کا رزمیہ رکھتا تھا۔ اسی طرح مشہور مغل بادشاہ جہانگیر (1569-1627) اپنے سرہانے ہمیشہ دیوانِ حافظ رکھتا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کہ تاریخ کی

یہ عظیم شخصیات لوگوں پر اپنا رعب بٹھانے کے لیے ایسا نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ علم وفن کے ان شاہ کاروں سے طاقت وقوت حاصل کریں اور ان کی روشنی میں کامیاب زندگی گزاریں اور لوگوں کی درست رہنمائی کرسکیں۔

معلوم ہوا کہ فرد کی تعمیر میں علم بلاغت بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اور جتنی بڑی تعداد میں افراد بلاغت کا علم حاصل کرتے ہیں اس کا دائرہ کار بڑھتا چلا جاتا ہے اور پورے معاشرے کی تعمیر میں اس سے مدد ملتی ہے۔

1.4.4 معاشرتی انقلاب

جس طرح علم بلاغت فرد کی زندگی پر گہرا اثر ڈالتا ہے، اُسی طرح معاشرے پر بھی اس کے حیرت انگیز اثرات ہوتے ہیں۔ معاشرہ اینٹ پتھر کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ افراد کے مجموعے کو معاشرہ کہتے ہیں۔ لہٰذا جب علم بلاغت سے فرد متأثر ہوتا ہے، تو معاشرے پر اس کی اثر انگیزی خود بہ خود ثابت ہو جاتی ہے۔ انسانی تاریخ سے ایسی پچاسوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کس طرح کسی نثر پارے، کسی وعظ وتقریر یا منظوم کلام نے معاشرے کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اس ذیل میں ہمارے سامنے سب سے بڑی مثال چھٹی صدی عیسوی کے عرب کی ہوسکتی ہے۔ اس انقلاب سے زیادہ برق رفتار اور اثر انگیز انقلاب کبھی رونما نہیں ہوا۔ اس انقلاب کی بہت بڑی وجہ ایک کتاب (قرآن کریم) کی معجزانہ بلاغت تھی۔ سیرت نبوی کی کسی بھی کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے کہ بڑے بڑے سردارانِ قریش اور عرب کی اہم شخصیات نے قرآن کریم کی چند آیات سنیں اور اُن کی زندگیوں میں انقلاب رونما ہوگیا۔ انھوں نے اعلان کردیا کہ ایسا کلام نہ کبھی سنا اور نہ کبھی کسی انسان نے کہا۔ دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی میں جو انقلاب آیا، وہ قرآن کریم کی چند آیات کو سن کر ہی آیا ہے۔ آگے چل کر ان کے ذریعے روم وفارس تک اسلامی سلطنت کا پھیلنا ایک بے مثال انقلاب تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم معاشرتی انقلاب کی سب سے بنیادی وجہ خدا کا وہ کلامِ بلاغت نظام بنا، جس کو پڑھ کر حضرت عمر کی زندگی کچھ سے کچھ ہوگئی۔ نہ حضرت عمر کلامِ الٰہی سے متأثر ہوتے اور نہ وہ سب کچھ ہوتا، جو آگے چل کر ہوا۔

معلوم ہوا کہ علم بلاغت کی اثر انگیزی کا دائرہ فرد سے بڑھ کر پورے معاشرے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس علم کے اندر کل بھی یہ تاثیر تھی اور آج بھی یہ تاثیر ہے۔ اسی لیے شاعر نے کہا ہے:

اے مری قوم کے نام ور شاعرو!
عالمو! حافظو! قاریو! مفتیو!
اے ادیبو! فسانہ نگارو! سنو
تم جو چاہو زمانے کا رخ موڑ دو

1.5 عروج وارتقا

علم بلاغت کے سلسلے میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی ہے کہ اس کا آغاز کب ہوا؟ اس کے آغاز کے سلسلے میں مختلف ماہرین کی مختلف آرا ہیں۔ کسی نے زمانۂ جاہلیت کے ادبا وشعرا کو اس علم کا موجد بتایا ہے تو کسی نے اسے عہدِ اسلامی کی پیداوار بتایا ہے۔ بعض نے اس علم کو یونانی فلاسفہ سے جوڑا ہے تو بعض نے اس کے بنیاد گزاروں کو عہدِ عباسی میں تلاش کیا ہے۔

اس سلسلے میں جو بات دل کو لگتی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان نے ہر دور میں اپنی بات کو زیادہ مؤثر اور زیادہ مناسبِ حال انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر زمانے میں انسان نے اپنے دل کی باتوں کو دوسروں تک پہنچانا چاہا اور اس کے لیے اُس نے اس بات کی کوشش کی کہ سامنے والے لوگ اُس کی بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس کے لیے اُسے کچھ اچھی چیزوں کو اختیار کرنا پڑا اور کچھ خراب چیزوں کو چھوڑنا پڑا۔ مثال کے طور پر جنگ کے حالات میں دنیا کے کسی بھی کمانڈر نے پیار محبت کی داستان نہیں سنائی ہوگی۔ ایسے موقعے پر جوش وولولے اور عزم و حوصلے سے بھری ہوئی کہانیاں اور واقعات سنائے جاتے ہیں، تاکہ سننے والے بھی دادِ شجاعت دینے کے لیے تیار ہو سکیں۔ اسی طرح کسی کی موت کے موقع پر کی جانے والی گفتگو میں کبھی بھی ہنسنے ہنسانے کی باتیں نہیں کی گئیں۔ اس مناسبت سے صرف غم واندوہ کے کلمات کہے جاتے ہیں جن میں تعزیت ہوتی ہے اور دلاسہ دیا جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اس بات کا شعور کس طرح پیدا ہوا کہ ہمیشہ حسبِ موقع بات کرنی چاہیے؟ اُسے یہ کس طرح معلوم ہوا کہ بات کو فلاں انداز میں کہا جائے تو اُس کا اثر ہوگا اور فلاں انداز میں کہنا بے اثر ہوگا؟ ماہرین کا ماننا ہے کہ انسان اپنی معاشرتی زندگی اور عقل کے استعمال سے سمجھ جاتا ہے کہ کب، کہاں، کس طرح بات کہنا ہے۔ ہر دور میں بڑے اپنے چھوٹوں کو اس طرح کی باتیں بتاتے رہے کہ تمھیں فلاں بات اِس انداز سے کہنا چاہیے تھی۔ فلاں بات اِس طرح نہ کہنی چاہیے تھی۔ یعنی جب سے انسان نے ملنا جلنا، بولنا چالنا اور سننا سنانا سیکھا، اُسی وقت سے اُس نے بلاغت کے اصول وضوابط کو بھی اختیار کرنا سیکھا۔ اگرچہ ہزاروں سال تک اُس کے پاس یہ اصول وضوابط تحریری شکل میں واضح اور منتظم طور پر جمع نہیں ہو سکے، لیکن بلاغت کا شعور اُس کے اندر ہمیشہ سے رہا۔

مثال کے طور پر 570 ق م میں گوتم بدھ نے پہلی مرتبہ شرناتھ میں اپنے چار پانچ دوستوں کے سامنے اپنی جو تعلیمات بیان کیں، وہ آج تک بدھ مذہب کی بنیاد سمجھی جاتی ہیں۔ 399 ق م میں سقراط نے زہر کا پیالہ پینے سے پہلے اپنے چند رفقا وتلامذہ کو جو سکھایا تھا، اُسے آج بھی مغربی فلسفے کی تاریخ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ 331 ق م میں سکندر نے گوگا میلا کے میدان میں اپنی فوج کو خطاب کرتے ہوئے جو جملے کہے تھے، وہ آج بھی دنیا کو عزم و ہمت کا درس دیتے ہیں۔ یہ تینوں واقعات عیسوی کلینڈر کے آغاز سے بھی پہلے کے ہیں۔ تینوں واقعات مختلف مزاج کے حامل افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے کا تعلق مذہب وروحانیت سے ہے، دوسرے کا تعلق علم وفلسفہ سے ہے اور تیسرے کا تعلق میدانِ جنگ اور سیاست سے ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مواقع سے پیش کیے گئے یہ خطبات اثر انگیزی کے لحاظ سے پوری طرح کامیاب رہے۔ تینوں واقعات اُس دور کے ہیں، جب علم بلاغت کے نام سے دنیا میں ایک صفحہ بھی نہیں لکھا گیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بلاغت اور انسان کا تعلق نہایت قدیم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُسے ایک مستقل علم کے طور مرتب کرنے کی توفیق صدیوں بعد ہوئی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جب سے بات چیت ہو رہی ہے اور جب سے کہا سنا جا رہا ہے، اُس وقت سے بلاغت موجود ہے۔ انسان نے ہمیشہ بلاغت کو اختیار کرنے کی کوشش کی اور اسے آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی بھی کوشش کی۔ لیکن علمِ بلاغت دنیا کے آغاز کے ہزار ہا ہزار سال بعد وجود میں آیا۔ یہ صرف علم بلاغت کی خاصیت نہیں ہے، بلکہ بہت سے علوم کا یہی معاملہ ہے کہ انسان نے اُسے ابتدا سے اختیار تو کیا، لیکن ایک علم کی حیثیت سے منضبط بہت بعد میں کیا۔ مثلاً فنِ تعمیر، فنِ زراعت اور فنِ حرب وغیرہ۔ درج ذیل سطور میں اس کے عروج وارتقا کا ایک سرسری عصری تسلسل پیش کیا جا رہا ہے۔

1.5.1 زمانۂ جاہلیت

عرب اور عربی زبان کی بات کی جائے تو یہاں بھی بلاغت کا تصور نہایت قدیم نظر آتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زبان و بیان کے سلسلے میں عرب ہمیشہ سے حساس رہے ہیں۔ شعر و شاعری اور خطابت و داستان گوئی ہمیشہ اُن کی توجہات کا اہم مرکز رہی ہیں۔ ان اصناف ادب میں فصاحت اور بلاغت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے انھیں بلاغت کے رائج اصول وضوابط کو بھی ہمیشہ اختیار کرنا پڑا۔ یہ اصول وضوابط انھوں نے صرف اختیار نہیں کیے، بلکہ ان پر گفت وشنید اور ان کی تنقید و تنقیح کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ تا کہ کلام کو زیادہ بہتر اور مؤثر بنایا جا سکے۔

سوق عکاظ کے نام سے کون ناواقف ہے؟ یہ بازار زمانۂ جاہلیت کے مشہور بازاروں میں سے تھا۔ ہر سال یکم ذی قعدہ سے 20/ ذی قعدہ تک پورے بیس دن عرب قبائل اس کھلے بازار میں جمع ہوتے تھے۔ یہ بازار خرید وفروخت سے کہیں زیادہ عرب تہذیب وثقافت اور عربی زبان و ادب کے ارتقا کا ذریعہ تھا۔ اس میں مسلسل بیس دن تک شعری وتقریری مقابلے ہوتے تھے۔ مختلف قبائل اپنے اپنے شعرا وخطبا کو پیش کرتے۔ وہ شعرا وخطبا اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ اُن کی تخلیقات پر کھلی تنقید ہوتی اور اچھے برے کا فیصلہ کیا جاتا۔ بڑے شعرا اور اہل فن کا غیر معمولی استقبال ہوتا اور سب اُن کے فن سے مستفید ہوتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے:

إن القبة الحمراء التي لكانت تُضربُ للنابغة الذبياني بسوق عكاظ في العصر الجاهلي، ليجلس تحتها، ويأتي إليه الشعراء، ويعرض عليه كل منهم شعره ليميز هو بين حسن الشعر ورديئه، ويختار أفضله، لتدل دلالة واضحة على أن هناك مقاييس معينة كان يختار وفقها أفضل الشعر، وهذا دليل على أن العرب في الجاهلية قد عرفوا البلاغة، ولكن البلاغة الفطرية البسيطة البعيدة عن التقعيد والتعقيد۔

زمانۂ جاہلیت میں سوقِ عکاظ میں نابغہ ذبیانی کے لیے سرخ خیمہ لگایا جاتا تھا، تا کہ وہ اس میں بیٹھے اور شعرا اس کی خدمت میں حاضر ہوں۔ وہ شعرا اُس کو اپنے اپنے اشعار سناتے تھے، تا کہ وہ اشعار کے حسن و قبح کو واضح کرے اور زیادہ اچھے اشعار کو منتخب کرے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اُس دور میں بھی اشعار میں اچھے برے کا فیصلہ کرنے کے متعین پیمانے موجود تھے۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں بھی بلاغت سے واقف تھے، لیکن اُس وقت کی بلاغت بہت فطری اور سادہ انداز کی تھی جو اصول وضوابط اور الجھاؤ سے آزاد تھی۔

عربی شاعری کا بہترین نمونہ یا Masterpiece معلقات کو کہا جاتا ہے۔ معلقات کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کا انتخاب بیٹھے بٹھائے نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ بے شمار قصائد میں سے ان چند قصائد کو منتخب کر کے بیت اللہ پر آویزاں کیا گیا تھا۔ شاعری کے عظیم ذخیرے سے چند کو منتخب کرنا اور انھیں سب سے مقدس جگہ آویزاں کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ادبی لحاظ سے اچھے برے اور کھرے کھوٹے کا شعور عربوں میں زمانۂ جاہلیت میں بھی پوری طرح موجود تھا۔ مزید یہ کہ وہ اپنے اس شعور پر فخر بھی کرتے تھے اور دوسروں تک پہنچانا بھی چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے معلقات کو کعبہ پر آویزاں کر رکھا تھا۔

1.5.2 عہدِ نبوت اور خلافتِ راشدہ

چھٹی صدی عیسوی میں اسلام کی آمد کے بعد بلاغت کے رائج فنی اصول وضوابط کو باقی رکھا گیا اور فکری قواعد میں کچھ تبدیلی کی گئی۔ یعنی کلام کو خوب سے خوب تر اور مؤثر سے مؤثر ترین بنانے کی تو حوصلہ افزائی کی گئی، لیکن فکری لحاظ سے بے راہ روی اور بے ضابطگی کو ختم کیا گیا۔ سننے والے کے دل و دماغ میں بات کو مؤثر انداز میں پیوست کرنے کے لیے زبان و بیان کے جو اصول رائج تھے، انھیں باقی بھی رکھا گیا اور انھیں اختیار کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔ البتہ بلاغت برائے تفاخر، فن برائے فن یا فن برائے تذلیل انسان کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ مقصدیت اور تعمیر کو اختیار کرنے کی دعوت دی گئی۔ بلاغت برائے انسان اور فن برائے زندگی کا تصور پیش کیا گیا۔ اصولِ بلاغت کی حوصلہ افزائی کا ہی نتیجہ تھا کہ آگے چل کر مسلم ادبا نے ہی علم بلاغت کی طرح ڈالی اور اُسے ترقی کی اُس چوٹی تک لے گئے، جہاں تک یہ علم کبھی نہ پہنچ سکا تھا۔

اہلِ اسلام کے ذریعے بلاغت کے اصول وضوابط کو اختیار کرنے اور بلاغت کی تائید ونصرت کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن کا سب سے اہم اور مرکزی محور قرآن کریم علم بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ ایسا نمونہ، جس کو سن کر عرب شعرا و ادبا سر دھنتے اور عش عش کرتے رہ جاتے۔ خود قرآن کریم میں مختلف انداز سے بلیغ و مؤثر گفتگو کی تعریف کی گئی۔ ایک جگہ فرمایا گیا:

” الرَّحْمٰنُ۝عَلَّمَ الْقُرْآنَ۝خَلَقَ الْإِنسَانَ۝عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۝“ (الرحمٰن: 1-4)

رحمان، جس نے قرآن سکھایا۔ انسان کو پیدا کیا۔ اُسے اچھی طرح بات کرنا سکھایا۔

ایک طرف اہلِ اسلام نے اس طرح کی آیات سے حسنِ بیان کی ترغیب وتاکید کا درس لیا تو دوسری طرف بلاغت کو اختیار کر کے دنیا کے سامنے قرآن کریم کو بلاغت کے بہترین نمونے کے طور پر پیش کرنے کا بھی عزم کیا۔ قرآن کریم کے ساتھ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے بھی مسلسل حسنِ کلام کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

”إن من البیان لسحراً۔“ (بخاری: 5767)

بہت سا کلام سحر آفریں ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ شاعری کے بارے میں فرمایا:

”إن من الشعر لحکمۃ۔“ (ابن ماجہ: 3755)

بہت سے اشعار حکمت سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایک طرف اس طرح کے ارشادات کے ذریعے مؤثر کلام تخلیق کرنے کی ترغیب دی گئی تو دوسری طرف جوامع الکلم کے ذریعے فصاحت و بلاغت پر مشتمل بہترین انسانی کلام کے لازوال نمونے پیش کیے گئے۔

یہ صورت حال صرف عہد نبوت میں باقی نہیں رہی، بلکہ عہدِ نبوت کے بعد خلافت راشدہ میں بھی ہو بہو یہی انداز اختیار کیا گیا۔ حضرت محمد مصطفی ﷺ کی طرح چاروں خلفائے راشدین نے بھی ہمیشہ اچھے شعرا و ادبا کی حوصلہ افزائی کی، انھیں مناسب اعزازات سے نوازا اور اُن کی صلاحیتوں کو صحیح فکری نہج پر باقی رکھنے کی تاکید کی۔ صرف اسی پر بس نہیں، بلکہ زمانۂ نبوت وخلافت راشدہ میں شعر وادب کی محفلیں بھی منعقد ہوتی رہیں اور ان مجلسوں میں کلام کے حسن وقبح پر گفتگو بھی کی جاتی رہی۔ میرِ مجلس خواہ حضرت محمد ﷺ ہوں یا خلفائے راشدین میں سے کوئی ہو، انھوں نے

کلام سن کر اس پر تنقید بھی کی، اس کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر بھی کیا اور موقع ہوا تو کلام پیش کرنے والے کو مناسبِ حال انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ حدیث و سیرت کی کتابوں اور اسلامی تاریخ میں اس طرح کے بیسیوں واقعات ملتے ہیں۔ کسی بھی معتبر کتاب میں انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔ خلفائے راشدین میں سے خاص طور پر حضرت علی مرتضیٰؓ تو خود شاعر بھی تھے۔ اُن کا مجموعۂ کلام دیوان علی کے نام سے معروف ہے۔

1.5.3 اموی دورِ حکومت

خلافتِ راشدہ کے بعد اموی دورِ حکومت کا آغاز ہوا۔ یہ حکومت اپنے پیش رو ادوار کے برخلاف بادشاہت کا انداز لیے ہوئے تھی۔ اس لیے اس میں امرا کے دربار بھی سجتے تھے۔ درباروں میں اہل علم و فن بھی کثرت سے حاضر ہوتے تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انھیں سرکاری خزانے سے انعامات بھی دیے جاتے تھے۔ کلام کے حسن و قبح پر لمبی لمبی بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ اس لیے اس دور میں اہل ادب کو بھی اپنے جوہر دکھانے کا خاص موقع ملا۔ اگرچہ اپنی پیش رو حکومتوں کی طرح اِس دورِ حکومت میں بھی بلاغت کو ایک مستقل و منضبط علم کی حیثیت اختیار کرنے کا موقع نہیں ملا، البتہ اِس دورِ حکومت میں اصولِ بلاغت کو پہلے سے زیادہ پنپنے اور اہل بلاغت کو پہلے سے زیادہ متعارف ہونے کا موقع ملا۔

اموی دورِ حکومت کا آغاز حضرت امیر معاویہؓ سے ہوا اور مروان ثانی پر یہ حکومت ختم ہوگئی۔ 91/برس کے دورِ حکومت میں کل 14/حکمراں ہوئے، جن میں سے چند ہی کو اطمینان کے ساتھ لمبے دور تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے اس دور میں بھی بلاغت کے فن کی خاطر خواہ ترقی نہ ہوسکی۔ البتہ کئی حکمراں خود بھی صاحبِ علم و فن رہے اور دوسرے اہل فن کی قدر دانی کرتے رہے۔ اس لیے یہ دور بھی بلاغت کے لیے زرخیز اور مفید ثابت ہوا۔ لوگ حسنِ کلام کی طرف متوجہ رہے، اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے، بلاغت کے رائج اصولوں کی ترویج و اشاعت کرتے رہے اور ان اصول و ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اچھے علمی و ادبی نمونے تخلیق کرتے رہے۔

1.5.4 عباسی دورِ حکومت

دوسرے بہت سے علوم کی طرح علم بلاغت کے لیے بھی عباسی دورِ حکومت سب سے زرخیز اور ثمرآور ثابت ہوا۔ عباسی دور کا آغاز 750 عیسوی میں ہوا۔ یہ سلطنت 1517 عیسوی تک قائم رہی۔ تقریباً آٹھ صدیوں تک دنیا کے بہت بڑے حصے پر چھائے رہنے کے بعد یہ دورِ حکومت ختم ہوگیا۔ عباسی دورِ حکومت میں مختلف اتار چڑھاؤ آئے۔ موسمِ بہار بھی آیا اور موسمِ خزاں بھی۔ بعض حکمرانوں نے بے مثال حکومت کی اور بعض انتہائی ناکام ثابت ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے مسلسل پیش آنے والے سرد و گرم ماحول کے باوجود تہذیبی و ثقافتی اور علمی و ادبی میدانوں میں لاثانی ترقیات ہوئیں۔ متعدد علوم کا آغاز ہوا اور متعدد کو عروج حاصل ہوا۔

آپ نے اب تک بلاغت کی جو تاریخ پڑھی ہے، اُس سے آپ کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ علم بلاغت ایک مستقل علم کی شکل میں اب تک سامنے نہیں آیا تھا۔ زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے اصولوں کو رواج بھی حاصل تھا اور اُن کو اہل علم کے نزدیک پوری اہمیت بھی حاصل تھی۔ لیکن اب تک ایسا موقع نہیں آیا تھا کہ کسی صاحب علم نے اس علم کے متعلق بنیادی معلومات اور اس کے قواعد و ضوابط تحریری شکل میں پیش کیے ہوں۔ زمانۂ جاہلیت ہو یا عہدِ نبوت، خلافت راشدہ ہو یا اموی دورِ حکومت، تمام ادوار میں مختلف انداز سے بلاغت کے اصول و ضوابط کی اہمیت سمجھی جاتی رہی اور انھیں موضوعِ گفتگو بنایا جاتا رہا۔ لیکن ان اصول و ضوابط کو تحریری شکل میں پیش کرنے اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کا نظم کرنے کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوئی۔ یہ بڑا کام قدرت نے عباسی دورِ حکومت کے نصیب میں لکھ رکھا تھا۔ اس سلسلے کی بنیادی معلومات نکات کی شکل میں پیش کی جارہی ہیں:

(۱) عباسی دور میں علم بلاغت کی تاریخ جاننے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ابتدا میں بلاغت کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا تھا۔ جس صاحبِ علم کو بلاغت میں کوئی ایک پہلو ممتاز نظر آیا، اُس نے وہی پہلو اجاگر کرتے ہوئے اس علم کا نام تجویز کر دیا۔ ''علم بلاغت'' کا استعمال بعد میں کیا گیا۔ یہ بات جاننا اس لیے ضروری ہے کہ بہت سے ماہرین بلاغت نے علم بلاغت پر مشتمل اپنی کتابوں کے نام ایسے رکھے ہیں، جن سے قاری تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ بلاغت کی کتاب ہے بھی یا نہیں؟ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اُن ناموں سے واقف رہیں تاکہ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو سکیں۔

ابتدا میں علم بلاغت کے لیے یہ نام استعمال کیے گئے:

1- علم البدیع 2- علم البیان 3- علم نقد الشعر 4- علم صنعۃ الشعر 5- علم نقد الکلام

یہ تمام نام علمائے بلاغت کے اپنے ادبی رجحان کے نتیجے میں وجود میں آئے۔ جس نے اس علم کو جس انداز سے دیکھا اور اس علم کا جو مقصد مراد لیا، اُس نے اُسی سے ملتا جلتا نام تجویز کر دیا۔ کسی نے بلاغت کو محدود معانی میں استعمال کیا اور کسی نے وسیع معانی میں۔ کسی نے اسے صرف شعر یا نثر تک محدود کیا تو کسی نے اس کا دائرہ ہر طرح کے منظوم و منثور کلام تک وسیع کیا۔ غرض یہ کہ سب نے اپنے اپنے نظریے کے مطابق اس علم کا نام اختیار کیا۔

(۲) پہلی مرتبہ بلاغت کے اصول و ضوابط کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا سہرا جاحظ (225ھ) کے سر بندھتا ہے۔ جاحظ عباسی دورِ حکومت کا ممتاز ترین ادیب اور صاحب قلم تھا۔ متعدد کتابیں تصنیف کیا۔ اُن میں سے ہر کتاب اپنے موضوع پر ممتاز علمی دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ ابن خلدون نے ادب کے چار اساطین میں سے ایک جاحظ اور اس کی کتاب ''البیان و التبیین'' کو بھی بتایا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے، جس میں جاحظ نے بلاغت کے اصول و ضوابط بیان کیے ہیں۔ لیکن یہ اصول و ضوابط مرتب انداز میں نہیں ہیں بلکہ مصنف نے بہت سادہ اور ہلکے پھلکے انداز میں متفرق طور پر بلاغت کے کچھ مسائل پر گفتگو کی ہے۔ مثال کے طور پر حروف کے درست مخارج، زبان کی درستی، جملے کی ہیئت، لفظ اور معنی کا ربط اور خطیب کے لازمی اوصاف۔ یہ تمام موضوعات کسی نہ کسی حیثیت سے علم بلاغت کے ذیل میں آتے ہیں، لیکن انھیں ہم بلاغت کے مربوط اصول و ضوابط نہیں کہہ سکتے۔

بہر حال جاحظ کو یہ فخر تو حاصل ہو ہی گیا کہ اُس نے ''البیان و التبیین'' کے ذریعے پہلی مرتبہ بلاغت کے کچھ مسائل اور اصول و ضوابط کو کتابی شکل میں پیش کیا اور اپنی بحث و تحقیق کا موضوع بنایا۔ سب سے پہلے کیا جانے والا کام خواہ کتنا ہی ہلکا اور کمزوریوں نہ ہو، اس سے اولیت کا شرف کوئی نہیں چھین سکتا۔ عربی زبان و ادب پر جاحظ کے جہاں دوسرے بہت سے احسانات ہیں، وہاں یہ احسان بھی اُس کی عظمت کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ علم بلاغت کی تاریخ پر جب بھی گفتگو ہوگی، اولیت کا تاج جاحظ کے سر پر ہی سجے گا۔

(۳) جاحظ کے بعد دولت عباسیہ کے ایک خلیفہ ابو العباس عبد اللہ بن المعتز باللہ (296ھ) کا نام سب سے ممتاز ہے۔ ابن المعتز صرف ایک دن کے لیے عباسی پایۂ تخت پر بیٹھا۔ جس دن خلافت سنبھالی، اُسی دن قتل کر دیا گیا۔ وہ ایک بڑا ادیب و شاعر تھا۔ **طبقات الشعراء، فصول التماثیل** اور **البدیع** اس کی علمی یادگاریں ہیں۔ زمانی ترتیب کے لحاظ سے علم بلاغت میں جاحظ کی ''البیان و التبیین'' کے بعد ابن المعتز کی ''البدیع'' کا نام آتا ہے۔ یہ کتاب عبد المنعم خفاجی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ ابن المعتز علم بلاغت کے قواعد و ضوابط کو کتابی شکل میں پیش کرنے والا دوسرا شخص ہے۔ اُسے علم بدیع کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ ابن المعتز نے ''البدیع'' میں استعارہ، تجنیس، اعجاز، تشبیہ، کنایہ، ہزل، التفات اور اعتراض وغیرہ پر بحث کی ہے۔ شوقی ضیف کے مطابق:

”وقد ألفه ليُبين أن المحدَثِينَ لم يختَرِعوا البديعَ وأيضاً وُجد عند العرب منذ القديم في العصر الجاهلي وفي القرآن الكريم والعصر الإسلامي۔“(البلاغة:تطورو تاریخ ،شوقی ضیف،ص:67)

اُس نے یہ کتاب اِس لیے ترتیب دی تاکہ یہ ثابت کر سکے کہ علم بدیع کو نئے لوگوں نے ایجاد نہیں کیا ہے، بلکہ یہ علم زمانۂ قدیم سے جاہلی عرب میں بھی موجود تھا اور قرآن کریم اور عصر اسلامی میں بھی موجود رہا۔

ابن المعتز کے بہت سے نظریات سے اختلاف کے باوجود یہ بات تسلیم کرنے میں کسی کو تردد نہیں ہے کہ اُس نے اپنی کتاب ”البدیع“ کے ذریعے علم بلاغت کی علمی اساس مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور پہلی مرتبہ بدیع کو موضوع بنا کر علم بلاغت کی ایک ایسی شاخ کے طور پر متعارف کرایا، جو خود بھی ایک مستقل علم بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

(۴) ابن المعتز کے بعد علم بلاغت کو تحریری شکل میں آگے بڑھانے کے لیے جو شخص سامنے آیا، اُسے دنیا قدامہ بن جعفر (337ھ) کے نام سے جانتی ہے۔قدامہ بن جعفر کا تعلق ایک عیسائی خاندان سے تھا۔وہ سترہویں عباسی خلیفہ مکتفی باللہ کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا۔علم وادب کا رسیا تھا۔ فلسفہ وکلام پر بھی عبور تھا۔کئی کتابیں تصنیف کیں۔ان میں ”نقد الشعر“ کو ممتاز مقام حاصل ہے۔

”نقد الشعر“ میں قدامہ بن جعفر نے علم البیان کے اُن مباحث کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے، جو جاحظ کی کتاب ”البیان والتبیین“ میں ناقص رہ گئے تھے۔اس طرح اُس نے جاحظ کے شروع کیے ہوئے کام کو آگے بڑھایا اور اُس کے ذریعے پہلی مرتبہ اٹھائے گئے مباحث کو اتمام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب میں اُس کی اکثر توجہ شعر کے محاسن پر رہی ہے، کیونکہ اُس کا ماننا ہے کہ شعر میں مختلف ناحیوں سے وہ تمام موضوعات آجاتے ہیں، جو بلاغت کے ذیل میں آتے ہیں۔اگر کوئی شخص حسنِ شعر کے تمام گوشوں پر عبور حاصل کرے تو اس کا مطلب ہے کہ اُسے علم بلاغت پر عبور حاصل ہوگیا ہے۔اپنے اس نظریے کے تحت قدامہ بن جعفر نے مبالغہ، تمثیل، مقابلہ، توشیح، اشارہ، ترصیع، غلو، تتمیم اور تکافؤ کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔بعض مباحث میں اپنے پیش رو مصنف ابن المعتز پر اشکال وارد کیے ہیں اور بعض موضوعات کے ذیل میں اُس کا رد بھی کیا ہے۔اس لحاظ سے قدامہ بن جعفر کی کتاب ”نقد الشعر“ علم بلاغت میں بہت بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔

(۵) قدامہ بن جعفر کے بعد جن لوگوں نے علم بلاغت کی ترویج واشاعت کا محاذ سنبھالا، اُن میں سے اکثر متکلمین تھے۔مختلف کلامی مدارسِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ان لوگوں نے قرآن کریم کے اعجازِ بیان کے مختلف ناحیوں پر گفتگو کرتے ہوئے متعدد کتابیں لکھیں۔ان کتابوں کا اصل مقصد ان کے کلامی افکار کی توثیق وتصدیق تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بالواسطہ طور پر علم بلاغت کی بھی عظیم خدمت انجام پائی گئی۔اس لیے علم بلاغت کی تاریخ میں ان متکلم علمائے بلاغت کو فراموش کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس ذیل میں سب سے ممتاز اور پہلا نام علی بن عیسیٰ الرمانی (384ھ) کا ہے۔اُس کا تعلق معتزلہ کے کلامی مدرسۂ فکر سے تھا۔رمانی نے اپنی مایہ ناز کتاب ”النكت في إعجاز القرآن“ میں کلامِ الٰہی کے بلاغی پہلوؤں پر ایسی بے مثال بحثیں کی ہیں کہ شوقی ضیف کو بھی کہنا پڑا:

”أنه أضاف في حديثه عن البلاغة إضافات جديدة إلى من سبقوه۔“(البلاغة العالية، عبدالمتعال الصعیدی،ص36)

اُس نے بلاغت پر اپنے مباحث کے ذریعے اپنے پیش رو علمائے بلاغت کی تحقیقات پر نئے نئے اضافے کیے ہیں۔

اس ذیل کے علمائے بلاغت میں ایک نہایت ممتاز نام ابوبکر محمد بن الطیب الباقلانی (403ھ) کا بھی ہے۔ باقلانی فقہی طور پر مالکی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور فقہ مالکی کے عظیم عالم تھے۔ کلامی طور پر اہل سنت کے ایک کلامی مکتبِ فکر ''اشعری'' سے تعلق تھا۔ دو درجن سے زائد کتابیں لکھیں، جن میں ''إعجاز القرآن'' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر علم البدیع کے گرد گھومتی ہے۔ باقلانی نے قرآن کریم میں علم البدیع کی کارفرمائیوں کو دکھایا ہے اور اعجازِ قرآن کو بلاغی اسلوب میں ثابت کیا ہے۔ اس کتاب میں وہ جا بہ جا اپنے پیش رو علمائے بلاغت پر اعتراض اور ان کا رد کرتے نظر آتے ہیں۔

ان دونوں کے بعد متکلمین کے ذریعے علم بلاغت پر قلم اٹھانے کا سلسلہ چل پڑا اور وقتاً فوقتاً متکلمین اس میدان میں اپنے جوہر دکھاتے رہے۔

(٦) چوتھی صدی ہجری کے ماہرِ بلاغت ابوالحسن محمد بن احمد بن طباطبا علوی اصبہانی (322ھ) کو علم بلاغت کی تاریخ میں اس لیے اہم مقام حاصل ہے کہ انھوں نے ادب وشعر کے متعلق نصف درجن کتابیں تصنیف کیں۔ **الشعر و الشعراء، نقد الشعر، العروض، سنام المعالي، تهذيب الطبع** اور **عيار الشعر** جیسی اہم کتابیں ادب کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں سے ''**عيار الشعر**'' میں بلاغت کے مباحث خصوصیت کے ساتھ زیر بحث آئے ہیں۔ اصبہانی نے شعر کے حسن وقبح، اُس کی ساخت اور اس میں بلاغت کی شمولیت کو جانچنے پرکھنے کے مختلف پیمانے مقرر کیے ہیں۔ اس لیے یہ کتاب فن بلاغت کی بنیادی کتابوں میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

(٧) چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں اصبہانی نے علم بلاغت کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا تو اس صدی کے اواخر میں ابوہلال حسن بن عبداللہ العسکری (395ھ) نے علم بلاغت کی اہم خدمات انجام دی۔ ابوہلال عسکری نے ''**الصناعتين**'' تصنیف کی، جس میں نثر اور شعر کو ادب کی دو مرکزی صنعتیں قرار دیتے ہوئے، ان دونوں کے محاسن ومعائب کو موضوع بنایا۔ عسکری نے اپنے پیش رو علمائے بلاغت میں سے خاص طور پر ابن المعتز، رمانی اور باقلانی سے استفادہ کیا۔ ان سے استفادے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے مکھی پر مکھی مارنے کی روش اختیار کی اور بعینہ ان کی باتیں نقل کردی ہوں بلکہ ان سب سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی راہ الگ بنائی اور متعدد مباحث کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ''**الصناعتين**'' کو تاریخِ بلاغت میں نمایاں مقام حاصل ہوا۔

(٨) **ابن رشيق القيرواني** (463ھ) کا نام علم بلاغت کی تاریخ میں نہایت ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کا پورا نام ابوعلی الحسن بن رشیق ہے۔ اپنے زمانے کا بڑا ادیب، شاعر اور ماہرِ بلاغت تھا۔ علم بلاغت میں اس کی مشہورِ زمانہ کتاب ''**العمدة في صناعة الشعر ونقده**'' میل کا پتھر سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس کتاب میں ابن رشیق نے اپنے پیش رو تمام اہم ماہرین بلاغت کے نظریات کا احاطہ کرکے ان پر قیمتی اضافے اور اہم اعتراضات کیے ہیں۔ اس طرح اس کی کتاب ''**العمدة**'' صرف مصنف کے خیالات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ مصنف سے پہلے پیدا ہونے والے تمام اہم علمائے بلاغت کے افکار ونظریات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے والے کے سامنے بہ یک وقت تیسری صدی ہجری کے اوائل سے لے کر پانچویں صدی ہجری کے نصف اوّل تک کے ممتاز ماہرین بلاغت کے نظریات آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہ کتاب دنیا بھر میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے اور بلاغت کا ذوق رکھنے والے اس کتاب سے استفادہ کرتے ہیں۔

(٩) ابن رشیق قیروانی کے معاصرین میں ایک اہم نام ابومحمد عبداللہ بن محمد بن سعید بن سنان الخفاجی (466ھ) کا ہے۔ ابن سنان نے شام کے بڑے علما وفضلا کے علاوہ عظیم فلسفی شاعر ابوالعلاء المعری (449ھ) سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب ''**سرّ الفصاحة**'' میں بلاغت

کی مختلف شاخوں کی تقسیم وتحدید کی کوشش کی ہے، فصاحت اور بلاغت کے درمیان فرق واضح کیا ہے اور ان دونوں کے اوصاف پر بحث کی ہے۔

(۱۰) پانچویں صدی ہجری میں علم بلاغت کی تاریخ میں ایک ایسا نام بھی جڑا، جو آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ وہ نام ہے ابوبکر عبدالقاہر بن عبدالرحمن بن محمد الجرجانی (471ھ)، جسے دنیا علم بلاغت کے مؤسس اور بانی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ عبدالقاہر جرجانی کو شعر وادب، نحو اور علوم القرآن میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ جرجانی نے علم بلاغت میں دو کتابیں ''دلائل الإعجاز'' اور ''أسرار البلاغة'' تصنیف کیں۔ حسنِ ترتیب، عمدہ اندازِ تفہیم اور علمی وسعت و گہرائی کی وجہ سے ان دونوں کتابوں کو اتنی پذیرائی اور مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج بھی عربی ادبیات سے واقفیت کا دعویٰ کرنے والا کوئی شخص ان کتابوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

عبدالقاہر جرجانی نے ان دونوں کتابوں میں اعجاز قرآن، علم البیان، علم البدیع، علم المعانی اور ان سے پھوٹنے والے مباحث پر مفصل بحث کی ہے۔ جرجانی کی خاصیت یہ ہے کہ اُن کے ہاں دلائل کے طور پر ضرب الامثال اور محاورات ورائج تعبیرات کی طرف غالب رجحان ملتا ہے۔ ساتھ ہی ان کا اسلوب متکلمانہ اور سائنٹفک بھی ہے، جس کے نتیجے میں ہر بحث مرتب انداز میں آگے بڑھتی ہے اور دلائل وشواہد کے ساتھ ایک منطقی انجام تک پہنچتی ہے۔

عبدالقاہر جرجانی سے پہلے بلاغت کے موضوع پر جو کچھ لکھا گیا، وہ متفرق انداز کا تھا۔ مختلف علما نے مختلف مباحث پر گفتگو کی تھی۔ جرجانی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے بلاغت سے متعلق تمام مباحث کا احاطہ کر کے سب پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس طرح وہ پہلے شخص ہیں، جو بلاغت کو ایک مستقل علم کے طور پر متعارف کرانے میں کامیاب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں علمِ بلاغت کا بانی کہا جاتا ہے۔ یعنی جاحظ نے بلاغت کے مسائل کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا آغاز کیا اور جرجانی نے بلاغت کے مسائل منضبط کر کے سب کو یکجا کیا اور اسے ایک مستقل علم بنا دیا۔ یا یوں کہہ لیں کہ بلاغت کو علم بلاغت بنا دیا۔ علامہ رشید رضا مصری اور شیخ یحییٰ بن حمزہ حسینی جیسے معاصر اساطین نے بھی جرجانی کو علم بلاغت کا مؤسس تسلیم کیا ہے۔

(۱۱) بات ادھوری رہ جائے گی اگر علم بلاغت کی تاریخ میں ابوالقاسم محمود بن عمر الزمخشري (538ھ) کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ علامہ زمخشری عجیب و غریب ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، نحو اور جغرافیا جیسے مختلف علوم پر اہم کتابیں تصنیف کیں۔ علم تفسیر میں ان کی کتاب ''الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الأقاویل في وجوه التأویل'' شہرہ آفاق ہے اور اپنے موضوع پر اہم آخذ سمجھی جاتی ہے۔

زمخشری کی تفسیر ''الکشاف'' اگرچہ بنیادی طور پر تفسیر قرآن کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اس میں علم بلاغت کا بھی عظیم سرمایہ موجود ہے۔ زمخشری وہ پہلے ماہرِ بلاغت ہیں، جنھوں نے علم المعانی اور علم البیان کو دو الگ الگ علوم کی حیثیت سے نمایاں کیا ہے اور ان کے اوصاف وخصائص ذکر کیے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے علم البدیع کو مستقل علم ماننے کے بجائے، معانی اور بیان کا تابع بھی قرار دیا ہے۔

شوقی ضیف نے اپنی کتاب ''البلاغة: تطور و تاریخ'' میں لکھا ہے کہ جرجانی اور زمخشری علم بلاغت کے دورِ عروج کے آخری مجتہد عالم ہیں۔ ان دونوں کے بعد علم بلاغت میں جمود کا دور شروع ہو گیا اور نئے مباحث اٹھانے اور نئے اسالیب اختیار کرنے کا دروازہ بند ہو گیا۔

(۱۲) علمِ بلاغت کے دورِ جمود کے آغاز میں فخر الدین رازی (604ھ) کی کتاب ''نهایة الإیجاز في درایة الإعجاز'' اور سکاکی (626ھ) کی کتاب ''مفتاح العلوم'' سامنے آئیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی بہت مشہور ہوئیں۔ ان میں سے سکاکی کو بعض لوگوں نے علم بلاغت کا مؤسس قرار

دینے کی بھی کوشش کی۔لیکن اس کا اعتراف سب کو ہے کہ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفوں کی عظمت کے باوجود علم بلاغت میں کوئی نئی راہ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہیں۔

(۱۳) علمِ بلاغت کے دورِ جمود میں پرانی کتابوں کی تلخیصات، شروحات اوران کے علمی موادکو اپنے انداز سے پیش کرنے کا سلسلہ چل پڑا۔اس ذیل میں ابن الاثیر (630ھ) کی کتاب ''المثل السائر في أدب الكاتب و الشاعر'' خاصی مشہور ہوئی۔اسی طرح آٹھویں صدی ہجری کے نصف اول میں خطیب قزوینی کی کتاب ''تلخيص المفتاح'' بھی مقبول ہوئی۔یہ کتاب درحقیقت سکاکی کی ''مفتاح العلوم'' کی تلخیص تھی۔

(۱۴) تیسری صدی ہجری میں جاحظ سے علمی طور پر بلاغت کا آغاز ہوا۔یہ سلسلہ ساتویں صدی ہجری تک نہایت کمزور ہوگیا۔یعنی عباسی دورِ حکومت میں ہی علم بلاغت کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا آغاز ہوا، اسی دورِ حکومت میں یہ علم اپنے عروج کو پہنچا اوراسی دورحکومت میں انحطاط تک پہنچا۔یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عباسی دورِ حکومت کے کمزور پڑنے کے ساتھ ساتھ یہ علم بھی انحطاط کے قریب پہنچتا گیا۔

1.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے سے ہمیں معلوم ہوا کہ:

☆ علم بلاغت کسے کہتے ہیں؟ علمائے بلاغت نے کس کس انداز سے بلاغت کی تعریف کی ہے؟ اس علم کے کیا فوائداور کیا اثرات ہوتے ہیں؟ اورعلم بلاغت انسان زندگی کے لیے کیوں اہم ہے؟

☆ مناسب الفاظ وتراکیب اور حالات کے مطابق پورے قواعد وضوابط کی پابندی کے ساتھ اپنی بات پیش کرنے کو بلاغت کہتے ہیں۔جو علم ہمیں یہ فن سکھاتا ہے۔اسے علم بلاغت کہا جاتا ہے۔

☆ بلاغت کی تعریف کے سلسلے میں مختلف علمائے بلاغت نے مختلف باتیں کہی ہیں۔سب کا خلاصہ یہ ہے کہ زبان وبیان کے قواعد کی رعایت کرتے ہوئے مناسب الفاظ اور موزوں تراکیب وتعبیرات کا استعمال کرنا اور مقتضائے حال کا خیال کرنا بلاغت کہلاتا ہے۔بلاغت کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے ہماری بات پوری اثرانگیزی کے ساتھ قاری یا سامع کے دل ودماغ تک پہنچ جاتی ہے اوراپنا اثر دکھاتی ہے۔یہ اثرانگیزی کبھی کبھی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پورے پورے معاشرے کو بدل کررکھ دیتی ہے۔

☆ بلاغت کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہمارا کلام مؤثر ہوتا ہے، ہمارے ذوق کی تشکیل ہوتی ہے، فرد کی تعمیر ہوتی ہےاور بسا اوقات اس سے معاشرتی انقلاب بھی رونما ہوتا ہے۔اس لحاظ سے علم بلاغت کی اہمیت ماضی میں بھی رہی ہے اور مستقبل میں بھی باقی رہے گی۔

☆ بلاغت کی تاریخ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر اپنی بات کو مؤثر انداز سے دوسروں تک پہنچانے کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔خاص طور پر عرب میں زمانۂ جاہلیت میں بلاغت کے اصول وضوابط پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی رہی۔چھٹی صدی عیسوی میں اسلام آنے کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ نے بھی زبان وبیان کے حسن پر پوری توجہ دی اوراسے اہم انسانی ضرورت قرار دیا۔یہی رویہ خلفائے راشدین اوران کے بعد اموی دورِ حکومت میں بھی پایا گیا۔لیکن اموی دورحکومت تک بلاغت کے اصول و

ضوابط کو تحریر کرنے کا رواج نہیں ہوا تھا۔عباسی دورِحکومت میں پہلی مرتبہ تیسری صدی ہجری میں جاحظ نے یہ سلسلہ شروع کیا۔آ گے چل کر پانچویں صدی ہجری میں عبدالقاہر جرجانی نے بلاغت کو ایک مستقل علم کی شکل دی۔ پھر یہ علم جمود کا شکار ہو گیا اور نئے مباحث کو نئے انداز سے اٹھانے کا سلسلہ بند ہو گیا۔عہدِ جمود کے بعد عباسی دورحکومت کے اختتام تک عہد انحطاط بھی آ گیا۔البتہ اس علم میں کتابیں ہمیشہ تصنیف کی جاتی رہیں۔علم بلاغت کے ارتقا وانحطاط اور ہر دور کے بڑے علمائے بلاغت کے نام درج ذیل ہیں:

آغاز	تیسری صدی ہجری	جاحظ، ابن المعتز
ارتقا	چوتھی صدی ہجری	ابن طباطبا، قدامہ بن جعفر، رمانی، عسکری
مستقل علم کی حیثیت	پانچویں صدی ہجری	باقلانی، ابن رشیق، ابن سنان، جرجانی
عروج	چھٹی صدی ہجری	زمخشری
ابتدائی دور جمود	ساتویں صدی ہجری	رازی، سکاکی، ابن اثیر
مکمل جمود	آٹھویں صدی ہجری	قزوینی

1.7 فرہنگ

الفاظ	معانی
متکلم	بات کرنے والا
مقتضائے حال	حالات کا تقاضا
استعداد	قابلیت، صلاحیت
شیریں	میٹھا
متقدمین	کسی فن میں ابتدائی دور کے ماہرین
تکلفات	بناوٹیں، نمائشیں
تراکیب	کئی الفاظ کے مجموعے
عناصر	بنیادیں، اصل
ہیئت	شکل وصورت، ساخت
تعبیر	بیان کرنا، عبارت میں لانا
مرصع	وہ نثر یا نظم جس میں ہر لفظ کے مقابل میں دوسرا لفظ اس وزن یا قافیہ کا آیا ہو
انقباض	طبیعت کا بوجھل ہونا
رزمیہ	جنگ کے حالات پر مبنی نظم

بنیادگزار	بنیاد رکھنے والا
فلاسفہ	فلسفی کی جمع
دادِشجاعت دینا	بہادری کا مظاہرہ کرنا
غم واندوہ	رنج والم
زراعت	کھیتی باڑی
حرب	جنگ
منضبط	منظم،مرتب
گفت وشنید	کہنا سننا
تنقیدوتنقیح	چھان پھٹک
طرح ڈالنا	بنیاد رکھنا
آویزاں کرنا	لٹکانا
جوامع الکلم	بہت مختصر لیکن انتہائی معنی خیز جملے
پیش رو	آگے چلنے والے
ثمرآور	پھل دار
متکلمین	علم کلام کے ماہرین، وہ لوگ جو اسلامی عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں

1.8 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تین سطروں میں دیجیے:

1- بلاغت کسے کہتے ہیں؟

2- رمّانی نے بلاغت کی کیا تعریف کی ہے؟

3- وہ چار نکات لکھیے جن سے بلاغت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

ب۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے:

1- علمائے بلاغت کے ذریعے کی گئیں بلاغت کی تعریفات کا جائزہ لیجئے۔

2- مختلف ماہرین بلاغت کی تعریفات سے کیا نتائج سامنے آتے ہیں؟

3- فرد کی تعمیر اور معاشرتی انقلاب میں علم بلاغت کا کیا کردار ہوتا ہے؟

4- علم بلاغت کے آغاز پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔

5- علم بلاغت کا مؤسس کون تھا؟ اس کی کتاب کا تعارف کرائیے۔

6- علم بلاغت کے دورِ جمود اور اس کے بعد کے کچھ علمائے بلاغت اور ان کی کتابوں کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

ج۔ تیس سطروں میں جواب لکھیے:

1- سوقِ عکاظ بلاغت کے لیے کس طرح مفید تھا؟

2- عہدِ نبوت میں بلاغت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا گیا؟

3- بلاغت کے موضوع پر جاحظ، ابن رشیق اور زمخشری کی کتابوں کے نام لکھیے۔

1.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1-	أسرار البلاغة	عبدالقاهر الجرجاني
2-	البلاغة العالية	عبدالمتعال الصعيدي
3-	البلاغة: تطور وتاريخ	شوقي ضيف
4-	مصادر الأدب العربي	محمد واضح رشيد الحسني الندوي
3-	الأدب العربي بين عرض ونقد	محمد الرابع الحسني الندوي

اکائی 2 فصاحت و بلاغت

اکائی کے اجزا

2.1 تمہید
2.2 مقصد
2.3 فصاحت کی تعریف
2.4 کلامِ فصیح کی شرطیں
2.5 بلاغت کی تعریف
2.6 کلامِ بلیغ کی شرطیں
2.7 فصاحت و بلاغت کے درمیان فرق
2.8 اکتسابی نتائج
2.9 فرہنگ
2.10 امتحانی سوالات کے نمونے
2.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

2.1 تمہید

اچھی اور صاف ستھری زبان کا استعمال انسان کی تہذیب وشرافت کا پتا دیتا ہے۔اسی لیے ہر زمانے میں اہل علم اور عام سنجیدہ افراد زبان کی خوب صورتی اور دلکشی پر توجہ دیتے رہے ہیں۔عربوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کم سنی میں ہی اچھے اور ممتاز قبائل میں رہنے کے لیے بھیج دیتے تھے۔اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ اُن کے بچے اچھی زبان سیکھ سکیں۔اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ کو بھی اُن کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ نے اسی لیے حضرت حلیمہ کے سپرد کیا تھا کہ آپ فطری ماحول میں زندگی گزار کر صحت مند بھی رہ سکیں اور زبان وبیان بھی سیکھ سکیں۔غرض یہ کہ انسان نے ہمیشہ اچھی زبان کو پسند کیا اور اسے اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھی زبان کیسی ہوتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ جو زبان فصاحت اور بلاغت دونوں کے معیار پر پوری اترے، وہی زبان اچھی اور معتبر سمجھی جائے گی۔اس لیے اہل زبان کے نزدیک معتبر زبان کو جاننے اور سیکھنے کے لیے فصاحت و بلاغت کے متعلق جاننا ضروری ہے۔فصاحت و بلاغت کی تعریفات، ان کی حقیقت اور اصول وشرائط معلوم ہو جائیں تو بہ آسانی اچھی زبان بولی اور لکھی جاسکتی ہے۔ایک پڑھے لکھے شخص اور خاص طور پر ایک طالب علم کے لیے ان چیزوں کا جاننا ضروری ہے۔اس لیے اس اکائی میں فصاحت و بلاغت کے متعلق تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

2.2 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ ہم فصاحت اور بلاغت کے متعلق معلومات حاصل کریں۔فصاحت کسے کہتے ہیں؟ بلاغت کیا ہوتی ہے؟ کوئی کلام فصیح وبلیغ کس طرح ہوتا ہے؟ اور فصاحت و بلاغت کے درمیان کیا فرق ہے؟ یہ سب وہ سوالات ہیں، جن کے جوابات کا علم ہونا ایک طالب علم کے لیے ضروری ہے۔اس اکائی میں ان تمام سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔

2.3 فصاحت کی تعریف

فصاحت کے لغوی معنی ظاہر ہونے، واضح ہونے، پیچیدگی اور ابہام سے پاک ہونے کے ہیں۔

المعجم الوسیط میں ہے:

الفصاحة سلامة الألفاظ من اللّحن و الإبهام و سوءِ التألیف۔

الفاظ کی غلطیوں، ابہام اور بے ترتیبی سے پاک ہونے کو فصاحت کہتے ہیں۔

معجم الرائد میں مزید وضاحت کے ساتھ لکھا ہے:

سلامة الکلام من التعقید۔ أما فصاحة المفرد فتكون بسلامة من تنافر الحروف، و من الكراهة في السمع و اللفظ و من غرابة الاستعمال، و من مخالفة القیاس اللغوي، و أما فصاحة المرکب فتكون بسلامته من ضعف التألیف، و من تنافر الكلمات، و من التعقید، و من التكرار، و من تتابع الإضافات۔

کلام کے الجھاؤ اور پیچیدگی سے محفوظ ہونے کو فصاحت کہتے ہیں۔ جہاں تک رہی بات کسی ایک لفظ کے فصیح ہونے کی تو وہ اس

وقت فصیح ہوگا، جب وہ تنافرِ حروف سے محفوظ ہو اور سننے یا ادا کرنے میں بھدے پن سے پاک ہو اور اس کا استعمال متروک اور لغوی قیاس کے خلاف نہ ہو۔ جہاں تک رہی بات کسی جملے کے فصیح ہونے کی تو وہ اس وقت فصیح ہوگا، جب وہ ترتیب کے لحاظ سے کمزور نہ ہو۔ مزید یہ کہ تنافر کلمات، پیچیدگی، تکرارِ بے جا اور غیر ضروری اضافوں سے محفوظ ہو۔

معجم الغنی میں ہے:

تحدّث بلغة فصيحة: بينةٍ خاليةٍ من التعقيد، واضحة المعنى۔

جب کہا جائے کہ وہ شخص فصیح زبان بولا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایسی صاف زبان بولا، جو پیچیدگی سے پاک اور واضح معانی پر مشتمل تھی۔

اسی لیے عربی زبان میں ''**فصح الصبح**'' اس وقت کے لیے استعمال کرتے ہیں، جب صبح اچھی طرح نمودار ہوجاتی ہے۔ ''**یوم فصیح**'' ایسے دن کو کہتے ہیں، جس میں آلودگی، بدلی یا کہرا وغیرہ نہ ہو۔

ماہرینِ لغت کی ان لفظی تعریفات سے کافی حد تک فصاحت کی اصطلاحی تعریف بھی معلوم ہوگئی۔ آیئے! اس سلسلے میں کچھ اور بات جانتے ہیں۔ فصاحت کی اصطلاحی تعریف اور اس کی حقیقت عام طور پر اس پیرایہ میں بیان کی جاتی ہے:

الكلام الفصيح ما كان واضحَ المعنى، سهلَ اللفظ، جيّدَ السبْکِ، ولهذا وجب أن تكونَ كلُّ كلمةٍ فيه جاريةٍ على القياس الصرفي، بينةٍ في معناها، مفهومةٍ عذبةٍ سلسةٍ، وإنما تكون الكلمةُ كذلک إذا كانت مألوفةَ الاستعمال بين النابهين من الكتاب والشعراء، لأنها لم تتداولُها ألسنتُهم، ولم تجرِ بِهَا أقلامُهم إلا لمكانها من الحسن باستكمالها جميع ماتقدم من نعوت الجودة وصفات الجمال۔

کلامِ فصیح وہ ہوتا ہے، جو معنی کے اعتبار سے واضح، ادائی کے لحاظ سے آسان اور ترتیب کے لحاظ سے عمدہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کلام کا ہر لفظ قیاس صرفی کے لحاظ سے درست، معانی کے لحاظ سے بالکل واضح اور اپنے لائقِ فہم ہونے کے لحاظ سے شیریں اور سلیس ہو۔ کسی بھی لفظ کے ان صفات کے حامل ہونے کا پتا اس طرح چل سکتا ہے کہ اُس لفظ کو مشاہیر مصنّفین اور شعرا نے استعمال کیا ہو۔ کیونکہ ان کی زبان وقلم پر وہی الفاظ جاری ہوتے ہیں، جن کے اندر مذکورہ بالا محاسن ہوتے ہیں۔

اس گفتگو سے کئی اہم باتیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ فصاحت کی حقیقت سمجھنے کے لیے ان باتوں کا سمجھنا لازمی ہے۔

پہلی بات یہ کہ فصیح کلام وہ ہوتا ہے، جو مفہوم اور معنی کے لحاظ سے بالکل واضح ہو۔ اس میں جو بات کہی گئی ہو، وہ بہ آسانی سمجھ میں آجائے۔ وہ ایسی بات نہ ہو، جس کو سمجھنے میں دشواری ہو اور قاری ذہن ہی دوڑاتا رہے کہ اس میں کیا بات کہی جارہی ہے۔ بلکہ قاری یا سامع پڑھتے یا سنتے ہی سمجھ جائے کہ کیا بات بیان کی جارہی ہے۔ اُس کلام کے مفہوم ومراد کی طرف فوراً ذہن منتقل ہوجائے۔

دوسری بات یہ کہ اس میں ایسے پیچیدہ اور عجیب وغریب الفاظ نہ استعمال کیے گئے ہوں، جن کو پڑھنا یا زبان سے ادا کرنا دشوار ہو۔ متروک اور اجنبی الفاظ نہ استعمال کیے گئے ہوں۔ اہل زبان کے نزدیک انتہائی کم استعمال ہونے والے الفاظ یا مصنوعی الفاظ نہ استعمال کیے گئے ہوں۔ بلکہ کلام میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ ایسے ہوں، جنھیں اہل زبان روزمرہ میں استعمال کرتے ہوں۔ ہر شخص اُن کو سمجھ سکتا ہو، کسی کے لیے وہ اجنبی

یا نا قابل فہم نہ ہوں اور اُن کو اپنی زبان سے ادا کرنا ہر ایک کے لیے آسان ہو۔

تیسری بات یہ کہ اُس کلام کو خوب صورت انداز میں ترتیب دیا گیا ہو۔ ہر جملہ حسن ترتیب کا آئینہ دار ہو۔ الفاظ کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر اس انداز میں کی گئی ہو کہ پڑھنے یا سننے والے کو نہ بات سمجھنے میں دشواری ہو اور نہ جملے کو پڑھنے یا سننے میں۔ بلکہ پڑھنے یا سننے میں بھی لطف آئے اور حسن ترتیب کی وجہ سے بات بھی ذہن و دماغ میں جاگزیں ہوتی چلی جائے۔

چوتھی اہم بات یہ بتائی گئی ہے کہ ہر لفظ قیاسِ صرفی کے لحاظ سے بالکل درست ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیاسِ صرفی کیا ہے؟ دراصل ہر زبان کی ایک صرف ہوتی ہے، یعنی ہر زبان میں اس بات کا ایک مخصوص علم ہوتا ہے کہ اُس زبان کا کون سا لفظ کس طرح بنا؟ اس کی اصل کیا ہے؟ موجودہ شکل تک پہنچنے میں اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اور کیوں ہوئیں؟ لہٰذا فصیح کلام کی ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ اس میں استعمال ہونے والا کوئی لفظ بغیر کسی اصول وضابطے کے وضع نہ کیا گیا ہو۔ بلکہ ہر لفظ ایسا ہو، جس کی صحت پر ماہرین زبان متفق ہوں اور اس کو درست سمجھتے ہوں۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کون سا لفظ صرفی لحاظ سے درست ہے، ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ اس لفظ کو اُس زبان کے مستند ادبا یا شعرا نے استعمال کیا ہو۔ ان کا استعمال ہمیں بتادے گا کہ کون سا لفظ فصیح ہے اور کون سا نہیں؟ کیونکہ یہ دونوں ہر لفظ بہت ناپ تول کر استعمال کرتے ہیں اور غلط الفاظ کے استعمال سے بچتے ہیں۔ جس زمانے میں جو لفظ فصیح ہوتا ہے، اس زمانے کے مستند ادبا و شعرا اُسی لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

فصاحت سے مراد یہ ہے کہ لفظ یا محاورے یا فقرے کو اس طرح بولا یا لکھا جائے، جس طرح مستند اہل زبان لکھتے یا بولتے ہیں۔ لہٰذا فصاحت کا تصور زیادہ تر سماعی ہے۔ اس کی بنیاد روزمرۂ اہل زبان پر ہے، جو بدلتا بھی رہتا ہے۔ اسی لیے فصاحت کے بارے میں کوئی دلیل لانا یا اصول قائم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ فصاحت کا تصور بھی زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور الفاظ بھی زمانے کے ساتھ فصیح یا غیر فصیح بنتے رہتے ہیں۔ (درس بلاغت، ص14)

2.4 کلامِ فصیح کی شرطیں

اہل علم اور اہل زبان نے فصیح کلام کی چار شرطیں بیان کی ہیں۔ ذیل میں ان چاروں شرطوں کو مثال کے ساتھ ترتیب وار بیان کیا جا رہا ہے تاکہ بات کو اچھی طرح واضح کیا جاسکے۔

الف: صحتِ ترتیب

کلام کے فصیح ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ جملوں کی ترتیب اصول وضوابط کے مطابق ہو۔ قواعد کے لحاظ سے جس لفظ کو جہاں آنا چاہیے، وہ وہیں آئے۔ مثال کے طور پر عربی قاعدے کے مطابق ضمیر اپنے سے پہلے لفظ کی طرف لوٹتی ہے، بعد والے کی طرف نہیں لوٹتی۔ یہ قاعدہ ہر خاص و عام کی زبان میں پایا جاتا ہے۔ لیکن عربی کا ایک شعر ہے:

وَلَو أَنَّ مجدًا أَخلد الدهر واحداً   من الناس أبقى مجدُهُ الدهرَ مطعمًا

''مجدہ'' میں ھو ضمیر مُطعم کی طرف لوٹ رہی ہے، لیکن مطعم ضمیر سے پہلے آنے کے بجائے ضمیر کے بعد آ رہا ہے۔ لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ شعر فصیح کلام کے اصول وضوابط پر پورا نہیں اتر رہا ہے اور غیر فصیح ہے۔

ب: تنافرِ کلمات سے محفوظ ہونا

کلامِ فصیح کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ جملہ تنافرِ کلمات سے محفوظ ہو۔ تنافرِ کلمات کا مطلب یہ ہے کہ اُس جملے میں الفاظ کی ترتیب اور اُن کی ترکیب ایسی نہ ہو کہ پڑھنا دشوار ہو جائے یا سننے میں کانوں پر بار محسوس ہو۔ مثال کے طور پر ایک شاعر کا مشہور شعر ہے:

وقبرُ حربٍ بمكانٍ قفرٍ وليس قرب قبرِ حربٍ قبرُ

اس شعر میں کوئی ترتیب یا ترکیب غلط تو نہیں ہے، لیکن کچھ اس انداز کی ہے کہ اس شعر کو دو تین مرتبہ جلدی جلدی نہیں پڑھا جا سکتا۔ الفاظ کی ترتیب کا یہ عدمِ تناسب اور پیچیدگی تنافرِ کلمات کہلاتی ہے۔ جس کلام میں یہ تنافر پایا جائے گا، وہ کلام فصیح نہیں ہوگا۔

ج: تعقیدِ لفظی سے محفوظ ہونا

تعقیدِ لفظی سے محفوظ ہونا بھی کلامِ فصیح کی ایک شرط ہے۔ تعقید کا مطلب ہوتا ہے پیچیدگی اور گنجلک پن۔ مطلب یہ ہے کہ کلام میں لفظی اعتبار سے تعقید اور پیچیدگی نہ ہو۔ یعنی الفاظ کی غلط تقدیم وتاخیر اور بے جا فاصلہ یا بے جا اتصال نہ ہو۔ جس لفظ کو پہلے آنا چاہیے، وہ پہلے ہی آئے۔ جس لفظ کو بعد میں آنا چاہیے، وہ بعد میں آئے۔ جن دو لفظوں کے درمیان فاصلہ نہ ہونا چاہیے، اُن کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔ کیونکہ اس طرح کی کمیوں کی وجہ سے کلام کا مقصد اور مدعا پوری طرح واضح نہیں ہو پاتا۔ اسی کا نام تعقیدِ لفظی ہے۔ متنبی کا شعر ہے:

أنّى يكون أبا البرية آدمُ وأبوک والثقلانِ أنت محمّدُ؟

حالانکہ اسے اس طرح ہونا چاہیے: کیف یکون آدم أباالبریة، وأبوک محمد وأنت الثقلان۔ لیکن ترتیب کے بدل جانے اور ''ابوک محمد'' میں مبتدا خبر کے درمیان فاصلہ ہو جانے اور ''والثقلان أنت'' میں خبر کے مبتدا سے مقدم ہونے کی وجہ سے بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ اگر اس شعر میں ایک آدھ جگہ ایسا ہوتا تو بات سمجھ میں آ سکتی تھی، لیکن ایک شعر میں ایک سے زائد مرتبہ اس کمی کا پایا جانا، قاری تک شعر کو پہنچنے سے روک رہا ہے۔ یہ ایک مذموم وصف ہے، جس کی وجہ سے کلام فصیح نہیں ہو پاتا۔

د: تعقید معنوی سے محفوظ ہونا

کلام کے فصیح ہونے کی چوتھی اور آخری شرط یہ ہے کہ کلام تعقید معنوی سے محفوظ ہو۔ تعقید معنوی کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں کوئی ایک یا ایک سے زائد لفظ ایسے معنی میں استعمال کیا جائے، جس معنی میں اس کا استعمال نہ ہوتا ہو۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں ''لسان'' کو ''لغت'' یعنی Language کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن کوئی اس کو جاسوسی کے معنی میں استعمال کرے، تو یہ تعقید معنوی ہوگی۔

اسی طرح کلام میں کوئی ایسی بات کہی جائے، جس سے کلام کا موضوع متاثر ہو رہا ہو۔ مثال کے طور پر کوئی اپنے محبوب کی وفاداری دکھانے کے لیے کتے کا لفظ استعمال کرے۔ کتے کی وفاداری میں کوئی شک نہیں، لیکن محبوب کے لیے اس کے استعمال کو تعقید معنوی کہیں گے۔ جس کلام میں بھی اس طرح کی باتیں پائی جائیں گی، وہ کلام تعقید معنوی کا حامل ہوگا اور غیر فصیح ہوگا۔

2.5 بلاغت کی تعریف

بلاغت کی تعریف اوراس کے متعلق بنیادی باتیں آپ پہلی اکائی میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں مختصراً کچھ باتیں بیان کی جارہی ہیں۔ اہل لغت نے بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے تقریباً یکساں باتیں کہی ہیں۔ معجم الرائد میں ہے:

هي أن يكون الكلام مطابقاً لمقتضى الحال مع فصاحته۔

فصاحت کا خیال رکھتے ہوئے حالات کے مطابق بات کرنا۔

المعجم الوسیط میں کہا گیا ہے:

البلاغة عند علماء البلاغة: مطابقة الكلام لمقتضى الحال مع فصاحته۔

علمائے بلاغت کے نزدیک بلاغت کہتے ہیں: فصاحت کے ساتھ حالات کے مطابق بات کرنا۔

علمائے بلاغت نے عام طور پر یہ بات لکھی ہے:

هي تأدية المعنى الجليل واضحاً بعبارةٍ صحيحة فصيحة، لها في النفس أثر خلاب، مع ملاءمة كل كلام للموطن الذي يقال فيه، والأشخاص الذين يخاطبون۔

اچھی باتوں کو درست اور فصیح عبارتوں کے ذریعے اس طرح بیان کرنا کہ دل پر اس کا گہرا اثر ہو۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی پورا خیال رکھا جائے کہ ہر بات جگہ اور مخاطبوں کے لحاظ سے پوری طرح مناسب ہو۔

ان تعریفات سے ہمارے سامنے بلاغت کی تعریف اور اس کی حقیقت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔ ہمیں پتا چلتا ہے کہ بلاغت میں پورا زور اپنی بات کو قاری یا سامع کے دل میں اتار دینے پر ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے بلاغت کہا جاتا ہے۔ بلغ کے معنی ہوتے ہیں پہنچنا۔ یعنی جو بات قاری یا سامع کے دل و دماغ تک بہ آسانی پہنچ جائے، اُسی کا نام بلاغت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ الفاظ کا اچھا ہونا بھی ضروری ہے، باتوں کا اچھا ہونا بھی ضروری ہے اور موقع محل کا درست ہونا بھی ضروری ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان زبان تو بڑی شان دار استعمال کررہا ہے، لیکن باتیں بڑی گھٹیا کہہ رہا ہے۔ ایسے میں کوئی باذوق انسان اُس کی بات کی طرف توجہ نہیں دے گا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان بات تو بہت اعلیٰ اور زبردست بیان کررہا ہے، لیکن اُسے اپنی بات پیش کرنے کے لیے اچھی زبان نہیں آئی۔ وہ الٹے سیدھے الفاظ استعمال کرکے اپنی بات دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی وہ شخص ناکام ہوجائے گا اور کوئی اس کی بات پر توجہ نہیں دے گا، کیونکہ اس کی زبان خراب ہے۔ ان دونوں صورتوں کے برعکس کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی زبان بھی بہت اچھی ہے اور باتیں بھی بہت اعلیٰ ہیں۔ لیکن وہ موقع محل کا خیال نہیں رکھ پارہا ہے۔ کسی کے ہاں کوئی غم کا موقع ہے اور ہم اُسے اعلیٰ اسلوب میں نصیحت کرنے پہنچ گئے۔ ایسے میں کون ہماری بات سنے گا؟ معلوم ہوا کہ موقع محل کا درست ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے بلاغت کے لیے ضروری قرار دے دیا گیا کہ بات کو موقع محل کی رعایت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ یہ رعایت نہ کی گئی تو کلام بلیغ نہیں ہوسکے گا۔

2.6 کلامِ بلیغ کی شرطیں

کسی کلام میں بلاغت پائے جانے کی دو شرطیں ہیں۔ یہاں ان کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے:

الف: فصاحت

کسی بھی کلام کے بلیغ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر فصاحت بھی پائی جائے۔ جو بات کہی جائے وہ اچھے انداز میں، اچھے الفاظ کے استعمال کے ساتھ اور الجھے ہوئے یا پیچیدہ جملوں کے ذریعے نہ کہا جائے۔ بلکہ جو بھی بات ہو، وہ بہت اچھے الفاظ، صاف ستھرے جملوں اور اصول وضوابط کے مطابق استعمال کیے گئے الفاظ اور جملوں کے ساتھ ادا کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو کلام فصیح نہیں ہوگا اور اگر کلام فصیح نہ ہوا تو وہ بلیغ بھی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا کلام کے بلیغ ہونے کے لیے سب سے پہلے اُس کا فصیح ہونا ضروری ہے۔

یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی بات اچھے انداز میں نہ کہی جائے، اُس میں الٹے سیدھے الفاظ ہوں، غیر مرتب جملے ہوں اور بہت زیادہ الجھاؤ بھی ہو تو وہ بات کسی کے دل میں کیسے اتر سکتی ہے؟ دل میں اترنا تو بہت دور کی بات ہے، ایسی باتوں کو تو کوئی سننا بھی گوارہ نہیں کرتا۔ جب ایسی باتیں سنی نہیں جائیں گی تو وہ کسی کے دل و دماغ تک کیسے پہنچیں گی؟ جب وہ دل و دماغ تک نہیں پہنچ سکتیں تو انھیں کلامِ بلیغ یا بلاغت کیسے کہا جاسکتا ہے؟ بلیغ کلام یا بلاغت کہتے ہی ہیں ایسے کلام کو جو دل و دماغ تک پہنچ جائے۔ اس لیے بلاغت کے لیے سب سے پہلی شرط فصاحت ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ کلام بلیغ کی پہلی شرط ہے کہ اس میں کلامِ فصیح کا مکمل خیال رکھا گیا ہوں۔

ب: اقتضائے حال

بلاغت کی دوسری اور انتہائی اہم شرط یہ ہے کہ کلام حالات کے مطابق ہو۔ حالات کے مطابق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت بات کہی جا رہی ہو، اُس وقت کے لحاظ سے بھی درست ہو اور جن لوگوں سے کہی جا رہی ہو اُن لوگوں کے مزاج و حالات کے بھی مطابق ہو۔ مثال کے طور پر آپ کسی کو گرمی سے بچنے اور گرمی کے موسم میں پھیلنے والی بیماریوں سے محفوظ رہنے کی نصیحت کریں۔ آپ کی زبان بھی بہت عمدہ اور فصیح ہو۔ لیکن یہ بات آپ سخت سردی کے موسم میں کر رہے ہوں، تو کیا کوئی شخص آپ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہوگا۔ آپ کی باتیں بھی اچھی تھیں اور زبان بھی فصیح تھی۔ اس کے باوجود کوئی آپ کی بات سننے کو تیار نہ ہوا۔ کیونکہ آپ سخت سردی کے موسم میں گرمی کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی طرح مان لیجیے کہ آپ کسی مجمعے کے سامنے معاشیات کے موضوع پر تقریر کر رہے ہوں۔ معاشیات کے اصول وضوابط پر شان دار گفتگو کر رہے ہوں۔ لیکن جن لوگوں کے سامنے گفتگو کر رہے ہوں، وہ سیدھے سادے اور بے پڑھے لکھے دیہاتی یا کسان ہوں۔ ظاہر ہے کہ آپ کا وقیع علمی خطاب اُن کے لیے فضولیات کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ دونوں صورتوں میں آپ کا کلام بلاغت سے خالی کہلائے گا اور بلیغ نہ ہوگا۔ کلامِ بلیغ تو وہی ہوگا جس میں کلام کے ماحول اور مخاطب کے مزاج ونفسیات کا خیال رکھا جائے۔ اقتضائے حال کا لحاظ نہ کیا گیا تو کلام بلیغ نہیں ہوسکتا۔

2.7 فصاحت و بلاغت کے درمیان فرق

فصاحت و بلاغت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اہل علم نے ہمیشہ بلاغت کو زیادہ اہمیت دی، اسی لیے اس علم کو ''علم بلاغت'' کہا گیا اور اس کے ذیل میں فصاحت کا تذکرہ کیا گیا۔ لیکن اس سے فصاحت کی مستقل حیثیت ختم نہیں ہوتی۔ یہ دو مختلف چیزیں ہیں اور اسی

حیثیت سے انھیں پڑھایا اور اختیار کیا جاتا ہے۔

فصاحت و بلاغت کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ فصاحت میں اصل زور کلام کو سنوارنے پر دیا جاتا ہے، جب کہ بلاغت میں اصل اہمیت کلام کو دوسروں تک پہنچانے پر ہوتی ہے۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ فرق بس ظاہری سا محسوس ہوتا ہے، کیونکہ کلام میں فصاحت اس لیے نہیں پیدا کی جاتی کہ اُسے سامنے رکھ کر لطف اندوز ہوا جائے۔ کلام کو فصیح اسی لیے بنایا جاتا ہے کہ مخاطب اُس سے متاثر ہو سکے۔ اسی طرح آپ بلاغت کی تعریف میں پڑھ چکے ہیں کہ کوئی کلام اس وقت تک بلیغ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ فصیح نہ ہو۔ لہٰذا فصاحت و بلاغت دونوں کے درمیان گہرا ربط موجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر بلیغ کلام کا فصیح ہونا تو ضروری ہے، لیکن ہر فصیح کلام کا بلیغ ہونا ضروری نہیں۔ فصاحت و بلاغت کی تعریفات دیکھنے سے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ بات اہل علم کے نزدیک کافی حد تک مسلم بھی ہو چکی ہے۔ البتہ بعض اہل علم اس نظریے سے اختلاف کرتے ہیں۔ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے لکھا ہے:

ممکن ہے کہ اس صورت حال کو انگیز کرنے کے لیے علما نے یہ اصول وضع کیا کہ فصاحت بلاغت کی شرط نہیں، لیکن اگر فصاحت کے لیے بلاغت کی شرط نہیں ہے تو بلاغت کے لیے فصاحت کی شرط بھی ضرور نہ ہونا چاہئے، یہ ضرور ہے کہ جس کلام میں بلاغت کی کیفیت واضح ہوتی ہے اس میں فصاحت کا بھی ایک نمایاں عنصر ہوتا ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ اعلیٰ ترین شعرا کا بھی تمام کلام فصاحت کے تمام معیاروں پر ہمیشہ پورا نہ اترے۔

2.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھ کر ہم نے جانا کہ:

☆ جو کلام ترتیب کے لحاظ سے بالکل درست ہو، تعقید لفظی و معنوی اور تنافرِ کلمات سے محفوظ ہو، ایسا کلام کلامِ فصیح کہلاتا ہے۔ جب کہ جس کلام میں فصاحت کا اہتمام کرتے ہوئے اقتضائے حال کا بھی خیال رکھا جائے اُسے کلامِ بلیغ کہتے ہیں۔

☆ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ فصاحت و بلاغت آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اہل علم کے ہاں یہ بات تقریباً مسلم ہو چکی ہے کہ ہر بلیغ کلام فصیح ہوگا، لیکن ہر فصیح کلام کا بلیغ ہونا ضروری نہیں۔ بعض اہل علم اس نظریے سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔

2.9 فرہنگ

الفاظ	معانی
وقیع	بلند، معتبر
معاشیات	روزی روٹی اور مال و دولت کمانے کا علم

2.10 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ پندرہ سطروں میں جواب لکھیے:

1- تعقید لفظی اور تعقید معنوی کی تشریح مع مثال لکھیے۔

-2 فصاحت وبلاغت کے باہمی ربط پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔

-3 کلامِ فصیح کی شرطیں مع تشریح لکھیے۔

ب۔ تیس سطروں میں جواب لکھیے:

-1 فصاحت کی لغوی تعریف کیا ہے؟

-2 بلاغت کی شرطیں کتنی ہیں؟ اور کون کون؟

-3 قیاسِ صرفی کا کیا مطلب ہے؟

2.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

-1 البلاغة الواضحة — علي الجارم/مصطفى أمين

-2 البلاغة العربية — عبدالرحمن حسن حبنكة الميداني

-3 دروس البلاغة — حفني ناصف والآخرون

-4 آئینۂ بلاغت — محمد حسن عسکری

-5 درس بلاغت — شمس الرحمن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

اکائی 3 اسلوب اور اس کی قسمیں

اکائی کے اجزا

3.1 تمہید
3.2 مقصد
3.3 اسلوب کی تعریف
3.4 اسلوب علمی
3.5 اسلوب ادبی
3.6 اسلوب خطابی
3.7 اکتسابی نتائج
3.8 فرہنگ
3.9 امتحانی سوالات کے نمونے
3.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

3.1 تمہید

اسلوب علم بلاغت کا ایک اہم جز ہے۔اس کے ذریعے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمیں اپنے کلام کو مخاطب کے دل میں جاگزیں کرنے کے لیے کب کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کلام اپنے مفہوم اور معانی کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔لیکن متکلم اُس کلام کے لحاظ سے مناسب اسلوب اختیار نہیں کر پاتا، جس کی وجہ سے وہ کلام سامعین پر مؤثر ہوتا۔اس لیے اسلوب کی حقیقت اور اس کی اقسام کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔اس سے ہمیں صرف علمی بنیادوں پر ہی اسلوب کی معلومات نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ عملی طور پر بھی خوب سے خوب تر اسلوب کو برتنے کا سلیقہ آتا ہے۔

3.2 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ ہم علم بلاغت کے ایک اہم عنصر ''اسلوب'' کی حقیقت کو سمجھیں۔ہمیں پتا چلے کہ اسلوب کسے کہتے ہیں؟ کلام میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ اسلوب کتنے قسم کا ہوتا ہے؟ ان اقسام کی کیا کیا خاصیتیں ہیں؟ اس اکائی کے ذریعے جب ہمیں یہ سب باتیں معلوم ہوجائیں گی تو ہمیں علم بلاغت کے اس اہم جز سے آگاہی حاصل ہوجائے گی۔ہم کسی بھی زبان میں بولتے یا لکھتے وقت اپنے اسلوب کو زیادہ مؤثر بنا سکیں گے۔

3.3 اسلوب کی تعریف

اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کا لغوی معنی ہے راستہ۔اس کی جمع ہے اسالیب۔ **المعجم الرائد** میں اسلوب کی تعریف یہ ہے:

نهج خاص في الكتابة والتعبير عن الأفكار۔

لکھنے اور اپنے نظریات کو بیان کرنے کا مخصوص انداز۔

سوئفٹ (Swift) نے مختصر الفاظ میں اسلوب کی تعریف اس طرح کی ہے:

Proper words in proper places.

مناسب الفاظ، مناسب جگہوں پر۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اسلوب کی حقیقت پر اچھی گفتگو کی ہے۔اُن کے ایک طویل مقالے کے مندرجہ ذیل اقتباسات ہمیں اسلوب کا مفہوم سمجھنے میں مدد دیتے ہیں:

''اسلوب یا طرز نگارش کا مسئلہ ایسا نہیں، جس پر کوئی فیصلہ کن اور دوٹوک بات کہی جا سکے۔آسان لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ افکار وخیالات کے اظہار وابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے، جو دل نشیں بھی ہو اور منفرد بھی ہو۔اسی کو انگریزی میں Style کہتے ہیں۔اردو میں اس کے لیے ''طرز'' یا ''اسلوب'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔عربی اور جدید فارسی میں اسی کو ''سبک'' بھی کہتے ہیں۔ان الفاظ کی اصل پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلوب میں ترصیع یا صناعی Ornamentation کا مفہوم شامل رہا ہے۔سب سے پہلے انگریزی لفظ Style کو لیجیے۔یہ ایک یونانی لفظ Stilus سے نکلا ہے، جو ہاتھی دانت، لکڑی یا کسی دھات سے بنا ہوا ایک نوکیلا اوزار ہوتا تھا، جس سے موم کی تختیوں پر حروف والفاظ یا نقوش کندہ کیے

جاتے تھے۔ کچھ لوگ اس کی اصل Stylus بتاتے ہیں، مگر یہ غلط ہے۔‘‘

’’جدید فارسی اور عربی زبان میں اسٹائل کے لیے سَبَک استعمال ہوتا ہے۔ اصل مصدری معنی میں یہ عربی لفظ ہے۔ سبک یسبک (ضَرَبَ یَضرِبُ) کے لغوی معنی ہیں دھات کو پگھلانا اور سانچے میں ڈھالنا۔ چنانچہ ایسا سونا، جسے کٹھالی میں ڈھال کر میل صاف کرلیا جاتا ہے، سبیک یا مسبوک کہلاتا ہے اور دھات کی چیزیں ڈھالنے والی Faundry کو مسبکة کہتے ہیں۔ اس لفظ کے لغوی معنوں کی خصوصیات پر غور کیجیے تو دھات کو تپانا، اسے حشو وزوائد سے پاک کرنا، نکھارنا، پھر ایک سانچے میں ڈھالنا اور کوئی خوش نما شکل دے دینا، ایسا عمل ہے، جو اچھے اسٹائل میں اسی طرح لفظوں کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔ اس میں اسلوب کی نفاست و لطافت اور پختگی و پائے داری کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ عربی میں اس کا مفہوم حشو وزوائد سے پاک کرنا بھی ہے۔ دوسرا لفظ طَرَزَ ہے۔ طَرِزَ یَطْرَزُ (سمع یسمع) لباس فاخرانہ استعمال کرنے کو کہتے ہیں۔

طرز اور تطرز کپڑے پر بیل بوٹے بنانا، زردوز کرنا۔ الطرازة زردوزی کے لیے اور المطراز بیل بوٹے بنانے والے یا زردوز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسے طور، طریقہ، ہیئت یا ترتیب کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً عربی میں کہیں گے ھذا علی طرازک، یعنی یہ تمھارے طریقے پر ہے۔ طراز جدید عربی میں فیشن کے معنی بھی دیتا ہے۔‘‘

اب ’’أسلوب‘‘ کا لفظ دیکھیے۔ طریقہ، راستہ، روش اور ڈھنگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ أسالیب اس کی جمع ہے۔ یہ فی الاصل کسی متعین و متیقن روش کے لیے ہے۔ اسی لیے جب عربی میں کہتے ہیں ’’أنفه في أسلوب‘‘ یعنی اس کی ناک ایک ہی ڈھنگ سے رہتی ہے یا وہ زیادہ مغرور ہے، تو اس میں انفرادیت کا تصور بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ ادب میں کسی مخصوص اندازِ نگارش کے واسطے بولا جاتا ہے، جس میں لکھنے والے کی شخصیت کے منفرد خط و خال نظر آئیں۔ مغربی اصولِ نقد و نظر کی اشاعت کے بعد ہندی میں سبک یا طرز کے لیے ’’شیلی‘‘ بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہندی میں (اپنے موجودہ مفہوم کے لیے) زیادہ پرانا نہیں۔ اگرچہ اس کی اصل لفظ شیل ہے، جو اصول، برتاؤ، ڈھب اور ڈھنگ کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ جیسے پنچ شیل میں ہے۔ شیلی کا مفہوم من وعن وہی ہے جو عربی میں اسلوب کا ہے۔ ان الفاظ کی تشریح و تعریف میں اتنی لمبی تمہید سے مدعی یہ تھا کہ اسٹائل کے لیے ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ میں جو لفظ استعمال ہوتے ہیں، وہ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی اسلوب بغیر تصنع، کاوش یا آورد کے بغیر نہیں بنتا۔ اردو میں اس کے لیے ایک لفظ ’’انداز‘‘ بھی ہے۔ میر تقی میر اردو کا پہلا شاعر ہے، جس نے یہ لفظ ان مخصوص معنوں میں استعمال کیا تھا۔‘‘

ان اقتباسات سے یہ بات بہت واضح ہوجاتی ہے کہ کلام کا ایک مخصوص انداز اسلوب کہلاتا ہے۔ انسان کے لکھنے بولنے کا انداز، طرز اور اسٹائل کو علم بلاغت کی اصطلاح میں اسلوب کہتے ہیں۔

یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ انسان کی گفتگو کا انداز ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ غصے کے وقت وہ بہت بلند آواز سے بات کرتا ہے تو ہنسی مذاق کے وقت بہت تفریحی انداز میں۔ کسی حادثے یا مصیبت کے وقت وہ پست یا بھرائی ہوئی آواز میں بات چیت کرتا ہے تو لڑائی جھگڑے کے وقت بہت جذباتی اور زوردار انداز میں۔ غرض یہ کہ اندازِ تکلم ہمیشہ تبدیل ہوتا ہے۔ موضوعِ گفتگو اور محلِ گفتگو کے لحاظ سے اندازِ گفتگو بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے علم بلاغت کے ماہرین نے اسلوب کو مختلف قسموں میں بانٹا ہے۔ ویسے اسلوب کی مختلف

تقسیمیں کی گئی ہیں، اس میں کچھ اختلاف بھی ہے، لیکن عام طور پر علمائے بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں کی ہیں۔ آ یئے! ان تینوں قسموں پر گفتگو کرتے ہیں۔

3.4 اسلوبِ علمی

اسلوب علمی کو اسلوب کی قسموں میں سب سے سنجیدہ قسم کہا جا تا ہے۔ کیونکہ یہ اسلوب سب سے زیادہ پر سکون، سب سے زیادہ سنجیدہ، سب سے زیادہ سلجھا ہوا اور سب سے واضح ہوتا ہے۔ اس میں نہ تو غیر ضروری لفاظی کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ جوش و جذبہ بھڑکانے والے الفاظ کی۔ یہ اسلوب کسی پُرسکون سمندر کی طرح ہوتا ہے۔ بہ ظاہر یہ بہت تھما ہوا اور ٹھہرا ہوا ہوتا ہے، لیکن اندرونی طور پر اس میں بے پناہ گہرائی اور معلومات پوشیدہ ہوتی ہیں۔

اس اسلوب میں سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ متکلم لفاظی سے بچتے ہوئے دو دو چار کی طرح اپنی بات بیان کرتا جائے۔ جوش کے بجائے اطمینان اور ظاہری حسن کے بجائے حقائق کو بیان کرنے پر توجہ دے۔ اس اسلوب کو اختیار کرنے میں شاعرانہ انداز، افسانوی اصطلاحات اور رومانوی تعبیرات سے کوسوں دور رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیدھے سادے انداز میں موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے حقائق بیان کیے جاتے ہیں اور قاری یا سامع کو فکری خزانے سے مالا مال کیا جا تا ہے۔ مخاطب کو زیادہ سے زیادہ علمی حقائق دینے کی فکر کی جاتی ہے۔ اُس کی عقل کو اپیل کرنے پر توجہ دی جاتی ہے۔ متعلقہ موضوع پر وافر معلومات فراہم کر کے اُس کے ذہن ودماغ میں موجود علمی و فکری سوالات کو ابھارنے اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لیے ہر زمانے میں علما و مفکرین، دانشوران و محققین، فلاسفہ و متکلمین یہی اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اسلوب اپنی ماہیت کے لحاظ سے بہت سادہ اور معنویت کے لحاظ سے بہت گہرا ہوتا ہے۔

مختصر طور پر اسلوب علمی کی خصوصیات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

1- یہ اسلوب علمی حقائق بیان کرنے کے لیے سب سے بہتر ہوتا ہے۔
2- اس اسلوب میں الفاظ و تعبیرات بہت سادہ اور عام فہم استعمال کیے جاتے ہیں۔
3- یہ اسلوب شاعرانہ یا خطیبانہ انداز سے دور ہوتا ہے۔
4- اس اسلوب میں مبالغے، مزاح اور غیر سنجیدہ باتوں کے لیے جگہ نہیں ہوتی۔
5- یہ اسلوب علمی دلائل اور منطقی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔

عربی زبان میں جاحظ، عبدالقاہر جرجانی، ابن رشیق، فخر الدین رازی، ولی اللہ دہلوی، عبدالحی الحسنی، عباس محمود عقاد، محمد عبدہ اور احمد امین اسلوب علمی کے اہم حاملین میں شامل ہیں۔ جب کہ اردو زبان میں سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور محمد حمید اللہ جیسے مشاہیر اسی اسلوب کے حامل رہے ہیں۔

اسلوب علمی کے نمونے کے طور پر علامہ عبدالحی حسنی کی یہ عبارت دیکھیے:

اعلم أن الإسلام ورد الهند من جهة خراسان وماوراء النهر، فانعكست أشعة العلم على الهند من قِبَل تلک البلاد، وكانت صناعة أهلهما من قديم الزمان فنون الفلسفة وحكمة اليونان، وكان قصارى نظرهم في علم النحو والفقه والأصول والكلام على طريق التقليد، فلما بلغ الإسلام إلى الهند وصارت بلدة ملتان مدينة العلم نهض من تلک البلدة جمع كثير من العلماء، ثم صارت لاهور قاعدة الملک في الأيام الغزنوية ومركزا للعلوم والفنون، ثم افتتح الملوک الغورية مدينة دهلي وجعلوها عاصمة للبلاد المفتوحة من الهند صارت مرجعا ومآباً للعلماء، حتى وفد إليها أرباب الفضل والكمال من كل ناحية وبلدة، فدرسوا وأفادوا عهداً بعد عهد، ولم تزل كذلک إلى آخر عهد الملوک التيمورية۔

3.5 اسلوبِ ادبی

ظاہری دل کشی کے لحاظ سے اسلوبِ ادبی کو تمام اسالیب میں فوقیت حاصل ہے۔ یہ اسلوب ظاہری حسن اور اوپری چمک دمک کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس اسلوب میں پوری توجہ اس بات پر صرف کی جاتی ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کو زبان کی چاشنی حاصل ہو، اُس کے کلام کے حسن سے محظوظ ہوں۔ اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سیدھی سادی بات کو خوب بڑھا چڑھا کر اور بنا سنوار کر پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر متکلم کو یہ بتانا ہے کہ میں ایک سردرات میں گھر سے نکلا، تو وہ یہ سیدھی سادی بات بہت بنا سنوار کر پیش کرے گا۔ وہ کہے گا:

’’کل شام ہی سے فضا میں خنکی تھی۔ سورج نے جیسے ہی اپنا منہ چھپایا، فوراً وہ خنکی سرد ہواؤں میں تبدیل ہوگئی۔ سرد ہوائیں ایسی کہ جسم کے پار ہوئی جارہی تھیں۔ دانت کٹکٹا رہے تھے۔ جسم میں خون جما جارہا تھا۔ ایسی سرد رات میں میں نے گھر کا دروازہ کھولا اور اپنے سینے میں عزمِ جواں کی آتشِ جوالا لے کر گھر سے نکلا۔‘‘

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس اقتباس میں صرف ایک بات کہی گئی ہے کہ میں سرد رات میں کسی کام سے نکلا۔ لیکن بات کو ایسا گھما پھرا کر پیش کیا گیا ہے کہ بات بہت لمبی ہوگئی۔ البتہ پڑھنے یا سننے والے کو دل چسپی اور دل کشی محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ کاش سنانے والا اپنی پوری داستان سنا کر ہی دم لے۔

کلام میں ظاہری حسن پیدا کرنے کے لیے اسلوب ادبی میں تشبیہات، کنایات، استعارات، خیالات اور تکلفات سے بہت زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر کلام میں ظاہری حسن نہیں پیدا ہوتا۔ ایسا نہیں ہے کہ اس اسلوب میں علمیت وحقیقت کو پوری طرح بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے، لیکن اصل توجہ ظاہری حسن پر دی جاتی ہے۔ دوسری چیزوں کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ اسلوب ادبی کے اہم اوصاف کو نکات کی شکل میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

1- اس اسلوب میں الفاظ کے انتخاب پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔
2- تشبیہ، استعارے، کنایے اور مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔
3- قاری یا سامع کے دل کے تار چھیڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
4- علمی حقائق اور سنجیدہ افکار کے بجائے کلام کے ظاہری حسن پر اصل توجہ صرف کی جاتی ہے۔

5- عام طور پر لوگوں کو یہی اسلوب پسند آتا ہے۔ اکثر ناولوں، افسانوں اور کہانیوں میں یہی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔

تمام زبانوں کے اکثر ادبا، شعرا، ناول نگار، کہانی کار اور افسانہ نگار اس اسلوب کے حامل ہوتے ہیں۔ عربی میں ہمدانی، حریری، ابن مقفع، منفلوطی، علی طنطاوی اور نجیب محفوظ کی اکثر تخلیقات اس اسلوب کی حامل ہیں، جب کہ اردو زبان میں راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، رجب علی بیگ سرور اور عبدالماجد دریابادی اس اسلوب کے اہم نمائندے کہے جاسکتے ہیں۔

اسلوب ادبی کے نمونے کے طور پر مقامات حریری کی یہ عبارت دیکھیے:

حدّث الحارث بن همّام قال: لمّا اقْتَعَدْتُ غَارِبَ الاِغْتِرَابِ، وَأَنْأَتْنِي الْمَتْرَبَةُ عَنِ الْأَتْرَابِ، طَوَّحَتْ بي طَوَائِحُ الزَّمَنِ، إِلَى صَنْعاءِ الْيَمَنِ، فدَخَلْتُهَا خاوِيَ الْوِفَاضِ، بادِيَ الإنْفَاضِ، لاأَمْلِكُ بُلْغَةً، ولاأَجِدُ في جِرابِي مُضْغَةً۔ فَطَفِقْتُ أَجُوبُ طُرُقَاتِهَا مِثْلَ الهائم، وَأَجُولُ فِي حَوْمَاتِهَا جَوْلَانَ الْحَائِمِ، وَأَرُودُ فِي مَسَارِحِ لَمَحَاتِي، وَمَسَايِحِ غَدَوَاتِي وَرَوحَاتِي، كَرِيمًا أُخْلِقُ لَهُ دِيبَاجَتِي، وَأَبُوحُ إِلَيْهِ بِحَاجَتِي، أَوْأَدِيبًا تُفَرِّجُ رُؤْيَتُه غُمّتِي، وَتُرْوِي رِوَايتُه غُلّتي؛ حَتّى أَدّتْنِي خَاتِمَةُ المَطَافِ وهَدَتْنِي فَاتِحَةُ الْأَلطَافِ، إلى نادٍ رَحِيبٍ مُحتوٍ عَلَى زِحَامٍ وَنَحِيبٍ، فَوَلجتُ غَابَةَ الْجمعِ، لأَسْبُرَ مَجْلبَةَ الدَّمْعِ، فَرأَيتُ فِي بُهْرَةِ الْحَلْقَةِ، شَخْصًا شَخْتَ الْخِلْقَةِ، عَلَيْهِ أُهْبَةُ السِّيَاحَةِ، وَلَهُ رَنَّةُ النِّيَاحَةِ، وهُوَ يَطْبَعُ الأَسْجَاعَ بِجَوَاهِرِ لَفْظِهِ، وَيَقْرَعُ الأَسْمَاعَ بِزَوَاجِرِ وَعْظِهِ، وَقَدْ أَحَاطَتْ بِهِ أَخْلَاطُ الزُّمَرِ، إِحَاطَةَ الهَالَةِ بالْقَمَرِ، والأَكْمَامِ بالثَّمَرِ، فَدَلَفْتُ إِلَيْهِ لِأَقْتَبِسَ مِنْ فَوَائِدِهِ، وَأَلْتَقِطَ بَعْضَ فَرَائِدِهِ، فسَمِعْتُه يَقُولُ حِينَ خَبَّ فِي مَجَالِهِ، وَهَدَرَتْ شَقَاشِقُ ارْتجالِهِ۔

حارث بن ہمام نے بیان کیا جس وقت میں سفر کے کاندھے پر سوار ہوا اور فقر نے مجھے ہم عمروں سے دور کر دیا تو زمانے کے حوادث نے مجھے صنعاء یمن کی طرف پھینک دیا پس میں اس میں اس حال میں داخل ہوا کہ میرا توشہ دان خالی تھا اور میرا فقر ظاہر تھا، میں تھوڑے سے توشے کا بھی مالک نہ تھا اور اپنے توشہ دان میں ایک لقمہ بھی نہیں پاتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے راستوں میں حیران آدمی کی طرح چکر لگانا شروع کیا اور گھومتا رہا اس کے اطراف (اور گلی کوچوں) میں پیاسے کی طرح، میں تلاش کر رہا تھا اپنی نگاہوں سے چراگاہوں اور اپنی صبح و شام کی سیاحت کی جگہوں میں ایک ایسے سخی کو جس کے سامنے میں اپنے چہرے کو پرانا کر سکوں (یعنی اس کے سامنے دست سوال دراز کرسکوں) اور اپنی حاجت اس کے سامنے ظاہر کرسکوں یا ایک ایسے ادیب کو (تلاش کر رہا تھا) جس کا دیدار میرے غم کو دور کر دے اور اس کی روایت (اور گفتگو) میری پیاس کو ختم کر کے مجھے سیراب کر دے۔ یہاں تک کہ طواف (اور گردش) کے اختتام نے مجھے پہنچا دیا اور مہربانیوں کے افتتاح نے میری رہ نمائی کی ایک ایسی وسیع مجلس کی طرف جو مشتمل تھی ہجوم اور رونے کی آواز پر، چنانچہ میں مجمع کے جنگل میں داخل ہوا تا کہ جان سکوں آنسو کو کھینچنے (اور بہنے) کے سبب کو۔ پس میں نے دیکھا حلقے کے درمیان ایک ایسے ضعیف الخلقت شخص کو جس پر سامان سیاحت (لدا ہوا) تھا اور اس کے لیے نوحہ کی سی آواز تھی، وہ ڈھال رہا تھا، مسجع ومقفی عبارتوں کو اپنے لفظ کے جواہر کے ساتھ اور کھٹکھٹا رہا تھا کانوں کو اپنے وعظ کی جھڑکیوں سے، اس حال میں کہ اس کو مختلف جماعتوں کے لوگوں نے ایسا گھیرا تھا جیسا ہالہ چاند کو یا غلاف (اور چھلکا) پھل کو گھیرتا ہے، تو میں اس کی طرف آہستہ آہستہ قریب ہوا تا کہ اس سے کچھ فوائد حاصل کرسکوں اور اس کے چند یکتا موتی چن سکوں، چنانچہ میں نے اس کو کہتے ہوئے سنا جس وقت وہ اپنی جولانگاہ میں دوڑ رہا تھا اور (جس وقت) اس کے فی البدیہہ کلام کے جھاگ آواز نکال رہے تھے (یعنی اس کی آواز بلند ہوگئی تھی)۔

3.6 اسلوب خطابی

اسلوب خطابی کو اسالیب کے درمیان یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ اسلوب سب سے زیادہ گھن گرج والا اسلوب ہے۔ اس اسلوب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کے دل میں جذبات پیدا کیے جائیں اور پھر انھیں خوب بھڑکایا جائے۔ اُسے عزم وہمت اور جرأت ومردانگی پر آمادہ کیا جائے۔ اس کے سامنے پرزور انداز میں اپنی بات رکھی جائے اور اپنا مقصد واضح کیا جائے۔ اس لحاظ سے یہ اسلوب قاری یا سامع کے دل پر سب سے تیز اثر کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی اثر انگیزی عام طور پر محدود وقت کے لیے ہوتی ہے۔

یہ اسلوب اختیار کرنے کے لیے متکلم کو پُرزور الفاظ، بلند آواز اور پرشکوہ لہجہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایک بات کو مختلف انداز سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ مترادفات اور ہم معنی الفاظ کا استعمال کرنا ہوتا ہے۔ کبھی سوال کرنا ہوتا ہے تو کبھی سوال کرکے خود ہی اس کا جواب دینا ہوتا ہے۔ کبھی کسی بات کا تذکرہ کرکے اس پر حیرت کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو کبھی کسی چیز کا علی الاعلان انکار کرنا پڑتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر وہ چیز اختیار کرنی پڑتی ہے، جس سے قاری یا سامع کے دل میں جذبات کا سیلاب امڈ پڑے اور وہ متکلم کی بات ماننے پر فوراً آمادہ ہو جائے۔

نکات کی شکل میں اس اسلوب کے امتیازات یہ ہو سکتے ہیں:

1- زور وشور اور گھن گرج کے لحاظ سے یہ سب سے پرکشش اسلوب ہے۔

2- ایک بات کو دہرانا، مترادفات کا استعمال اور استعجاب واستفہام کا انداز اختیار کرنا اس اسلوب کی اہم صفت ہے۔

3- اس اسلوب میں زیادہ سے زیادہ زوردار الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

عربی زبان میں حضرت علی بن ابی طالبؓ، حجاج بن یوسف، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، مفتی امین الحسینی، سید قطب اور ابوالحسن علی الندوی جیسے مشاہیر کے خطبات اور تحریریں اسلوب خطابی کا بہترین نمونہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ جب کہ اردو زبان میں ابوالکلام آزاد اور شورش کاشمیری کی تقریریں وتحریریں اس اسلوب کے نمونے کے طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

اسلوب خطابی کی مثال کے طور پر حضرت علیؓ کے ایک خطبے کے یہ جملے غور سے پڑھیے۔ یہ خطبہ انھوں نے اس وقت ارشاد فرمایا تھا، جب سفیان بن عوف اسدی نے انبار پر حملہ کرکے وہاں کے عامل کو قتل کر دیا تھا:

"هذا أخو غامد قد بلغتْ خيلُه الأنبارَ، و قتل حَسَانَ البَكريّ، وأزالَ خيلَكم عن مَسالحها، وقتَلَ مِنكم رجالا صالحين، وقد بلغَنِي أن الرجلَ منهم كان يدخلُ على المرأةِ المسلمةِ والأخرى المعاهدةِ، فينزِعُ حِجلَها و قُلبَها ورِعاثَها، ثم انصرفوا وافِرين، ما نال رجلا منهم كَلْمٌ، ولا أُرِيق لهم دمٌ، فلو أنّ رجلًا مسلمًا ماتَ مِنْ بَعْدِ هذا أسفا، ما كان به ملوما، بل كان عندي جديرا۔ فواعجبا من جِدِّ هؤلاء في باطِلِهم وفَشَلِكم عن حقكم، فقُبحًا لكم حين صِرتم غَرَضا يُرمَى، يُغار عليكم ولا تُغيرون، وتُغزَون ولا تَغزُون، ويُعصَى الله وتَرضَون۔"

ذرا دیکھو! بنو غامدی کا ایک شخص اپنے گھوڑوں کو لے کر انبار تک پہنچ گیا، حسان بکری کو قتل کر ڈالا، تمھاری سرحدوں سے سواروں کو کھدیڑ دیا اور تمھارے بے شمار نیک افراد کو شہید کر ڈالا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے کوئی فوجی مسلمان عورتوں تک جا پہنچا اور کوئی ہماری حلیف اقوام

کی عورتوں تک۔ ان لوگوں نے عورتوں کی پازیب، کنگن اور کانوں کی بالیاں بھی نوچ ڈالیں اور لدے پھندے واپس ہو گئے۔ نہ انھیں کوئی زخم لگا اور نہ ان کا خون بہا۔ اس حادثے کی وجہ سے اگر کوئی مسلمان غم کے مارے مرجائے تو میرے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ مجھے سخت تعجب ہے کہ وہ لوگ باطل پر ہونے کے باوجود کیسے باہمت ہیں اور تم حق پر ہونے کے باوجود کیسے پست ہمت ہو۔ ڈوب مرو کہ تمھیں تیروں کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ تمھارے اوپر حملہ کیا جارہا ہے، لیکن تم حملہ کرنے سے عاجز ہو، تم سے جنگ کی جارہی ہے، لیکن تم جنگ سے مجبور ہو اور سرِ عام اللہ کی نافرمانی کی جارہی ہے اور تم اس پر راضی ہو۔

3.7 اکتسابی نتائج

کسی بات کو مخصوص انداز میں ادا کرنا اسلوب کہلاتا ہے۔ اسلوب کی مختلف تعریفات پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس کے مفہوم میں حسن وزیبائش شامل ہے۔ علمائے بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں کی ہیں۔

1- اسلوب علمی ایک سنجیدہ اور عالمانہ اسلوب ہوتا ہے، جس میں اصل زور علمی حقائق اور فکری نظریات کو پہنچانے پر ہوتا ہے۔

2- اسلوب ادبی میں اصل توجہ کلام کے ظاہری حسن اور بناؤ سنگار پر دی جاتی ہے، تاکہ قاری یا سامع اس سے لطف اندوز ہو سکے اور بات اس کے دل میں اتر سکے۔

3- اسلوب خطابی کو انسان کے خوابیدہ جذبات بھڑکانے اور اس کے اندر عزم و حوصلہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ نقشہ دیکھیے:

اسالیب اور ان کے نمائندے

اسلوب

اسلوب علمی	اسلوب ادبی	اسلوب خطابی
نمائندے	نمائندے	نمائندے
جاحظ، جرجانی، ابن رشیق، رازی، ولی اللہ دہلوی، عبدالحی حسنی، عقاد، محمد عبدہ، احمد امین، سرسید، شبلی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر حمید اللہ کی اکثر تحریریں۔	ہمدانی، حریری، ابن مقفع، منفلوطی، طنطاوي، نجیب محفوظ، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، رجب علی بیگ سرور اور عبدالماجد دریابادی کی اکثر تحریریں۔	حضرت علیؓ، حجاج بن یوسف، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، مفتی امین الحسینی، سید قطب، ابوالحسن علی ندوی، ابوالکلام آزاد اور شورش کاشمیری کی تقریریں و تحریریں۔

3.8 فرہنگ

الفاظ	معانی

نگارش	تحریر
پیرایہ	طرز، روش، انداز
ترصیع	تزئین، ترتیب دینا
صناعی	کاریگری، دستکاری، کمال ہنر
کٹھالی	چاندی سونے وغیرہ گلانے کا مٹی کا بنا ہوا پیالہ نما ظرف
ہیئت	حالت، کیفیت
متیقن	یقینی بات
خط x چدبن وخال	خصوصیات، نقوش
لفاظی	فضول گوئی، باتیں بنانا
رومانوی	عشقیہ یا خیالی
متکلمین	علم کلام کے ماہرین
ماہیت	اصل کیفیت
معنویت	معنی کے اعتبار سے اہمیت، خوبی
منطقی	استدلال سے قریب
آتش جوالا	آگ کی گیند، چکر کھانے والا شعلہ
تحلیقات	خالص علمی کاوشیں
گھن گرج	شور، بادلوں کے ٹکرانے کی آواز
پرشکوہ	عظیم الشان، شان وشوکت والا

3.9 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ پندرہ سطروں میں جواب دیجیے:

1- اسلوب سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

2- عربی زبان میں اسلوب کے کیا معنیٰ ہیں؟

3- اسلوب ادبی کی حقیقت واوصاف پر مشتمل ایک جامع نوٹ لکھیے۔

ب۔ تیس سطروں میں جواب لکھیے:

1- اسلوب علمی کے امتیازات وخصوصیات کیا ہیں؟

-2 اسلوب خطابی کا ایک نمونہ پیش کر کے اس کا جائزہ لیجیے کہ وہ کس طرح اسلوب خطابی کا نمونہ ہے؟

-3 اسلوب خطابی کے تین نمائندوں پر روشنی ڈالیے۔

3.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

-1 الأدب العربي بين عرض ونقد — محمد الرابع الحسني الندوي

-2 البلاغة الواضحة — علي الجارم/مصطفى أمين

اکائی 4 عظیم علمائے بلاغت

اکائی کے اجزا

4.1 تمہید

4.2 مقصد

4.3 جاحظ

4.4 ابن المعتز

4.5 قدامہ بن جعفر

4.6 ابن طباطبا اصبہانی

4.7 رمّانی

4.8 ابو ہلال عسکری

4.9 باقلانی

4.10 ابن رشیق

4.11 خفاجی

4.12 جرجانی

4.13 زمخشری

4.14 اکتسابی نتائج

4.15 امتحانی سوالات کے نمونے

4.16 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

4.1 تمہید

انسان نے جب سے بولنا سیکھا ہے، اُسی وقت سے اُس کے دل میں یہ جذبہ موجود رہا کہ وہ اپنی بات کو بہتر سے بہتر انداز میں دوسروں کے سامنے پیش کرے۔ لوگ اس کی بات کو غور سے سنیں اور اس پر توجہ دیں۔

جاہلی دور میں عربوں میں کلام کو بنانے سنوارنے کا شعور اپنے عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ کلام کو جانچنے پرکھنے اور اُسے بہتر سے بہتر بنانے کے سلسلے میں بہت حساس تھے۔ ہر سال سوقِ عکاظ میں جہاں دوسرے بہت سے کام ہوتے تھے، وہیں ایک دوسرے کے کلام پر تنقید و تنقیح کا عمل بھی بہت اہتمام کے ساتھ جاری رہتا تھا۔

چھٹی صدی عیسوی میں اسلام کی آمد کے بعد بھی کلام کے حسن پر بہت زور دیا گیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے زبان و بیان کی اصلاح اور اس پر عبور حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ خود بھی اعلیٰ ترین کلام دنیا کے سامنے پیش فرمایا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ خلفائے راشدین کے دور میں بھی زبان و بیان کے ارتقا اور سرپرستی کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔

خلافتِ اموی میں اسلامی حدود مزید وسیع ہوئیں تو بڑے بڑے اہل علم اور اہل زبان سامنے آئے۔ بعض خلفا بھی شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اہلِ ادب کی سرپرستی کرتے تھے۔ لیکن ایک تو اس دورِ حکومت کا بڑا حصہ انتشار میں گزرا اور دوسرے یہ دورِ حکومت ایک صدی تک بھی نہ چل سکا، اس لیے اس دورِ حکومت میں علمِ بلاغت اور دوسرے علوم کی کوئی عظیم الشان ترویج و اشاعت نظر نہیں آئی۔

اموی خلافت کے خاتمے کے بعد عباسی خلافت کا آغاز ہوا۔ یہ دورِ حکومت کئی صدیوں پر محیط رہا۔ اس میں ہر لحاظ سے عالمِ اسلام کو بڑی ترقیاں حاصل ہوئیں۔ اکثر علوم کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ علم بلاغت کا درخت بھی خوب برگ و بار لایا۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری سے علم بلاغت کا ارتقا شروع ہوا اور پھر یہ علم ترقیات کے اعلیٰ منازل تک پہنچا۔

اس اکائی میں مشہور اہل بلاغت کا مختصر تذکرہ پیش کیا جارہا ہے۔

4.2 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ ہم علمائے بلاغت کے ناموں اور بلاغت کے میدان میں اُن کے کارناموں سے واقف ہوں۔ ان کو جاننے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم علم بلاغت کی تاریخ سے واقف ہوسکیں گے اور ہمیں معلوم ہوگا کہ علم بلاغت نے ابتدائی دور میں کیا شکل اختیار کی اور آگے چل کر اس میں کون سے مراحل آئے۔ جب ہم ان علمائے بلاغت کے ناموں اور کارناموں سے واقف ہوں گے تو ہمارے سامنے علم بلاغت کے پورے ذخیرے کا ایک جامع خاکہ آجائے گا۔ اس سے ہمیں اس علم کو سمجھنے اور اس کے اہم نقوش سے آگاہ ہونے کا موقع ملے گا۔ نیز اس علم کے نشیب و فراز اور اس کے اساطین سے واقف ہونے کا موقع ملے گا۔

4.3 جاحظ

ابوعثمان عمر بن بحر بن محبوب الکنانی البصری، المعروف بہ جاحظ دوسری صدی ہجری کے نصف آخر 160ھ میں پیدا ہوا۔ قدرتی طور پر جاحظ کی شکل دیکھنے میں بھری معلوم ہوتی تھی، دونوں آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں، اس لیے اسے جاحظ کہا جانے لگا۔ عربی زبان میں جَحَظَ کے معنی

ہوتے ہیں: آنکھوں کا ابھرنا۔ اسی لیے اُسے جاحظ کہا جاتا تھا، یعنی ابھری ہوئی آنکھوں والا۔ وہ 225ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

جاحظ کا مزاج ابتدا ہی سے باغیانہ تھا۔ اُسے زندگی میں تنگ دستی یا کسی طرح کی مادی پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔ وہ صرف لکھتا پڑھتا اور دوستوں یاروں کی مجلسوں میں وقت گزارتا تھا۔ اس لیے اُس کا مزاج ہر ایک کا مذاق اڑانے، ہر بات کو غلط ثابت کرنے اور ہر روایت سے بغاوت کرنے کا بن گیا تھا۔ اپنے اسی مزاج سے وہ اعتزال کا شکار ہوا اور معتزلہ کا بہت بڑا وکیل بن گیا۔

اس کے باغیانہ تیور نے عربی زبان وادب کو یہ بڑا فائدہ پہنچایا کہ اُس کے ذریعے عربی کا روایتی اسلوب نگارش ختم ہوا اور عرب قلم کار نئے انداز سے لکھنے اور سوچنے کی طرف راغب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان وادب کی تاریخ میں جاحظ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جاحظ نے مختلف علوم وفنون میں بہت سی کتابیں اور رسالے تحریر کیے۔ بعض لوگوں نے اس کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد دوسو تک بتائی ہے۔ اس بات کو درست نہ مانا جائے تو بھی اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں کہ وہ بسیار نویس بھی تھا اور جدت طراز بھی۔ اُس نے بہت لکھا ہے اور جو بھی لکھا ہے، اُس میں ندرت اور جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس کی مشہور کتابوں میں **البیان والتبیین، کتاب البخلاء، کتاب الحیوان، کتاب الاعتزال، کتاب الأمثال، کتاب الإخوان، عناصر الأدب** اور **أخلاق الملوک** شامل ہیں۔

البیان والتبیین کو علم بلاغت کی پہلی کتاب کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کسی ایسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا، جس میں بلاغت کے متعلقہ امور پر گفتگو کی گئی ہو اور ان امور کے متعلق مختلف اصول وضوابط کو ذکر کیا گیا ہو۔

اس کتاب میں پہلی مرتبہ بلاغت کے موضوعات زیر بحث آئے اور ان کے اصول وضوابط کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا۔ اگرچہ یہ علم بلاغت کی کوئی مستقل مرتب یا منظم تصنیف نہیں ہے، اس کے باوجود اصولِ بلاغت کو کتابی شکل میں سب سے پہلے اسی کتاب میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح ہم اس کتاب کو علم بلاغت کی بلند وبالا عمارت کا پہلا پتھر کہہ سکتے ہیں۔

یہاں یہ بات ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض اسکالرز نے **البیان والتبیین** کے نام پر اعتراض کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ کتاب کا نام **البیان والتبیین** (دو 'یا' کے ساتھ) نہیں بلکہ **البیان والتبین** (ایک 'یا' کے ساتھ) ہے۔ یہ ایک لمبی علمی بحث ہے۔ علمی دنیا میں عام طور پر **البیان والتبیین** ہی معروف ہے۔

البیان والتبیین کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے جاحظ کے طرزِ تصنیف کے متعلق یہ بنیادی بات لکھی ہے:

"ویبدو للقارئ أن هذه الموضوعات التي تناولها في تمهید کتابه توافق طبیعة الجاحظ في البحث، فإنه یذکر الجانب المعارض أولاً، ثم یتناول الجانب الذي یدعو إلیه، ویقدم الصورة السیئة قبل الصورة الجمیلة، ولعله یعتقد أن الخروج من السوء إلی الخیر یفتح قلب الإنسان لمعرفة النعمة، فذکر نعمة البیان والإفصاح، بعد عیوب اللسان ومشکلات البیان۔" (مصادر الأدب العربي، محمد واضح رشید الحسني الندوي، ص ۴۲)

قاری کے اوپر یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اس کتاب (**البیان والتبیین**) کی تمہید میں جو موضوعات اٹھائے گئے ہیں وہ بحث وتحقیق کے سلسلے میں جاحظ کے مزاج سے کس قدر میل کھاتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ موضوع کا مخالف پہلو ذکر کرتا ہے اور اُس کے بعد اُس پہلو کا احاطہ کرتا ہے جس کا وہ خود داعی ہے۔ وہ خوب صورت پہلو سے قبل خراب پہلو کو ذکر کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اُس کا اعتقاد یہ ہو کہ بُرائی سے اچھائی کی طرف جانا انسان

کے دل کو نعمت شناسی کے لیے کھول دیتا ہے۔ اُس نے زبان و بیان کے نقائص و مسائل کو ذکر کرنے کے بعد بیان و فصاحت کی نعمت کا تذکرہ کیا ہے۔

4.4 ابن المعتز

ابوالعباس عبداللہ بن المعتز باللہ، المرتضی باللہ ترتیب کے لحاظ سے انیسواں عباسی خلیفہ تھا۔ اس کا نام عبداللہ اور ابوالعباس کنیت تھی۔ اس کا باپ المعتز باللہ تیرہواں عباسی خلیفہ تھا، جو کہ تین سال پایۂ تخت پر متمکن رہا۔ اُس کے بعد زبردستی تخت سے معزول کر دیا گیا۔ یہی معاملہ، بلکہ اس سے بھی خطرناک معاملہ اس کے بیٹے عبداللہ بن المعتز کے ساتھ پیش آیا۔ ابن المعتز کو 296ھ میں خلیفہ بنایا گیا۔ اُس نے اپنے لیے المرتضی باللہ کا لقب اختیار کیا۔ تختِ شاہی پر پوری طرح قدم رکھے بھی نہ تھے کہ اُسی دن بہت سے فتنہ پروروں نے حملہ کر کے اُسے قتل کر دیا۔ اس طرح وہ ایک دن کے خلیفہ کے طور پر معروف ہوا۔ اس کے قتل کے افسوس ناک واقعہ پر شعرا نے بڑی تعداد میں مرثیے کہے۔

سیاسی زندگی کے اس دردناک پہلو سے ہٹ کر دیکھا جائے تو ابن المعتز نے علمی دنیا میں ہمیشہ کے لیے اپنے نقوش چھوڑے۔ اُسے علم البدیع کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ وہ فطری طور پر ایک شاعر اور بڑا ادیب تھا۔ علم و ادب کا خاص ذوق رکھتا تھا۔ اُسے جس تصنیف کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے وہ ''البدیع'' ہے۔ اس کتاب میں ابن المعتز نے علم بلاغت ہی کی ایک شاخ بدیع کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس طرح وہ علم بلاغت کے اصول کو کتابی شکل میں پیش کرنے والا دوسرا اور بدیع پر مستقل تصنیف پیش کرنے والا پہلا شخص قرار پایا۔ اسی لیے اسے علم بدیع کا بانی کہا جاتا ہے۔

247ھ میں پیدا ہونے والا ابن المعتز 50 سال زندگی گزار کر 296ھ میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ سیاسی لحاظ سے اگرچہ وہ کوئی کام نہ کر سکا، لیکن علمی لحاظ سے اُس نے اپنا نام ہمیشہ کے لیے تاریخ کے صفحات میں درج کرا لیا۔ بلکہ علم بلاغت کے لحاظ سے اُس مقام پر فائز ہوا، جو مقام کسی دوسرے عباسی یا غیر عباسی خلیفہ کو حاصل نہ ہو سکا۔ البدیع کے علاوہ فصول التماثیل اور طبقات الشعراء بھی اُسی کی تصانیف ہیں۔

4.5 قدامہ بن جعفر

ابوالفرج قدامہ بن جعفر بن قدامہ بن زیاد البغدادی بغداد میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا۔ ادب، منطق اور فلسفہ پر خصوصی درک حاصل تھا۔ سترہویں عباسی خلیفہ المکتفی باللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اس کی خصوصی توجہات کا مستحق ہوا۔ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اس کی مسلمانوں کے علمی حلقوں میں خاص پذیرائی ہوئی۔ ابتدا ہی سے فلسفیانہ ذہن پایا تھا۔ اس لیے ہر چیز کو منطقی انداز میں دیکھنے کا عادی تھا۔ جس موضوع پر بھی کلام کرتا، اُس کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتا اور اس سے نتائج بر آمد کرتا تھا۔ اسی لیے مختلف وزرا اور امرا کا بھی منظورِ نظر اور مقرب رہا۔

قدامہ بن جعفر نے مختلف کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں **كتاب البلدان، كتاب الخراج، كتاب صناعة الكتابة، كتاب جواهر الألفاظ، كتاب السياسة، كتاب زهر الربيع في الأخبار** اور **نقد الشعر** کے نام ملتے ہیں۔

علم بلاغت میں قدامہ بن جعفر کی کتاب **نقد الشعر** خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب ابن المعتز کی کتاب **البدیع** کے بعد لکھی گئی سب سے ممتاز کتاب ہے۔ اس میں قدامہ بن جعفر نے ان مسائل کو آگے بڑھایا ہے جن کو ابن المعتز نے شروع کیا تھا اور بہت سے مسائل میں اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کو بجا طور پر ابن المعتز کی البدیع کا تتمہ کہا جاتا ہے۔

قدامہ بن جعفر نے علمی لحاظ سے ایک سرگرم اور کامیاب زندگی گزاری۔ **نقد الشعر** نے اُس کے نام کو ہمیشہ باقی رکھنے کا انتظام کیا۔

337ھ میں یہ عظیم ادیب اور ماہر بلاغت اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

4.6 ابن طباطبا اصبہانی

ابوالحسن محمد بن احمد بن طباطبا علوی ہاشمی قریشی اصبہانی چوتھی صدی ہجری کا عظیم مصنف، ادیب اور ماہر بلاغت تھا۔ زمانی ترتیب کے لحاظ سے اس کا نام قدامہ بن جعفر سے پہلے ہونا چاہیے، لیکن چونکہ قدامہ بن جعفر اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے ابن المعتز کا تتمہ سمجھا جاتا ہے، اس لیے اُس کا تذکرہ ابن المعتز کے فوراً بعد اور ابن طباطبا سے پہلے کیا گیا ہے۔ ابن طباطبا اصبہان میں پیدا ہوئے اور 322ھ میں وفات پائے۔ ان کا شجرۂ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت علی ابن ابی طالبؓ تک پہنچتا ہے۔

ابن طباطبا اصبہانی کو زبان وادب کا خصوصی ذوق تھا۔ وہ اپنے دور کے عام مشاہیر سے اس طور پر ممتاز تھا کہ اُس نے ایک فن کے علاوہ کسی دوسرے فن میں طبع آزمائی نہیں کی۔ پوری طرح ایک ہی فن سے وابستہ رہا۔ اس فن ادب کے لیے اپنی تمام تر علمی صلاحیت وقف کر دی۔

ابن طباطبا نے عربی ادب کو اپنی متعدد تصانیف سے مالا مال کیا۔ اس کی معروف تصانیف میں **سنام المعالي**، **عيار الشعر**، **الشعر والشعراء**، **نقد الشعر** اور **كتاب العروض** کے نام آتے ہیں۔ ان میں سے **عيار الشعر** کا موضوع بلاغت ہے۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب شعر سے گفتگو کرتی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں شعر کو جانچنے، پرکھنے اور اس کی چھان پھٹک کرنے کے پیمانوں پر گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے۔ اس طور پر کہ اس میں شاعری کے سیاق میں بلاغت کو موضوع بنایا گیا ہے اور شعر کے بلاغتی پہلوؤں پر جامع بحث کی گئی ہے۔

4.7 رمّانی

ابوالحسن علی بن عیسیٰ بن عبداللہ الرّمانی چوتھی صدی ہجری کا بے مثال مصنف اور لغوی تھا۔ اُس کا تعلق معتزلہ کے کلامی مدرسہ فکر سے تھا۔ رمانی نے بہت ساری کتابیں تصنیف کی ہیں جو مختلف علوم وفنون سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُس کی تصانیف کی تعداد 100 تک پہنچتی ہے۔

رمّانی کو ایک بڑا شرف یہ حاصل ہوا کہ اُس نے مختلف علوم کے اماموں سے علم حاصل کیا۔ علم نحو کو زجاج (م: 311ھ) اور ابن سراج (م: 316ھ) سے حاصل کیا۔ عربی ادب کا علم ابن درید (م: 321ھ) سے حاصل کیا اور دینی علوم ابن اخشید (م: 326ھ) سے۔ سب جانتے ہیں کہ ابن اخشید ایک معتزلی عالم تھا۔ اس لیے رمّانی بھی عقائد کے لحاظ سے معتزلی ہو گیا تھا۔

مختلف علوم کو اُن کے ماہر علما سے حاصل کرنے کی وجہ سے رمانی مختلف علوم کے ماہر کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اُسے ایک بڑا نحوی بھی سمجھا جاتا ہے اور بڑا ادیب بھی۔ وہ ماہر لغوی بھی ہے اور بڑا فلسفی ومتکلم بھی۔ اسی لیے اُس کے شاگردوں میں ابوحیان توحیدی (م: 414ھ) جیسے عظیم فلسفی شامل ہیں۔

رمانی کی کتابوں میں "النكت في إعجاز القران" کو علم بلاغت میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں رمانی نے قرآنِ کریم کو بنیاد بنا کر علمِ بلاغت کے اصول وضوابط پر گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے اولیت رکھتی ہے کہ اس میں اعجازِ قرآن کے حوالے سے پہلی مرتبہ علم بلاغت کو پیش کیا گیا ہے۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں عظیم خدمات انجام دے کر رمانی 384ھ میں انتقال کر گیا۔

4.8 ابو ہلال عسکری

ابوھلال حسن بن عبداللہ العسکری کا تعلق ایران سے تھا۔ وہ چوتھی صدی ہجری میں ایران کا عظیم مصنف اور شاعر سمجھا جاتا ہے۔

ابوھلال عسکری نے ادب، تفسیر، اخلاقیات اور شاعری کے میدان میں گہرے نقوش قائم کیے۔ تفسیر میں اُس نے "**المحاسن في تفسير القرآن**" پانچ جلدوں میں پیش کی تو اخلاقیات میں "**ذم الكبر**" اور "**فضل العطاء**" تصنیف کی ہیں۔ شاعری میں اپنا دیوان چھوڑا تو حماسہ کی شرح بھی لکھی۔ علمِ بلاغت میں ہم اُسے اُس کی مشہور تصنیف "**الصناعتين**" کی وجہ سے جانتے ہیں۔

"**الصناعتين**" میں عسکری نے نثر اور نظم کو دو مستقل صنعت قرار دے کر اُن کے اصول وآداب پر گفتگو کی ہے۔ دونوں کو اپنا موضوع بنایا ہے اور دونوں کے حسن وقبح کو واضح کیا ہے۔

مختلف میدانوں میں اہم خدمات انجام دے کر ایران کا یہ مشہورِ زمانہ مصنف 395ھ میں وفات پا گیا۔

4.9 باقلانی

ابوبکر محمد بن الطیب بن محمد بن جعفر بن القاسم المعروف بہ الباقلانی عہدِ عباسی میں پانچویں صدی ہجری کے عظیم مصنف، مفکر، فقیہ اور ادیب تھے۔ امت نے اُن کی خدمات کی وجہ سے **شيخ السنة** اور **لسانُ الأمة** کے لقب سے یاد کیا۔ بہت سے علما نے اُنھیں اپنے زمانے کا مجدد بھی کہا ہے۔ تاریخِ اسلام کے عظیم علما جیسے ابن تیمیہ (م: 728ھ)، ذہبی (م: 748ھ)، قاضی عیاض (م: 544ھ) اور خطیب بغدادی (م: 463ھ) ان کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

باقلانی نے امام دارقطنی (م: 385ھ)، امام ابوالحسن الباہلی (م: 370ھ) اور ابن ابی زید قیروانی (م: 386ھ) جیسے اساطین سے علم حاصل کیا اُس کے بعد علوم القرآن، فقہ، اصولِ فقہ اور علم کلام کے میدانوں میں لازوال خدمات انجام دیں۔

باقلانی کی کتاب "**إعجاز القرآن**" کو علمِ بلاغت میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اُنھوں نے اس کتاب میں قرآنِ کریم کے ادبی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور قرآن کے ادبی اعجاز کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر علمِ بلاغت کی ایک شاخ علمِ بدیع کے گرد گھومتی ہے۔ گویا باقلانی علمِ بدیع کو بلاغت کا اہم ترین جز تسلیم کرتے ہیں۔

متعدد میدانوں میں لازوال خدمات انجام دے کر اور ابواسحاق شیرازی جیسا بے مثال شاگرد چھوڑ کر ابوبکر باقلانی 403ھ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور بغداد میں آسودۂ خاک ہوئے۔

4.10 ابن رشیق

ابوعلی الحسن بن رشیق القیروانی 390ھ یا 406ھ میں الجزائر میں پیدا ہوا۔ سالِ پیدائش میں سخت اختلاف ہے۔ ابتدا ہی سے شعر وادب کی طرف رجحان تھا۔ کم عمری سے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ محمد بن جعفر القزاز (م: 412ھ) اور ابواسحاق القیروانی (م: 453ھ) جیسے اساطینِ ادب سے نحو، لغت، عروض، تنقید، بلاغت اور مشاہدات کا علم حاصل کیا اور آسمانِ ادب پر ایک روشن ستارے کی حیثیت سے ظاہر ہوا۔

ابن رشیق نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ان میں سے چند ہی ہم تک پہنچ سکی ہیں۔اُس کی مشہور کتابوں میں **أنموذج الزمان في شعراءِ القيروان، الشذوذفي اللغة، قراصة الذهب في نقد أشعار العرب** اور ایک شعری دیوان شامل ہیں۔لیکن وہ کتاب جس نے ابن رشیق کوعلم بلاغت کی تاریخ میں بلند مقام پر فائز کیا، وہ **كتاب العمدة** ہے۔دوجلدوں پر مشتمل یہ کتاب شعری تنقید اوراس کے اصول وضوابط کے متعلق ہے۔اس میں مصنف نے اپنے پیش رونا قدین کی آرا کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کا جائزہ لیا ہے۔اس طرح یہ کتاب مصنف کے ساتھ ساتھ اکثر علمائے ادب کے نظریات کا مجموعہ بن گئی ہے۔اس کتاب نے مصنف کوانفرادیت عطا کی ہے۔اس مشہور عالمِ بلاغت ابن رشیق القیروانی کا انتقال 463ھ میں ہوا۔

4.11 خفاجی

ابومحمد عبداللہ بن محمد بن سعید بن سنان الخفاجی الحلبی پانچویں صدی ہجری کا مشہور ادیب اور ماہر بلاغت تھا۔شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق تھا۔ لیکن اس کی اکثر تصانیف اورشعری دیوان ہم تک نہیں پہنچ سکی۔البتہ علم بلاغت کے متعلق لکھی ہوئی اُس کی کتاب "**سرّ الفصاحة**"،علمی حلقوں تک پہنچی اور مقبول ہوئی۔اس کتاب میں خفاجی نے فصاحت پر بنیادی گفتگو کرتے ہوئے،فصاحت وبلاغت کے درمیان فرق کوواضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ساتھ ہی بلاغت کی مختلف شاخوں کی تحدید وتعیین بھی کی ہے۔

خفاجی کوایک بڑاامتیاز یہ حاصل ہے کہ اُس کوعربی زبان کے عظیم فلسفی شاعرابوالعلا المعری سے بھی تلمذ کا شرف حاصل رہا۔لیکن اُس میں اورالمعری میں ایک بڑافرق یہ رہا کہ المعری نے خودکوعلم وفلسفے کے لیے وقف کیے رکھا، جب کہ خفاجی نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی خاص شرکت اختیار کی۔وہ امرااوروزرا کے درباروں کا مستقل شریک اورسیاسی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔

کہاجاتا ہے کہ ایک وزیر نے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے اُسے قتل کرادیا۔خفاجی کی موت 466ھ میں واقع ہوئی۔

4.12 جرجانی

ابوبکر عبدالقاہر بن عبدالرحمان بن محمد الجرجانی علم وادب کی تاریخ کا ایسا نام ہے،جس کے بغیر زبان وادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ جرجانی نے انتہائی خستہ حال گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔مختلف ماہرین سے نحو،صرف، بلاغت اورشاعری کاعلم حاصل کرکے علمی دنیامیں قدم رکھا۔ خاص طور پرعلم بلاغت کے میدان میں ایسا امتیاز پیدا کیااورایسی وقیع تصانیف پیش کیں کہ اُسے علم بلاغت کا بانی اورمؤسس قراردیا گیا۔

عبدالقاہر جرجانی نے ایک شعری دیوان کے علاوہ **الإيضاح في النحو، الجمل، الرسالة الشافعية في الإعجاز** اور **إعجاز القرآن** جیسی گراں قدرتصانیف پیش کی ہیں۔ان کے علاوہ جن دوتصانیف نے اُسے علم وفضل میں امامت کے درجے پر فائز کیا، وہ **دلائل الإعجاز** اور **أسرار البلاغة** ہیں۔مذکورہ بالا کتب کے ناموں سے ہی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جرجانی نے مختلف علوم وفنون پر کام کیا اور قیمتی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔

جرجانی کی دوتصانیف **دلائل الإعجاز** اور **أسرار البلاغة** اپنے حسنِ ترتیب زبردست اندازِ تفہیم اور منطقی طرزِ گفتگو کی وجہ سے علمی دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ان کتابوں نے کئی نسلوں کومتاثر کیا۔ان کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔انھیں موضوعِ بحث وتحقیق بنایا گیااورعربی ادبیات

بالخصوص بلاغت سے واقفیت رکھنے والوں کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ فرض کے درجے میں ضروری سمجھا جانے لگا۔

جرجانی کو اس بات میں اولیت اور سبقت حاصل ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ بلاغت کے اصول وقواعد کو منظم ومرتب انداز میں ایک مستقل علم کی حیثیت سے پیش کیا۔اس سے پہلے بلاغت کے موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا، وہ متفرق اور غیر مرتب تھا۔ جرجانی نے تمام مباحث کا احاطہ کرتے ہوئے بلاغت کو علمِ بلاغت بنایا اور رہتی دنیا تک کے لیے ایک ایسا نقش قائم کر گیا کہ آج تک اس سے بہتر کام پیش نہیں کیا جاسکا۔اسی لیے جرجانی کو بہ جا طور پر علم بلاغت کا بانی کہا جاتا ہے۔

عبدالقاہر جرجانی کی وفات 471ھ میں ہوئی۔

4.13 زمخشری

ابوالقاسم محمود بن عمر بن محمد بن عمر الخوارزمی الزمخشری اسلامی علوم کی تاریخ میں ایک جلیل القدر امام کی حیثیت سے معروف ہیں۔اللہ تعالیٰ نے بے مثال ذہانت عطا فرمائی تھی۔اسی لیے انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، نحو اور جغرافیہ کے موضوعات پر گراں قدر تصانیف پیش فرمائیں۔ جس طرح وہ مختلف علوم میں امامت کے درجے پر فائز تھے، اسی طرح عقیدے کے لحاظ سے معتزلی اور عمل کے لحاظ سے حنفی تھے۔

علامہ زمخشری نے علم تفسیر میں الكشاف، علم حدیث میں مشتبه أسامي الرواة، علم فقہ میں الرائض في علم الفرائض اور رؤوس المسائل، علم تصوف میں أطواق الذهب في المواعظ، اور النصائح، علم جغرافیہ میں كتاب الأمكنة والجبال والمياه، علم ادب میں مقامات الزمخشري اور علم بلاغت میں أساس البلاغة جیسی اہم کتابیں تصنیف کیں۔اُن کی تفسیر الكشاف صدیوں سے دنیا کے تمام اسلامی علمی حلقوں میں پڑھی پڑھائی جارہی ہے۔

علامہ زمخشری نے ویسے تو علم بلاغت میں أساس البلاغة کے نام سے مستقل کتاب تصنیف کی ہے، لیکن اپنی تفسیر میں انھوں نے قرآن کریم کو بنیاد بنا کر فصاحت وبلاغت اور زبان وادب کے لحاظ سے جو نوادر پیش کیے ہیں، وہی اُن کا اصل امتیاز سمجھے جاتے ہیں۔چھٹی صدی ہجری میں زمخشری کے پائے کا کوئی دوسرا ماہرِ بلاغت نظر نہیں آتا۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ علم بلاغت کی تاریخ میں عروج وجمود کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔اُن کے بعد دورِ جمود شروع ہوگیا۔شوقی ضیف نے بھی انھیں علم بلاغت کے دورِ عروج کا آخری مجتہد کہا ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے درمیان یعنی 538ھ میں علامہ زمخشری نے اس دنیا کو الوداع کہا۔اُس کے بعد علم بلاغت میں دورِ جمود کا آغاز ہوگیا۔ دورِ جمود کے آغاز میں امام فخر الدین رازی (وفات 604ھ) کی نهاية الإيجاز في دراية الإعجاز اور اُن کے بعد سکا کی (وفات 626ھ) کی مفتاح العلوم کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔البتہ یہ کتابیں اپنے مصنفوں کی عظمت کے باوجود کوئی ایسی چیز پیش نہیں کرسکیں، جنھیں علم بلاغت میں اضافے سے تعبیر کیا جاتا۔ان کے بعد دورِ جمود اور مضبوط ہوگیا اور اب تک شائع ہونے والی کتابوں کی تلخیصات وشروحات کا سلسلہ چل پڑا۔اس دور کے اہم لوگوں میں ابن الاثیر (وفات 630ھ) اور خطیب قزوینی (وفات 739ھ) کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔علم بلاغت میں ان کا مقام بلند تھا، لیکن ان تمام مصنفین کو زمخشری اور ان سے پہلے کے علمائے بلاغت کی طرح کوئی نئی دریافت کرنے، کچھ نئے مباحث اٹھانے اور نئے نظریات پیش کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

4.14 اکتسابی نتائج

اب تک کے مطالعے سے ہمارے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ علم بلاغت کا آغاز، عروج، جمود اور انحطاط سب کچھ عباسی دورِ حکومت میں پیش آیا۔ تیسری صدی ہجری میں جاحظ کے ذریعے علم بلاغت کی ترتیب وتدوین کا جو آغاز ہوا، وہ ابن المعتز، قدامہ بن جعفر، رمّانی، باقلانی، ابن طباطبا، عسکری، ابن رشیق، خفاجی سے ہوتا ہوا جرجانی تک پہنچا۔ اس عروج کے بعد زمخشری، رازی، سکاکی ابن اثیر اور قزوینی کے ساتھ یہ علم پوری طرح جمود کا شکار ہوگیا۔

یہ جدول علم بلاغت کی پوری تاریخ یاد رکھنے میں آپ کے لیے معاون ثابت ہوگا:

نمبر شمار	علمائے بلاغت	سن وفات	تصانیف
1	جاحظ	225ھ	البيان والتبيين — بلاغت کے مباحث کی علمی پیش کش کا آغاز
2	ابن المعتز	296ھ	البديع
3	قدامہ بن جعفر	337ھ	نقد الشعر
4	رمّانی	384ھ	النكت في إعجاز القرآن — متکلمین کے علم بلاغت کو اختیار کرنے کا آغاز
5	باقلانی	403ھ	إعجاز القرآن
6	ابن طباطبا اصبہانی	322ھ	عيار الشعر
7	ابو ہلال عسکری	395ھ	الصناعتين
8	ابن رشیق قیروانی	463ھ	العمدة في صناعة الشعر ونقده
9	ابن سنان خفاجی	466ھ	سرّ الفصاحة
10	عبدالقاہر جرجانی	471ھ	دلائل الإعجاز اور أسرار البلاغة
11	زمخشری	538ھ	الكشاف عن حقائق التنزيل وعيون الأقاويل في وجوه التأويل
12	فخر الدین رازی	604ھ	نهاية الإيجاز في دراية الإعجاز — دورِ جمود کا آغاز
13	سکاکی	626ھ	مفتاح العلوم
14	ابن الاثیر	630ھ	المثل السائر في أدب الكاتب والشاعر — مکمل دورِ جمود
15	خطیب قزوینی	739ھ	تلخيص المفتاح

4.15 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ پندرہ سطروں میں جواب دیجیے:

1- علم بلاغت میں جاحظ کا کیا مقام ہے؟

2- علم بلاغت کا بانی کسے کہا جاتا ہے؟ اور کیوں؟

3- علم بلاغت میں دورِ جمود اور دورِ انحطاط کی خصوصیات لکھیے۔

ب۔ تیس سطروں میں جواب دیجیے:

1- تیسری صدی ہجری کے عظیم علمائے بلاغت اور ان کی کتابوں کے نام لکھیے۔

2- قدامہ بن جعفر نے ابن المعتز کے کام کو کس طرح آگے بڑھایا؟

3- باقلانی کے کچھ اوصاف لکھیے۔

4.16 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1- **المختصر في تاريخ البلاغة** ڈاکٹر عبد القادر حسین

2- **مصادر الأدب العربي** مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

اکائی 5 علم بیان کی اہمیت وارتقا
تشبیہ اوراس کی قسمیں

اکائی کے اجزا

5.1 تمہید
5.2 مقصد
5.3 علم البیان کی لغوی واصطلاحی تعریف
5.3.1 لغوی تعریف
5.3.2 اصطلاحی تعریف
5.3.3 تعریف کی تشرح
5.3.4 علم بیان کی اہمیت وافادیت
5.4 علم البیان کاارتقا
5.5 معنی کی ادائیگی میں علم البیان کااثر
5.5.1 علم المعانی اورعلم البدیع کے مقابلہ علم البیان کی انفرادیت
5.6 تشبیہ کی تعریف
5.6.1 لغوی تعریف
5.6.2 اصطلاحی تعریف
5.6.3 تشبیہ کے ارکان
5.7 ارکان تشبیہ کا حذف وذکر
5.7.1 ادات تشبیہ کے حذف وذکر کے اعتبار سے تقسیم
5.7.2 وجہ شبہ کے حذف وذکر کے اعتبار سے تقسیم
5.8 تشبیہ کی مزید قسمیں

5.8.1 تعددِ تشبیہ کے اعتبار سے تقسیم

5.9 تشبیہ کے اغراض

5.10 کلام کی بلاغت میں تشبیہ کا اثر

5.11 اکتسابی نتائج

5.12 امتحانی سوالات کے نمونے

5.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

5.1 تمہید

علم البیان فن بلاغت کے علوم ثلاثہ (علم البیان، علم المعانی، علم البدیع) کا وہ بنیادی حصہ ہے جس میں کلام کو واضح طریقہ پر پیش کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں اور یہ طرقہائے کلام جہاں ایک طرف متکلم کی منشا کے مطابق کلام کی قوت اور اس کے حسن کو قائم رکھنے میں معاون ہوتے ہیں وہیں اس کو اس بات کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں کہ وہ بلیغ کلام کی باریکیوں اور اس کی نزاکتوں کو سمجھ سکے اور الفاظ کے ظاہری معنی کے علاوہ مرادی معنی کو اس کے سیاق کے ساتھ متعین کر سکے۔

تشبیہ علم البیان کے اہم مباحث میں سے ہے، علم بیان کے مباحث میں سب سے زیادہ تشبیہ کا استعمال ہوتا ہے، ہر شاعر اور ادیب اپنے کلام میں حسن پیدا کرنے کے لیے اور مختلف اغراض کے لیے تشبیہات کا استعمال کرتا ہے۔ تمام ادبا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کلام میں جب تشبیہ کا استعمال ہوتا ہے تو کلام کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ مبرد نے الکامل میں لکھا ہے: ''**هو جار في كلام العرب حتى لو قال قائل: هو أكثر كلامهم لم يبعد**'' کہ تشبیہ کا استعمال عرب کے کلام میں عام ہے، اگر کوئی یہ دعوی کرے کہ ان کا اکثر کلام تشبیہ پر مبنی ہے تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔

تشبیہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شعرائے متقدمین کے نزدیک وزن اور قافیہ سے زیادہ اہمیت تشبیہ کو حاصل تھی، اس کی ایک مثال حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ ہے، جب ان کے صاحب زادے حضرت عبدالرحمان رضی اللہ عنہ بچپن میں ان کے پاس روتے ہوئے آئے اور کہنے لگے مجھے ایک پرندے نے کاٹ لیا ہے۔ حضرت حسان نے پوچھا کہ اس پرندے کا وصف بیان کرو، تو ان کے صاحب زادے نے جواب دیا: ''كأنه مُلتَفٌّ في بُرْدَيْ حِبَرَةٍ'' (گویا کہ وہ دو یمنی منقش چادروں کے درمیان لپٹا ہوا ہے)، بیٹے کا جواب سن کر حضرت حسان رضی اللہ عنہ بڑے خوش ہوئے اور انھوں نے برجستہ کہا: ''**ابني شاعر ورب الكعبة**'' (بخدا! میرا بیٹا شاعر ہوگیا) (أسرار البلاغة: ص: ۱۹۱)۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ اپنے صاحبزادے کی اس تشبیہ سے بہت خوش ہوئے، کیونکہ کلام میں تشبیہ کا استعمال شاعر ہونے کی علامت ہے۔

علم بیان کے دیگر مباحث کو سمجھنے میں تشبیہ کی بحث بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ تشبیہ کے چند ارکان ہوتے ہیں جو مختلف شکلوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ان کی حالت کی بنیاد پر کلام میں تبدیلیاں بھی رونما ہوتی ہیں اور تشبیہ کی حیثیت بھی بدل جاتی ہے، مثلاً حقیقت و مجاز کی بحث میں آپ پڑھیں گے کہ اگر کلمہ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان مشابہت کا علاقہ ہے تو اسے ''استعارہ'' کہیں گے اور اگر مشابہت کے علاوہ دوسری چیزوں کا علاقہ ہے تو ''مجاز مرسل'' کہیں گے، اسی طرح استعارہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کی مختلف حالتیں اس کے نوع کی تعیین کرتی ہیں مثلاً مشبہ بہ کے ذکر اور مشبہ کے حذف ہونے پر ''استعارہ تصریحیہ'' کہلاتا ہے اور اس کے برعکس صورت میں جب مشبہ مذکور ہو اور مشبہ بہ محذوف ہو تو ''استعارہ مکنیہ'' کہلاتا ہے۔

غرض تشبیہ کی کارفرمائی علم البیان کی دیگر بحثوں میں بھی نمایاں شکل میں دیکھنے کو ملتی ہے اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس کو اچھی طرح سمجھ کر آگے بڑھیں تاکہ آگے آنے والے مباحث میں ہمیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

5.2 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ:

☆ علم البیان کی تاریخ اور اس کے ارتقائی مراحل سے مطلع ہوں گے۔

☆ علم البیان کی حقیقت اور کلام میں حسن پیدا کرنے کے لیے اس کی اہمیت وافادیت سے بخوبی واقف ہوں گے۔

☆ علم بلاغت کے ایک انتہائی اہم جز یعنی تشبیہ کی حقیقت سے واقف ہوں گے۔

☆ تشبیہ کے ارکان واقسام اور ان سے متعلق مختلف مسائل کو بخوبی سمجھ سکیں گے۔

☆ تشبیہ کے ذریعے اپنے زبان وبیان کو مؤثر بنا سکیں گے۔

☆ تشبیہ سے متعلق تمام ضروری بحثوں کو پڑھیں گے اور مثالوں کی مدد سے ان تمام مباحث کو ذہن نشیں بھی کرلیں گے۔

5.3 علم البیان کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

5.3.1 لغوی تعریف

لغت میں بیان کے معنی ہیں ''وضاحت، ظاہر ہونا''۔امام زین الدین رازی (وفات ٦٦٦ ھ) مختار الصحاح میں لکھتے ہیں :''بان'' الشيءيبين (بياناً) اتضح فهو (بين)۔۔۔ (استبان) الشيء:ظهر۔۔۔(وتبين)الشيء:ظهر۔

بان الشيء اور استبان الشيء اور تبين الشيء ان تینوں کے معنی ظاہر اور واضح ہونا ہیں۔اس معنی میں یہ کلمہ قرآن مجید میں ایک سے زائد مرتبہ استعمال ہوا ہے، جیسے اللہ کا یہ ارشاد:''وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ''۔ترجمہ: یہ ذکر ہم نے آپ پر نازل کیا ہے، تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح کرتے جایئے جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں۔اسی طرح ایک اور جگہ اللہ کا ارشاد ہے:''يبين الله لكم الآيات''۔ترجمہ:اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف نشانیاں اور احکامات بیان کرتے ہیں۔

عرب بیان کے لفظ کو فصیح، واضح اور دلوں میں اترنے والی بات کے معنی میں استعمال کیا ہے، چنانچہ یہ معنی بھی عرب زبان کی لغات میں ذکر کیا گیا ہے۔مختار الصحاح میں ہے:''البيان : الفصاحة واللسن۔۔۔ وفلان (أبين)من فلان (أي أفصح منه وأوضح كلاماً)'' (بیان فصاحت وزبان دانی کا نام ہے۔۔۔عرب کا یہ کہنا: فلان أبين من فلان اس کا مطلب ہے فلان شخص اس سے زیادہ فصیح ہے اور اس کا کلام زیادہ واضح ہے)۔ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے:''البيان : الإفصاح مع ذكاءٍ,البين من الرجال الفصيح''(ہوش مندی کے ساتھ واضح گفتگو کرنا، بین اس شخص کو کہتے ہیں جو فصیح ہو)۔

5.3.2 اصطلاحی تعریف

فن بلاغت کے مشہور عالم سکاکی (٦٢٦ ھ) نے بیان کی اصطلاحی تعریف اس طرح بیان کی ہے:''معرفة إيراد المعنى الواحد في طرق مختلفة، بالزيادة في وضوح الدلالة عليه وبالنقصان ليحترز بالوقوف على ذلك عن الخطأ في مطابقة الكلام لتمام المراد منه''۔ترجمہ:علم بیان ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ سے ایک معنی کے بیان کرنے کے مختلف طریقوں کو جانا جاتا ہے، اس معنی پر کمی اور زیادتی کی دلالت کی وضاحت کے ساتھ، تاکہ اس کے ذریعے سے معنی کی ادائیگی میں مطابقت کلام کی غلطی سے بچا جائے۔

خطیب قزوینی (٧٣٩ ھ) نے امام سکاکی سے استفادہ کرتے ہوئے اس تعریف کو اور جامع بنا کر پیش کیا ہے:''وهو علم يعرف به

إيراد المعنى الواحد بطرق مختلفة في وضوح الدلالة عليه"۔علم البیان وہ علم ہے جس کے ذریعہ ایک معنی کو مختلف طریقوں سے ادا کیا جائے اور ہر طریقہ اس معنی کی وضاحت ودلالت میں جداگانہ ہو، نیز اقتضائے حال کی مطابقت بہر صورت ملحوظ رہے۔

5.3.3 تعریف کی تشریح

☆ مندرجہ بالا تعریف میں استعمال ہونے والے لفظ "**العلم**" سے مراد ان قوانین وضوابط کا مجموعہ ہے جس کے ذریعے سے ایک معنی کو مختلف طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے، معنی کی یہ ادائیگی کبھی تشبیہ کے ذریعے ہوتی ہے، کبھی استعارہ اور مجاز کے ذریعے ہوتی ہے اور کبھی کنایہ کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہی وہ مباحث ہیں جن کا علم بیان احاطہ کرتا ہے اور جن کی تعریفات ہم آئندہ اکائیوں میں تفصیل کے ساتھ پڑھیں گے۔

☆ تعریف میں استعمال ہونے والے لفظ "**المعنى الواحد**" سے متکلم کا وہ معنی مراد ہے جو اپنے معنی کے لحاظ سے مکمل ہو اور مقتضائے حال کے مطابق ہو، جیسے: بہادری، جود وسخاوت، شرافت وعفت کے معنی کو بیان کرنا۔ اس کا مطلب ہوا کہ ایک مفرد کو مترادف معنوں میں استعمال پر قدرت بیان کی تعریف میں شامل نہیں ہے، جیسے کوئی انسان أسد (شیر) کے مختلف معنی یعنی **الليث، الغضنفر، السبع، الضرغام** استعمال کرے تو وہ فن بیان سے متعلق نہیں ہوگا جب کہ اس کا تعلق علم اللغۃ سے ہوگا۔

☆ **بطرق مختلفة** سے مراد یہ ہے کہ بعض طریقے بعض دوسرے طریقوں سے زیادہ واضح ہوں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک معنی واضح اور دوسرا معنی غیر واضح ہو۔ کیونکہ ایسا طریقہ جو معنی مراد کو واضح نہ کر سکے علمائے بلاغت کے نزدیک فصاحت وبلاغت کے خلاف ہے، البتہ معنی کی ادائیگی میں دقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو خفی طور پر اس طرح ادا کیا جائے کہ اس میں کوئی شک والتباس نہ پایا جاتا ہو، تو ایسا طریقہ علم بیان کا مقصود ہے۔

مثلاً اگر کوئی خالد کی سخاوت کو بیان کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے لیے علم البیان کے مختلف طریقوں کا استعمال کر سکتا ہے چنانچہ

۱-تشبیہ کے ذریعے کہے گا **زيد كالبحر**

۲۔ استعارہ کے ذریعے **رأيت بحرا أيفيض على الناس**

۲-مجاز کے ذریعے **رأيت بحرا في دار زيد**

۳-کنایہ کے ذریعے **زيد كثير الرماد**

یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ بیان کے مذکورہ مختلف طریقے کلام کی وضاحت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ہر ایک کی اپنی خصوصیت اور مقصدیت ہے جو بیان کے تقاضوں کو اقتضائے حال کے مطابق پورا کر رہا ہے۔

5.3.4 علم بیان کی اہمیت وافادیت

علم بیان فن بلاغت کا بہت اہم جز ہے۔ کسی معنی کو مختلف انداز میں بیان کرنے کے لیے اور سامنے والے پر اس بات کا اثر ڈالنے کے لیے علم بیان کا جاننا بہت ناگزیر ہے۔ علم بیان اظہار کے ان طریقوں کا مطالعہ کرتا ہے جن کے ذریعے کسی واقعہ، خیال یا کیفیت کی صحیح تصویر کھینچ جائے اور مخاطب کا ذہن متکلم کے مافی الضمیر تک پہنچ جائے۔ گویا کسی بات یا خیال کو اس طرح بیان کرنا جس سے اس کی تفصیل کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور اس میں لطف وتاثیر کے علاوہ جدت وندرت بھی پیدا ہو علم بیان کے ذیل میں آتا ہے۔

علم بیان کو پڑھنے اوراس سے واقف ہونے سے درج ذیل فائدے حاصل ہوتے ہیں:

۱۔عربوں کے نثری اور نظمی کلام کے اسرار ورموز سے آگاہی ہوتی ہےاور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلاغت وفصاحت میں ادبا کا کیا مقام ومرتبہ ہے۔

۲۔دلوں میں اثر کرنے والے اسلوب بیان کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک ادیب کسی اچھے کلام کی تخلیق پر قادر ہوسکتا ہے اور یہ قدرت علم بیان کے اصولوں کو پڑھنے اوران پر مشق وممارست سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

۳۔معنی مطلوب کومختلف طریقوں اوراسلوبوں اورلفظوں کے ذریعے بیان کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔

۴۔اعجاز قرآن کے اسرار سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔

5.4 علم البیان کا ارتقا

علم بلاغت کا اطلاق اس کے تینوں شاخ بیان، معانی اور بدیع کے مجموعے پر ہوتا ہے،علم بلاغت دیگر علوم کی طرح اپنے نشوونما، ارتقااور پختگی میں کئی مراحل سے گزرا ہے،علمائے متقدمین کے پاس علوم بلاغت کے یہ تین مباحث مستقل علم کی حیثیت نہیں رکھتے تھے کیونکہ یہ دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے،اور وہ لوگ ان مباحث کے مجموعے کو''بیان'' کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ظاہری طور پر علم بلاغت اور تنقید نگاری ایک دوسرے کے مترادف تھے،عکاظ کے میلے میں شعرا جب حکم کے سامنے اپنے قصیدے پیش کرتے تو وہ ان پر معیاری یا غیر معیاری ہونے حکم لگاتا، اوران قصائد پر اپنی رائے اورتبصرے کا اظہار کرتا،یہی تبصرے اور تنقیدی آرا علوم بلاغت کی ابتدائی صورت تھی۔

عصر اسلامی اوراموی میں جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوااور دوسری قومیں اورتحریکیں اسلامی ثقافت میں ضم ہونے لگیں،اور مسلمانوں کی حکومت کواستحکام حاصل ہوگیا،تو سیاسی معاملات اوراعتقادی مسائل میں شدید اختلاف کی وجہ سے مختلف فرقے اور جماعتیں ظاہر ہوئیں،جس کے نتیجے میں تنقیدی آرااورتبصروں میں غیر معمولی اضافہ ہوا،شیخ اصفہانی نے اپنی کتاب ''الأغاني''میں ان تبصروں کا ذکر کیا ہے۔

عصر عباسی سے پہلے یہ آرا اورتبصرے صرف زبانی ہوتے تھے،عصر عباسی میں ان تبصروں کو مدون کرنے کی باضابطہ کوشش کا آغاز ہوا، چونکہ عصر عباسی میں شعروادب کو کافی فروغ حاصل ہوااور عباسی حکمرانوں کی علم دوستی اورادبا پروری کی وجہ سے شعرااورادبا میں مقابلہ آرائی اور دربار سلطنت میں مقام ومرتبے کے حصول کے شوق میں ہمہ وقت مسابقت کا سلسلہ جاری رہتا تھا،جس کی وجہ سے اس علم کوعصر عباسی میں کافی فروغ حاصل ہوا۔اس دور میں ادبا کے دو طبقے پائے جاتے تھے،ایک وہ طبقہ تھا جوقدامت پسندی کی طرف مائل تھا،ان کا رجحان قدیم شعر کی روایت،نحوی و صرفی اصول کی تدوین وغیرہ کی طرف تھا، چنانچہ اس طبقہ کے ادبا نے شعروں کے مجموعے کو مدون کیا اوراس میں پائی جانے والی ادبی اورنحوی خصوصیات کوبھی بیان کیا،اس طبقہ میں سب سے نمایاں نام امام سیبویہ(وفات ۱۸۰ھ) کا ہے،امام سیبویہ نے جواسلوبی خصوصیات،تقدیم وتاخیر، حذف وذکراور معرفہ ونکرہ کے حوالے سے اپنی کتاب میں ذکر کی ہیں وہ اسی قبیل سے ہے۔اس طبقہ کی دوسری قابل ذکر شخصیت امام فراء(۲۰۷ھ) کی ہے جنھوں نے ''معاني القرآن'' کے نام سے کتاب تصنیف فرمائی اوراس میں تفسیر کے علاوہ قرآن کی بعض ترکیبوں کی خصوصیات اوراس میں موجوداسلوبی وبیانی وجمالی خوب صورتی کوبھی ذکر کیا ہے۔

اسی طرح ابوعبیدہ معمر بن المثنی (۲۱۱ھ) جو کہ امام فراء کے ہم عصر ہیں انھوں نے بھی ''مجاز القرآن'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف

فرمائی اوراس میں علوم بلاغت سے متعلق مسائل پر گفتگو کی۔ یہاں پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کتاب میں مجاز سے علم بلاغت کی وہ اصطلاح مراد نہیں ہے جو حقیقت کے مقابل میں استعمال ہوتی ہے، بلکہ امام ابو عبیدہ نے اس لفظ کو مطلق تفصیل اور بیان کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کتاب میں بلاغت کے دیگر مسائل کی طرف سرسری بحث کو شامل کیا گیا ہے، جیسے: تشبیہ، استعارہ، کنایہ، اس کے علاوہ بعض نحوی خصوصیات جیسے: تقدیم وتاخیر، حذف وذکراور التفات وغیرہ پر بھی صاحب کتاب نے بحث کی ہے۔

اس دور کا دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جن کو علم کلام میں مہارت حاصل تھی، ان میں سرفہرست معتزلی علما تھے، وہ اپنے ہم عقیدہ لوگوں اور طلبہ کو فن خطابت، علم جدل، مناظرہ وغیرہ سیکھنے کی ترغیب دیتے تھے، ان علوم میں ان کی مشق اتنی گہری ہوتی تھی کہ وہ کلام اور اس کے بلاغی اور جمالیاتی پہلوؤں کو بھی شامل ہوجاتی تھی۔ جاحظ کی کتاب "البیان و التبیین" میں معتزلی علما کے بہت سارے ایسے آرا ملتے ہیں جن کا براہ راست علوم بلاغت سے تعلق ہے، معتزلہ نے یہ علم دو طریقوں سے حاصل کیا تھا، ایک قدیم عربی کلام سے دوسرے غیر عربی اور اجنبی ثقافتوں سے جو اس دور میں اپنی جڑوں کو مضبوط کر رہی تھیں۔ جاحظ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر یونانی، فارسی اور ہندوستانی ادبا کے حوالے سے بلاغت کے مباحث اور تعریفات کو نقل کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علمائے معتزلہ نے دیگر اقوام کے علوم سے بہت ساری چیزوں کو علوم بلاغت کا حصہ بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور علوم بلاغت کی ابتدائی تدوین کا سہرا بھی انھیں کے سر جاتا ہے۔

معتزلی علما نے علوم بلاغت کو سب سے زیادہ اپنا موضوع بنایا اور اس فن میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ان میں ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ (۲۵۵ھ) کا نام سرفہرست ہے، اس نے اپنی مایہ ناز کتاب "البیان والتبیین" میں اپنے دور تک علوم بلاغت میں پائے جانے والے آرا اور تبصروں کو مدون کیا، اس کے علاوہ اس نے اپنی طرف سے بھی تشبیہات، استعارات اور کنایات سے متعلق کافی کچھ اضافہ کیا جن کا تعلق علم بیان سے ہے، جاحظ کی سب سے منفرد بات یہ تھی کہ وہ اپنے بیان میں نظریاتی ہونے کے ساتھ ساتھ مسائل کی عملی مثال بھی پیش کرتا تھا، یہ علم بیان کا وہ پہلا عالم ہے جس نے تشبیہ اور استعارے میں فرق کیا اور حقیقت کے مقابلے میں "المثل" کی اصطلاح مجاز کے لیے استعمال کی۔ البیان والتبیین میں "نار الحرب" کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے: "ویذکرون ناراً أخری، وھي علی طریق المثل لا علی طریق الحقیقة، قال ابن میادة:

یداہ ید تنھل بالخیر والندی	وأخری شدید بالأعادي ضریرھا
ونار اہ: نار کل مدفع	وأخری یصیب المجرمین سعیرھا

ترجمہ: وہ لوگ (عرب) آگ سے ایک دوسری چیز مراد لیتے ہیں جو کہ مجاز کے طور پر ہوتی ہے حقیقت نہیں ہوتی ابن میادہ کا یہ قول (اسی بات کو واضح کرتا ہے)، ممدوح کے دو ہاتھ ہیں، ایک ہاتھ سے مسلسل بھلائی اور جود وسخاوت ہوتی ہے اور دوسرا دشمنوں کے لیے سخت اور وبال جان ہے اور اس کے پاس دو آگ ہیں ایک آگ تو محتاج، یتیم اور تنگ دستوں کے لیے ہے اور دوسری آگ مجرموں کے لیے جہنم ہے۔

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جاحظ نے مجاز کے لیے مثل کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے لفظ کو حقیقت ومجاز میں تقسیم کیا ہے۔

جاحظ کے بعد جس نے اس فن میں قابل قدر کام کیا ہے وہ ابن قتیبہ دینوری (وفات ۲۷۶ھ) ہے، ابن قتیبہ اہل سنت کے علما میں شمار ہوتا ہے، اہل سنت کے نزدیک ابن قتیبہ کا وہی مقام ہے جو معتزلہ کے نزدیک جاحظ کا ہے۔ ابن قتیبہ متعدد علوم وفنون میں کئی کتابیں تالیف کی ہیں، جن

میں سب سے زیادہ مشہور ”الشعر و الشعراء“ ہے۔ان کی ایک اور کتاب ’تأویل مشکل القرآن ‘‘ ہے،جس میں مصنف نے قرآن مجید کے اعجازی پہلوؤں پر بحث کی ہے اوران لوگوں کا رد کیا ہے، جو اپنی کم علمی اور خالص عربی اسلوب سے ناواقفیت کی بنا پر قرآن میں نکتہ چینی کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ابن قتیبہ نے اس کتاب میں علم بیان کے اقسام پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس میں حقیقت ،مجاز،تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کو شامل کیا ہے۔

ابن قتیبہ کے بعد انہی کے ہم عصر ابوالعباس المبرد (۲۸۵ھ) کا نام آتا ہے،جنھوں نے اپنی کتاب الکامل میں علم بیان کے متعلقات پر بحث کی ہے،الکامل کے مطالعے سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ مبرد نے جابجا شرح مفردات میں علم بیان سے متعلق مباحث کو بھی ذکر کیا ہے،جن میں مجاز،استعارہ اور کنایہ شامل ہے،مبرد نے بطور خاص تشبیہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور تشبیہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:ا۔تشبیہ مفرط ۲۔تشبیہ مصیب ۳۔تشبیہ مقارب ۴۔تشبیہ بعید۔

علم بیان کو مستقل اکائی کی حیثیت دینے میں ابن طباطبا (۳۲۲ھ) کا بھی رول ناقابل فراموش ہے،ان کی کتاب ”عیار الشعر“میں فن شاعری کے متعلق جو اصول وضوابط مذکور ہیں ان کی وجہ سے یہ کتاب اپنے موضوع پر شاہکار ہے۔ابن طباطبا کے مطابق شاعر ایک کپڑا بننے والے کی طرح ہے جو اپنے کپڑے کو مضبوط انداز سے تیار کرتا ہے یا اس شخص کی طرح ہے جو بیش بہا موتیوں اور نایاب پتھروں کو ایک دھاگے میں پرونے کا کام کرتا ہے۔

”النکت في إعجاز القرآن ‘‘مؤلفہ الرمانی (۳۸۶ھ) یہ وہ پہلی کاوش ہے جس میں قرآن کے اعجازی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے علوم بلاغت کا باضابطہ استعمال کیا گیا ہے، الرمانی نے اپنے اس کتاب میں فن بلاغت پر دس ابواب قائم کیے ہیں جن میں دو ابواب کا تعلق علم بیان سے ہے، وہ دو ابواب تشبیہ اور استعارہ کے مباحث پر مشتمل ہیں،اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ علم بلاغت کی مشہور شخصیت عبدالقاہر جرجانی نے”أسرار البلاغة ‘‘میں اس کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں علم بیان پر جو کچھ کام ہوا ان میں وہ کام بھی اہمیت کا حامل ہے جو بظاہر تو فن نقد میں ہے،لیکن ان میں علم بیان کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ فن نقد اور فن بلاغت ایک دوسرے سے متصل ہے،شاعر و ناقد جب تک بلاغت کی پیچیدگیوں سے واقف نہ ہو، نہ تو وہ اچھا کلام کہہ سکتا ہے اور نہ ہی کسی کلام کے مقام ومرتبہ کو متعین کر سکتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں ان تنقیدی کتابوں میں الآمدی (۳۷۰ھ) کی ”الموازنة بین أبي تمام و البحتري ‘‘ شامل ہے۔یہ کتاب دوشاعروں کے کلام کے موازنے پر مشتمل ہے، یا دوسرے الفاظ میں اس دور میں پائے جانے والے دو نقطہائے نظر کا موازنہ ہے جس میں ایک نظریہ سہل الفاظ،مضبوط بندش،عبارت میں حسن و جمال، رونق اثر انگیزی کی موجودگی کو اہمیت دیتا ہے، جب کہ دوسرا نظریہ کلام میں صنائع وبدائع کا استعمال اور معانی کی سمجھنے میں دقت اور حقیقت کے بجائے مجاز، استعارہ اور کنایہ کو استعمال کرنے کو اہمیت دیتا ہے۔اول الذکر نظریہ کو بحتری اور موخر الذکر نظریہ کو ابوتمام کی تائید حاصل تھی۔

الموازنہ میں ہمارا موضوع سخن صرف وہ باب ہے جس میں آمدی نے علم بیان کے متعلقات سے بحث کی ہے، وہ اس باب میں ابوتمام کے استعمال کیے گئے ان استعاروں کا ذکر کرتا ہے جس کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، آمدی کے مطابق یہ تنقید اس لیے درست ہے کیونکہ ابوتمام استعاروں کے استعمال میں مبالغے کی حد تک بڑھ گیا ہے، آمدی کا ماننا تھا کہ استعارے کے استعمال کی ایک حد ہوتی ہے اگر اس حد کو پامال کر دیا جائے تو

استعارہ کلام میں بجائے حسن وخوبی پیدا کرنے کے نقص وقبح پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے، آمدی نے استعارے کے بارے میں عربوں کا جو خیال تھا اس کو بھی پیش کیا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے: ''وإنما استعارت العرب المعنى لما ليس له إذا كان يقاربه, أو يدانيه أو يشبهه في بعض أحواله, أو كان سبباً من أسبابه, فتكون اللفظة المستعارة حينئذ لائقة في الشيء الذي استعيرت له وملائمة لمعناه''۔ ترجمہ: عربوں کی عادت تھی کہ وہ ان اشیا کا استعارہ لیتے تھے جو بعض احوال میں اس چیز کے مشابہ ہو، یا سبب میں وحدت پائی جاتی ہو، انہیں صورتوں میں مستعار لفظ مستعار لہ کے مناسب ہوتا ہے اور اس کے معنی کو ادا کرنے میں موزوں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ قاضی جرجانی (۳۶۶ھ) کی کتاب ''الوساطة بين المتنبي وخصومه'' اور ابن رشید قیروانی (۴۳۶ھ) کی ''العمدة'' اور ابو ہلال العسکری (۳۹۵ھ) کی ''الصناعتين: الكتابة والشعر'' وہ کتابیں ہیں جو فن نقد سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اس میں بلاغت کے مباحث عمومی طور پر اور علم بیان کے مباحث خصوصی طور پر پائے جاتے ہیں۔

علمائے فن بلاغت میں سب سے اہم نام شیخ عبدالقاہر جرجانی (۴۷۱ھ) کا ہے، انھوں فن بلاغت کے تطور وارتقا میں بہت نمایاں رول ادا کیا، ان کی دو کتابیں ''أسرار البلاغة'' اور ''دلائل الإعجاز'' آج بھی اس فن میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علم بلاغت کو تین حصوں میں تقسیم کرنے اور اس کے اصطلاحات اور قواعد وضوابط کو مستنبط کرنے میں ابو یعقوب یوسف بن محمد السکاکی (۶۲۶ھ) کا بہت اہم کردار ہے، اس فن میں ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''مفتاح العلوم'' ہے، یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ علم صرف واشتقاق دوسرا حصہ علم نحو اور تیسرا حصہ علم البلاغہ پر مشتمل ہے۔

5.5 معنی کی ادائیگی میں علم بیان کا اثر

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ علم بیان معنی کو ادا کرنے میں کیا رول ادا کرتا ہے، آیئے جان لیں کہ علم بیان کے اقسام کیا ہیں اور اس کے تحت کون سی بحثیں آتی ہیں؟ علم البیان کے تحت آنے والی بحثوں کو حسب ذیل اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱-تشبیہ	۲-مجاز لغوی
۳-استعارہ	۴-مجاز مرسل
۵-مجاز عقلی	۶-کنایہ

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ علم البیان میں ایک معنی کو مختلف طرق اور متعدد اسالیب میں ادا کرنے کا پورا میدان ہوتا ہے اس لیے کلام کی قوت اور وضاحت کے لیے حسب ضرورت طریقے اپنائے جاتے ہیں، چنانچہ کسی معنی کی ادائیگی تشبیہ کے ذریعہ زیادہ مؤثر ہوتی ہے تو کسی کی استعارہ یا کنایہ کے ذریعہ، کسی معنی کو مجاز مرسل کی شکل میں بیان کرنا زیادہ موزوں ہوتا ہے تو کسی کو مجاز عقلی کے قالب میں ڈھالنا زیادہ قرین قیاس ہوتا ہے۔

علم بیان مختلف انداز میں معانی پر اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ ایک وصف کو شعرا مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سخاوت اور دریا دلی کے وصف کو ہی دیکھ لیں کہ ممدوح کی اس خوبی کو شعرا نے کس خوب صورتی کے ساتھ مختلف انداز میں بیان کیا۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:

يريد الملوكُ مدَى جعفرٍ ولا يَصنَعُونَ كما يَصنَع

وليس بأوسَعِهِم في الغنى ولكنّ معروفَه أوسَع

ترجمہ: بادشاہ جعفر کے مقام کو پانا چاہتے ہیں، لیکن وہ کام نہیں کرتے جو (جعفر) انجام دیتا ہے، حالانکہ وہ مالداری میں ان سے بڑھ کر نہیں ہے، لیکن اس کے بھلائی کے کام ان سے زیادہ وسیع ہیں۔

ان اشعار میں اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار معنوی اعتبار سے نہایت بلیغ ہیں، حالانکہ اس میں شاعر نے کوئی تشبیہ یا مجاز کو استعمال نہیں کیا، بلکہ شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ دیگر بادشاہ ممدوح کی قدر ومنزلت کو دیکھ کر اس جیسا بننے کی تمنا کرتے ہیں اور اس کے مقام کو پانے کی خواہش کرتے ہیں، لیکن وہ یہ مقام ومنزلت کو پانے کے لیے سخاوت نہیں کرتے جیسا کہ ممدوح کرتا ہے، جب کہ ممدوح ان بادشاہوں سے زیادہ مالدار بھی نہیں ہے۔

اسی جود وسخا کے وصف کو ایک اور شاعر نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

كالبحر يقذف للقريب جواهراً جوداً ويبعث للبعيد سحائباً

ترجمہ: ممدوح سمندر کی طرح ہے جو قریب والوں کے لیے جواہرات پھینکتا ہے اور دور والوں کے لیے بادل بھیجتا ہے۔

اس شعر میں شاعر اپنے ممدوح کو سمندر سے تشبیہ دے رہا ہے اور لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح سمندر دور ونزدیک رہنے والے ہر فرد کو فائدہ پہنچاتا ہے، ٹھیک اسی طرح ممدوح کا بھی حال ہے، نزدیک والے بھی اس کی سخاوت سے اتنا ہی فیض یاب ہوتے ہیں جتنا کہ دور والے ہوتے ہیں۔

هو البحر من أيِّ النَّواحي أتيتَه فلُجَّتُهُ المعروفُ والجودُ ساحلُه

ترجمہ: ممدوح سمندر ہے پھر چاہے تم کسی بھی جانب سے اس کا ارادہ کرو، تو اس کی گہرائی احسان وبھلائی ہے اور اس کا ساحل جود وسخاوت ہے۔

اس شعر میں شاعر اپنے ممدوح کو سمندر سے تشبیہ نہیں دے رہا ہے، بلکہ اس کا دعوی ہے کہ ممدوح سمندر ہی ہے۔ جس طرح سمندر کی گہرائی میں لعل وگوہر چھپے ہوتے ہیں اور ماہر غوطہ خور ان کو سمندر سے نکالتا ہے اور جس طرح سمندر اپنے ساحل پر رہنے والوں کے لیے بھی فائدہ پہنچاتا ہے، ٹھیک اسی طرح ممدوح کی بھی حالت ہے کہ اس کی سخاوت ہر عام وخاص کے لیے یکساں ہے۔

عَلَا فَمَا يَسْتَقِرُّ المالُ في يده وكيف تمسک ماءً قُنَّةُ الجبل

ترجمہ: وہ بلند ہوا تو مال اس کے ہاتھ میں نہیں ٹھہرتا اور پانی پہاڑ کی چوٹی پر کیسے رک سکتا ہے۔

اس شعر میں شاعر اپنے ممدوح کو جود وسخا سے متصف بتا رہا ہے، لیکن اس کا انداز بالکل مختلف ہے، اس کا ممدوح اتنا سخی ہے کہ اس کے پاس مال باقی نہیں رہتا (اس لیے کہ وہ محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم ہوجاتا ہے)، ممدوح سخی بھی ہو اور اس کے پاس مال بھی ختم ہوجائے؟ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے شاعر نے دوسرا مصرعہ بیان کیا، گویا اس کا ممدوح اس پہاڑ کی چوٹی کے مانند ہے جس پر پانی نہیں ٹھہرتا بہہ جاتا ہے، اسی طرح اس کے ممدوح کے پاس جب بھی مال آتا ہے تو وہ خرچ ہوجاتا ہے۔

ان تمام اشعار میں غور کرنے سے معلوم ہوا کہ سخاوت اور دریا دلی کے وصف کو متعدد شعرا نے مختلف پیرایہ بیان میں پیش کیا اور اس پیش کش میں بعض معانی دوسرے بعض معانی سے زیادہ واضح ہیں اور دلوں میں اثر انداز ہونے میں بھی یہ معانی متفاوت ہیں، یہی علم بیان کا اصل مقصود و مدعا ہے۔

5.5.1 علم المعانی اور علم البدیع کے مقابلے علم البیان کی انفرادیت

علم بلاغت کے تینوں اقسام موقع و محل کے لحاظ سے کلام کو زبان و بیان کی خوبیوں سے آراستہ کرتے ہیں لیکن ان میں علم البیان کی اہمیت بقیہ دونوں اقسام پر اس لحاظ سے بڑھ جاتی ہے کہ اس کے تحت آنے والے موضوعات ایک ہی معنیٰ کو مختلف طریقوں سے ادا کرنے کا میدان فراہم کرتے ہیں جس سے کلام کو حسب ضرورت واضح ترین اسلوب میں پیش کرکے متکلم اپنی بات کو زیادہ موٴثر اور نافع بنا سکتا ہے، جب کہ علم المعانی میں متکلم اپنی بات کو ادا کرنے کے لیے موقع و محل کا خاص لحاظ کرتے ہوئے بہ تقاضائے ضرورت کلام کے متعین اصولوں سے صرف نظر کرکے ان سے مطلوبہ معنیٰ حاصل کرتا ہے۔ اس علم کے تحت آنے والی بحثوں کا تعلق زیادہ تر الفاظ کے معانی سے ہوتا ہے جن کو حاصل کرنے کے لیے متکلم کلام کی ترکیبی خصوصیات کا سہارا لیتا ہے اور اپنے مقصد کے مطابق ان کا استعمال کرتا ہے۔ ان دونوں علوم کے برخلاف علم البدیع کلام کے لفظی و معنوی دونوں ہی میدانوں کا احاطہ کرتا ہے اسی لیے اس کے دو حصے یعنی محسنات لفظیہ اور محسنات معنویہ کلام میں حسن و جمال پیدا کرنے اور اس کو زور و قوت سے مالا مال کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

5.6 تشبیہ کی تعریف

5.6.1 تشبیہ کی لغوی تعریف

ابن فارس نے (شَبِہَ) کے تحت لکھا ہے کہ شین، با اور ہا یہ کسی چیز کی مشابہت اور اس سے رنگ اور وصف میں مماثلت پر دلالت کرتے ہیں (**معجم مقاییس اللغة: مادة: شَبِہَ**)

5.6.2 تشبیہ کی اصطلاحی تعریف

علمائے بلاغت نے تشبیہ کی مختلف تعریفیں کی ہیں، ان تعریفوں کا ہم یہاں مختصر جائزہ لیں گے۔ ابن رشیق قیروانی نے "**العمدة**" میں تشبیہ کی تعریف اس طرح کی ہے: "**اَلتَّشبِیهُ: صِفَةُ الشَّيءِ بِمَا قَارَبَهُ وَ شَاكَلَهُ مِن جِهَةٍ وَاحِدَةٍ أَو جِهَاتٍ كَثِيرَةٍ، لَا مِنْ جَمِيعِ جِهَاتِهِ، لِأَنَّهُ لَو نَاسَبَهُ مُنَاسَبَةً كُلِّيَّةً لَكَانَ إِيَّاه**"۔ (تشبیہ: کسی چیز کی صفت اس چیز سے بیان کرنا جو اس سے ایک یا کئی جہتوں سے مشابہت اور مماثلت رکھتی ہو، ہر جہت سے اس شئے کا مماثل ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ چیز دوسری چیز سے کلی مناسبت رکھتی ہو تو پھر وہ بھی اسی کے حکم میں ہوگی)۔ اس کی مثال عرب کا یہ قول ہے: "خد کالورد" (گلاب کی طرح گال) اس تشبیہ میں وہ صرف گلاب کی پتیاں اور اس کی تازگی کو ہی مراد لیتے ہیں، اس کے علاوہ اس کی ڈالی یا اس کی کلی وغیرہ کو مراد نہیں لیتے۔

خطیب قزوینی نے تشبیہ کو اس طرح بیان کیا ہے: "**التَّشْبِيهُ: هُوَ الدَّلَالَةُ عَلَى مُشَارَكَةِ أَمْرٍ لِأَمْرٍ فِيْ مَعْنًى**"۔ (تشبیہ: ایک امر کا دوسرے امر کے لیے معنوی طور پر مشارکت پر دلالت کا نام ہے) (تلخیص المفتاح)۔

امام تنوخی نے تشبیہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ''التَّشْبِيهُ : هُوَ الإِخْبَارُ بِالشَّبَهِ, وَهُوَ اِشْتِرَاکُ الشَّيْئَيْنِ فِي صِفَةٍأَو أَكثَرَ وَلَا يَسْتَوعِبُ جَمِيْعَ الصِّفَاتِ''۔ (تشبیہ: مشابہت کی خبر دینے کا نام ہے؛ بایں طور کہ دو چیزیں ایک یا ایک سے زائد صفت میں مشترک ہوگئیں، تمام صفات کا احاطہ ضروری نہیں)(کتاب الأقصی القریب)۔

مذکورہ بالا تمام تعریفوں کو سامنے رکھ کر بعد کے علمائے بلاغت نے ایک جامع تعریف بیان کی ہے جس میں ان تمام تعریفات کا احاطہ ہوتا ہے، وہ تعریف درج ذیل ہے:

''التَّشْبِيهُ :بَيَان أَنَّ شَيْئاًأَو أَشْيَاءَ شَارَكَتْ غَيْرَهَا فِي صِفَةٍأَوْ أَكْثَرَ, لِأَدَاةٍهِيَ الكَافُ أَوْ نَحْوُهَا مَلْفُوْظَةًأَوْ مُقَدَّرَةً''۔

(تشبیہ: اس بات کے بیان کرنے کو کہتے ہیں کہ ایک چیز یا چند چیزیں دوسری چیز کے ساتھ ایک صفت یا زیادہ صفتوں میں شریک ہیں، حرف تشبیہ کاف یا اس کے مماثل حروف کے ذریعہ، وہ ادات تشبیہ چاہے لفظوں میں مذکور ہو یا لفظوں میں نہ ہو لیکن ملحوظ ہو)۔

5.6.3 تشبیہ کے ارکان

تشبیہ کے جملہ چار ارکان ہیں: ١۔مشبہ ٢۔مشبہ بہ (یہ دونوں تشبیہ کے طرفین کہلاتے ہیں) ٣۔ادات تشبیہ (حروف جیسے: کاف، كأن۔ اسم جیسے: مثل، شبه، شبیه یا اس کے ہم معنی الفاظ اور فعل جیسے: حسب، ظن، خال اور اس کے ہم معنی افعال جو مشابہت اور مماثلت پر دلالت کرتے ہیں) ٤۔وجہ شبہ (وہ صفت یا صفات جو طرفین یعنی مشبہ اور مشبہ بہ میں جمع ہوں) انھیں چاروں ارکان کے ذریعہ تشبیہ کا عمل مکمل ہوتا ہے۔

تشبیہ کے ان ارکان کو ہم مثالوں کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں:

١-مُشَبَّهٌ: جس چیز کی تشبیہ دی جائے اسے مشبہ کہتے ہیں، مثلاً: زَيْدٌ كَالأَسَدِ فِي الشُّجَاعَةِ میں زید مشبہ ہے جس کی تشبیہ الأسد سے دی گئی ہے۔

٢-مُشَبَّهٌ بِهِ: جس چیز سے تشبیہ دی جائے وہ مشبہ بہ کہلاتی ہے جیسے اوپر کی مثال میں الأسد مشبہ بہ ہے جس سے زید کو تشبیہ دی گئی ہے۔

٣-وَجه الشَّبَهُ: جس صفت میں مشابہت بتائی جائے وہ وجه الشَّبَه کہلاتی ہے جیسے اوپر کی مثال میں الشجاعة یعنی بہادری کی صفت میں زید کی تشبیہ أسد سے دی گئی ہے۔ یاد رکھیں کہ وجہ شبہ یعنی صفت تشبیہ مشبہ کے مقابلہ میں مشبہ بہ میں زیادہ ہوتی ہے۔

٤-أَدَاةتشبيه: جن الفاظ کے ذریعہ تشبیہ دی جائے انھیں اداۃ تشبیہ کہتے ہیں جیسے اوپر کی مثال میں ''ک'' اداۃ تشبیہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

مندرجہ ذیل مثالوں سے ہم تشبیہ اور اس کے ارکان سے مزید واقفیت حاصل کریں گے:

مثال نمبر ١:

أَنتَ كَالْبَحْرِ فِي السَّمَاحَةِ وَالشَّمسِ علواً وَالبدرِ فِي الْإِشْرَاقِ

ترجمہ: آپ سخاوت میں سمندر کی طرح، بلندی میں آفتاب کی طرح اور چمک دمک میں چاند کی طرح ہو۔

اس شعر میں شاعر اپنے ممدوح کی سخاوت اور داد و دہش کی کثرت کو بیان کرنا چاہا تو اس نے دیکھا کہ اس داد و دہش کی وسعت سمندر میں پائی جاتی ہے اور ممدوح کی اس صفت کو بیان کرنے کے لیے مشبہ بہ اس سے زیادہ موزوں نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح وہ اپنے ممدوح کے مقام و مرتبہ کی

بلندی کو بتلانے کے لیے جب اپنے اطراف چیزوں کا جائزہ لیا تو اس کو اس صفت میں آفتاب سے زیادہ موزوں کوئی چیز نظر نہیں آئی اور اخیر میں جب اس نے اپنے ممدوح کی چمک دمک اور رونق و جمال کو بیان کرنے کے لیے چاند سے زیادہ موزوں کوئی اور لفظ نہیں پایا لہذا اس نے ان تینوں چیزوں سے اپنے ممدوح کو تشبیہ دی۔ اس شعر میں البحر ، الشمس اور البدر مشبہ بہ ہیں اور أنت ضمیر مشبہ ہے، السماحة، علواً ، في الإشراق وجہ شبہ ہیں اور کاف حرف ادات ہے۔

مثال نمبر ۲:

كَلَامُ فُلَانٍ كَالشَّهدِ فِي الحَلَاوَةِ (فلاں کی بات مٹھاس میں شہد کی طرح ہے)۔ اس مثال میں کلام کو چونکہ شہد سے تشبیہ دی جارہی ہے لہذا وہ مشبہ ہے اور شہد مشبہ بہ ہے اور حلاوۃ یعنی مٹھاس وہ صفت ہے جو ان دونوں چیزوں میں مشترک ہے لہذا وہ وجہ شبہ اور کاف حرف شبہ ہے۔

مثال نمبر ۳:

قَالَ أَعْرَابِيٌّ فِي وَصفِ رَجُلٍ : كَانَ لَهُ عِلمٌ لَا يُخَالِطُهُ جَهلٌ ، وَصِدقٌ لَا يَشُوْبُهُ كِذبٌ ، وَكَانَ فِي الْجُودِ كَأَنَّهُ الْوَبلُ عِنْدَ الْمَحلِ (ایک دیہاتی شخص نے ایک آدمی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا: اس کے پاس ایسا علم ہے جس میں جہالت کی آمیزش نہیں ہے اور ایسی سچائی ہے جس میں جھوٹ کی ملاوٹ نہیں ہے اور وہ سخاوت میں ایسا ہے گویا قحط سالی میں موسلا دھار بارش)۔ اس مثال میں جملے کا آخری جز تشبیہ سے متعلق ہے، اس جملے میں کان میں جو ھو ضمیر ہے وہ مشبہ ہے، الوبل مشبہ بہ ہے، في الجود وجہ شبہ اور کأن حرف ادات ہے۔

☆ معلومات کی جانچ:

۱۔ مختلف علمائے بلاغت نے جو تشبیہ کی تعریف بیان کی ہیں ان کو تحریر کیجیے۔

۲۔ ارکان تشبیہ کیا ہیں؟ اور کون کون سے ہیں؟ مع امثلہ بیان کیجیے۔

۳۔ آنے والی مثالوں میں تشبیہ کے ارکان کو متعین کیجیے۔

۱۔ جاؤوا علی خیل کأن أعناقها في الشهرة أعلام، وآذانها في الدقة أطراف أقلام

۲۔ أقوال الملوک کالسیوف المواضي في القطع والبت في الأمور

۳۔ أنت کالشمس في الضیاء وإن جا   وزت کیوان في علو المکان

۴۔ أنت کاللیث في الشجاعة والإقدام   والسیف في قراع الخطوب

5.7 ارکان تشبیہ کا حذف و ذکر

شاعر یا ادیب اپنے کلام میں تشبیہ کا استعمال اس لیے کرتا ہے تاکہ ممدوح کی تعریف میں مبالغہ آرائی کرسکے۔ علمائے بلاغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مشبہ مشبہ بہ سے جس قدر مماثلت اور مشابہت رکھے گا اتنا ہی معنی میں حسن اور مبالغہ پیدا ہوگا، تشبیہ میں ادات تشبیہ کا وجود اس بات کا غماز ہوتا ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں فرق ہے اور یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، لیکن اگر تشبیہ میں حرف ادات کو حذف کردیا جائے تو اس صورت میں شاعر یا ادیب یہ دعوی کرتا ہے کہ اس کا ممدوح مشبہ بہ کی طرح نہیں بلکہ عین مشبہ بہ ہے۔ اسی طرح کلام میں وجہ شبہ کا وجود اس بات کو بتاتا ہے کہ مشبہ صرف

اس خاص صفت میں مشبہ بہ کی طرح ہے، مشبہ کا مشبہ بہ کی دوسری صفتوں میں شریک ہونا ضروری نہیں۔اس کے برخلاف کلام میں جس وقت وجہ شبہ مذکور نہیں ہوتا اس وقت شاعر یا ادیب گویا یہ دعوی کرتا ہے کہ مشبہ تمام صفات میں مشبہ بہ کی طرح ہے۔ جیسے کہا جائے: زَيْدٌ كَرِيمٌ (زید سخی ہے)، یہ ایک سادہ سا جملہ ہے جس میں زید کے سخی ہونے کی خبر دی جارہی ہے، اگر زید کی سخاوت میں مبالغہ کرنا مقصود ہوگا تو اس جملہ میں تشبیہ کو استعمال کرتے ہوئے یہ کہا جائے گا: زَيْدٌ كَالْبَحْرِ فِي الْعَطَاءِ (زید سخاوت میں سمندر کی طرح ہے) اس جملہ میں زید کی سخاوت کو سمندر سے تشبیہ دی گئی ہے، مقصود یہ ہے کہ جس طرح سمندر تاحد نگاہ وسیع ہوتا ہے اسی طرح زید کی سخاوت بھی وسیع اور لامحدود ہے۔اس جملہ میں زید مشبہ ہے، البحر مشبہ بہ ہے، حرف کاف ادات تشبیہ ہے اور فِي الْعَطَاءِ وجہ شبہ ہے۔ادات تشبیہ کی وجہ سے زید کی سخاوت کا اندازہ تو ہو رہا ہے لیکن یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ یہ دونوں (مشبہ، مشبہ بہ) الگ الگ چیزیں ہیں، اسی طرح سمندر کے بے شمار صفات ہو سکتے ہیں، لیکن فِي الْعَطَاءِ کا لفظ لا کر زید کو صرف سمندر کی عطاء کی صفت میں محدود کر دیا گیا ہے۔

اگر جملہ میں حرف ادات کو حذف کر کے یہ کہا جائے: زَيْدٌ بَحْرٌ فِي الْعَطَاءِ (زید سخاوت میں سمندر ہے) اس صورت میں ہمارا یہ دعوی ہوگا کہ زید اور بحر ایک ہی چیز ہیں، ان دونوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔تشبیہ کے بعض ارکان کا یہ حذف و ذکر مبالغے کی غرض سے ہوتا ہے، ایسی صورت میں ان کو الگ الگ ناموں سے جانا جاتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

5.7.1 ادات تشبیہ کے حذف وذکر کے اعتبار سے تقسیم

ادات تشبیہ کے ذکر و حذف کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں:

☆ تشبیہ مرسل

وہ تشبیہ ہے جس میں ادات تشبیہ مذکور ہوں، یعنی حرف تشبیہ کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہو، جیسے: زُرْنَا حَدِيقَةً كَأَنَّهَا الفِرْدَوْسُ فِي الْجَمَالِ وَالْبَهَاءِ (ہم نے ایک ایسے باغ کو دیکھا جو اپنے رونق و جمال میں بہشت ہے)

اس مثال میں ''كأن'' ادات تشبیہ ہے جو جملہ میں مذکور ہے، اس لیے اس کو تشبیہ مرسل کہا جائے گا۔''تشبیہ مرسل'' کی مزید مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ فَجَعَلَهُم كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (پس انہیں کھائے ہوئے بھونسے کی طرح کردیا) اس مثال میں کاف حرف ادات جملے میں مذکور ہے اسی لیے اس کو تشبیہ مرسل کہا جاتا ہے۔

۲۔ سَابِقُوْا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے) اس مثال میں کاف حرف تشبیہ ہے اور عبارت میں مذکور ہے، لہذا یہ ''تشبیہ مرسل'' ہے۔

۳۔ أَنَا كَالمَاءِ إِنْ رَضِيتُ صَفَاءً وَإِذَا مَا سَخِطْتُ كُنْتُ لَهِيباً

ترجمہ: میں اگر خوش ہو جاؤں تو صفائی میں پانی کی طرح ہوں اور جب ناراض ہو جاؤں تو میں آگ کا شعلہ ہوں۔

ان تمام مثالوں میں آپ دیکھیں گے کہ ان میں ادات تشبیہ مذکور ہیں، لہذا یہ تمام مثالیں تشبیہ مرسل کی ہیں۔

☆ تشبیہ مؤکد

وہ تشبیہ ہے جس میں ادات تشبیہ محذوف ہوں، اس حذف کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ متکلم اس بات پر زور دے رہا ہوتا ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں مشابہت بہت زیادہ ہے۔ جیسے: أَنتَ نَجمٌ فِي الضِّيَاءِ وَ الرِّفعة (تم روشنی اور بلندی میں ستارے ہو) یعنی ستارے کی طرح نہیں بلکہ خود ستارہ ہو کہہ کر بات میں زور پیدا کیا ہے۔ اور کلام میں یہ زور اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کیونکہ اس میں ادات تشبیہ مذکور نہیں ہیں۔ اصل عبارت ہوگی أَنتَ كَالنَّجمِ فِي الضِّيَاءِ۔ تشبیہ مؤکد کی مزید مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اَلعَالِمُ سِرَاجُ أُمَّتِهِ فِي الهِدَايَةِ وَتَبدِيدِ الظَّلَامِ (عالم دین اپنی قوم کے لیے ہدایت اور تاریکی کو دور کرنے میں چراغ ہے) اس مثال میں ادات تشبیہ مذکور نہیں ہے، اس لیے اس کو تشبیہ مؤکد کہا جائے گا۔ اصل عبارت ہوگی اَلعَالِمُ كَسِرَاجِ أُمَّتِهِ۔

۲۔ ﴿وَتَرَى الجِبَالَ تَحسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ﴾ (آج آپ پہاڑوں کو دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خوب جمے ہوئے ہیں، مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے) اس مثال میں آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ادات شبہ کہیں مذکور نہیں ہے۔ محذوف عبارت اس طرح ہوگی: (وَهِيَ تَمُرُّ كَمَرِّ السَّحَابِ)

۳۔ أَنتَ نَجمٌ فِي رِفعَةٍ وَضِيَاءٍ تَجتَلِيكَ العُيُونُ شَرقاً وَغَربَا

ترجمہ: بلندی اور روشنی میں آپ ستارہ ہیں، آپ کو نگاہیں مشرق و مغرب میں دیکھ سکتی ہیں۔

اس شعر کی اصل عبارت أنت كالنجم ہے، ممدوح عین مشبہ بہ ہے، یہ بتلانے کے لیے شاعر نے حرف ادات حذف کر دیا ہے۔

۴۔ اَلمَالُ سَيفٌ نَفعاً وَضَرّاً (مال نفع اور نقصان میں تلوار ہے)۔ اس مثال میں مال کو تلوار قرار دیا گیا ہے لیکن اس میں ادات تشبیہ مذکور نہیں ہے، لہذا یہ تشبیہ مؤکد ہوگی۔ اصل عبارت ہوگی أنت كالسيف نفعاً و ضراً۔

5.7.2 وجہ شبہ کے حذف و ذکر کے لحاظ سے تقسیم

وجہ شبہ کے ذکر و حذف کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں:

☆ تشبیہ مفصل

وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ مذکور ہو، جیسے: اَلقُلُوبُ كَالطَّيرِ فِي الأُلُوفَةِ إِذَا أَنِسَتْ (دل الفت و محبت میں پرندوں کی طرح ہیں جب وہ مانوس ہو جائیں) اس مثال میں في الألوفة وجہ شبہ ہے جو جملے میں مذکور ہے، اس لیے اس کو تشبیہ مفصل کہتے ہیں۔ تشبیہ مفصل کی مزید مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ کیجیے:

۱۔ اَلمَالُ سَيفٌ نَفعاً وَضَرّاً (مال نفع اور نقصان میں تلوار کی طرح ہے)۔ اس مثال میں مال کو تلوار قرار دیا گیا ہے لیکن اس میں ادات تشبیہ مذکور نہیں ہے، لہذا یہ تشبیہ مؤکد ہوگی۔ اسی طرح اس مثال میں وجہ شبہ بھی مذکور ہے اس لیے یہی مثال تشبیہ مفصل کی بھی بن رہی ہے۔

۲۔ قُصُورٌ كَالكَوَاكِبِ لَامِعَاتٌ يَكَدنَ يُضِئنَ لِلسَّارِي الظَّلَامَا

ترجمہ: محلات چمک میں ستاروں کی طرح ہیں، قریب ہے کہ وہ چلنے والے کے لیے تاریکی کو روشن کرے۔

شاعر یہاں پر ان محلات کی تعریف کرنا چاہتا ہے جن کو روشنیوں نے بقعہ نور بنا دیا ہے اور ان کی چمک اور روشنی اس قدر زیادہ ہے کہ وہ رات میں چلنے والے راہ گزر کی تاریکی کو روشنی میں بدل دیتے ہیں۔ اس شعر میں قصور مُشبہ اور الکواکب مشبہ بہ ہے اور لامعاتٌ وجہ شبہ ہے جو شعر میں مذکور ہے، لہذا یہ تشبیہ مفصل ہے۔

☆ تشبیہ مجمل

وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ مذکور نہ ہو۔ جیسے: اَلْحِمْيَةُ مِنَ الْأَنَامِ كَالْحِمْيَةِ مِنَ الطَّعَامِ (مخلوق سے پرہیز ایسا ہے جیسے کھانے سے پرہیز) اس مثال میں اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں وجہ شبہ مذکور نہیں ہے۔

1۔ وكَأَنَّ الشَّمسَ المُنيرَةَ دِيْ نَارٌ جلته حدائدُ الضَّرَاب

ترجمہ: گویا کہ روشن سورج ایک دینار ہے جس کو ڈھالنے والے کی چوٹوں نے صیقل کر دیا ہے۔

اس مثال میں ابن المعتز طلوع ہونے کے وقت سورج کو ایسے صاف شفاف دینار سے تشبیہ دے رہا ہے جس کے ڈھالے جانے کا زمانہ قریب ہو (یعنی ابھی ابھی ڈھالا گیا ہو) لیکن اس نے بھی وجہ شبہ کو ذکر نہیں کیا اور وہ وجہ شبہ زرد ہونا اور چمکدار ہونا ہے اور اس قسم کی تشبیہ جس میں وجہ شبہ مذکور نہ ہو اس کو تشبیہ مجمل کہتے ہیں۔

2۔ إِنَّ السُّيُوْفَ مَعَ الذِيْنَ قُلُوبُهُمْ كَقُلُوبِهِنَّ إِذَا الْتَقَى الْجَمْعَانُ
تَلْقَى الْحُسَامُ عَلَى جَرَاءَةِ حدّه مِثْلَ الْجَبَان بِكَفِّ كُلِّ جَبَان

ترجمہ: بے شک تلواریں ان کے ساتھ ہوتی ہیں جن کے دل تلواروں کے دل کی طرح (مضبوط/فیصلہ کن) ہوں جب دو لشکر آمنے سامنے آجائیں۔ تو تلوار کو اس کی تیزی کے باوجود بزدل کے ہاتھ میں بزدل ہی پائے گا۔

شاعر اس شعر میں اس حقیقت کو بتلا رہا ہے جس کی بنا پر معرکے سر کیے جاتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ تلواریں انھیں لوگوں کے ہاتھ میں کام کرتی ہیں جن کے دلوں میں خوف نہ ہو اور وہ لوگ اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے برخلاف اگر تیز تلوار بزدل کے ہاتھ میں آجائے تو وہ تلوار بھی اپنی تیزی کے باوجود کند اور بے فائدہ اور بے کار ہو جاتی ہے جس طرح کے ایک بزدل اپنی فوج کے لیے غیر کارگر اور ناکارہ ہوتا ہے۔

ان دونوں شعروں میں شاعر نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تشبیہ کا سہارا لیا ہے، چنانچہ وہ بہادر سپاہیوں کے دلوں کو (یعنی **قلوبھم**) کو **قلوبھن** (ان تلواروں کے دلوں) سے تشبیہ دے رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں ''**الحسام بکف الجبان**'' میں ''**حسام**'' لفظ مشبہ ہے اور ''**مثل الجبان**'' میں ''**الجبان**'' مشبہ بہ ہے، جب کہ ''**مثل**'' کلمہ ادات تشبیہ ہے۔

ان دونوں اشعار میں پھر ایک مرتبہ اگر ہم غور کریں اور یہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں کہ آخر کس صفت (وجہ شبہ) میں مشبہ اور مشبہ بہ مشترک ہیں، تو ہمیں پتہ چلے گا کہ شاعر نے دونوں وجہ شبہ کو ذکر نہیں کیا ہے اور جس تشبیہ میں وجہ شبہ محذوف ہوتا ہے اسے تشبیہ مجمل کہتے ہیں۔

یاد رکھیے کہ اگر ادات تشبیہ مذکور ہو تو اسے تشبیہ مرسل کہتے ہیں اور ادات تشبیہ مذکور نہ ہو تو اسے تشبیہ مؤکد کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر وجہ شبہ مذکور ہو تو اسے تشبیہ مفصل کہتے ہیں اور اگر وجہ شبہ مذکور نہ ہو تو اسے تشبیہ مجمل کہتے ہیں اور اگر ادات شبہ اور وجہ شبہ دونوں محذوف ہو تو اسے تشبیہ بلیغ کہتے ہیں جو حسب ذیل ہے:

☆ تشبیہ بلیغ

وہ تشبیہ ہے جس میں ادات شبہ اور وجہ شبہ دونوں محذوف ہوں اور محض طرفین تشبیہ یعنی مشبہ اور مشبہ بہ مذکور ہوں۔ اس سے یہ باور کرانا مقصود ہوتا ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ گویا دونوں ایک ہی ہیں۔ جیسے:

1۔ **الإسلام حیاتنا** (اسلام ہماری زندگی ہے) اس مثال میں اسلام کو زندگی سے تشبیہ دی گئی ہے، اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسلام کی ہدایت کے بغیر زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے، اس بات میں وزن اور زور پیدا کرنے کے لیے اس جملے میں ادات شبہ اور وجہ شبہ دونوں کو حذف کر دیا گیا ہے تاکہ معنی میں تاکید پیدا ہو جائے۔

2۔ إِذَا الدَّوْلَةُ اسْتَكْفَتْ بِهِ فِي مُلِمَّةٍ　　فَكَأَنَّهَا كَانَ السيفَ والكفَّ والقَلْبَا

ترجمہ: جب سلطنت ممدوح سے کسی حادثہ میں مدد مانگتی ہے، تو وہ کافی ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ تلوار ہاتھ اور دل بن جاتا ہے۔

3۔ متنبی شاعر نے کافور کی مدح میں کہا:

إِذَا نِلْتُ مِنْكَ الْوُدَّ فَالْمَالُ هَيِّنٌ　　وَكُلُّ الذِىْ فَوْقَ التُّرَابِ تُرَابُ

ترجمہ: جب مجھے آپ کی محبت حاصل ہوگئی تو مال تو معمولی چیز ہے اور مٹی کے اوپر کی ہر چیز مٹی ہے۔

اس مثال میں (وکل الذي فوق التراب) مشبہ ہے اور (تراب) مشبہ بہ ہے اور اس میں وجہ شبہ محذوف ہے۔

5.8 تشبیہ کی مزید قسمیں

اس سے پہلے ہم نے تشبیہ کے ان اقسام کو پڑھا جن میں ادات شبہ اور وجہ شبہ کے حذف و ذکر کے اعتبار سے تقسیم تھی، اب یہاں سے ہم تشبیہ کی مزید اقسام کو پڑھیں گے، جن میں مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ شبہ کے تعدد کے اعتبار سے تقسیم ہوگی۔ ہمیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ بیشتر مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کلام میں حسن پیدا کرنے کے لیے شاعر یا ادیب ارکان تشبیہ کو متعدد طریقوں سے استعمال کرتا ہے، کبھی ارکان تشبیہ مفرد ہوتے ہیں اور کبھی متعدد ہوتے ہیں اور بسا اوقات طرفین تشبیہ صراحتاً مذکور نہیں ہوتے بلکہ ضمناً ان کا ذکر ہوتا ہے، یہ سارے طریقہ کار اس لیے ہیں کہ کلام میں حسن دوبالا ہو جائے اور مخاطب کے دل پر اثر انداز ہو۔ ان تمام چیزوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے علمائے بلاغت نے تشبیہ کی مزید اقسام بیان کی ہیں، جن کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

5.8.1 تشبیہ کی مزید چار قسمیں ہیں

☆ تشبیہ مفرد

وہ تشبیہ ہے جس میں مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ شبہ تینوں مفرد ہوں، یعنی اس میں کسی مفرد چیز کی تشبیہ کسی مفرد چیز سے دی گئی ہو۔ جیسے: اللہ تعالی کا فرمان:

1۔ (وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ) اس مثال میں اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں مشبہ موج مفرد اور مشبہ بہ جبال بھی مفرد ہے اور وجہ شبہ الارتفاع و **العظم** (بلندی اور ضخامت) ہے اور یہ بھی مفرد ہے۔

2۔ والمرء کالظِّلِّ ولا بُدَّ أن یزُول ذاك الظِّلِّ بعد امتداد

ترجمہ: انسان سایے کی طرح ہے اور وہ سایہ پھیلنے کے بعد لازمی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔

اسم مثال میں "المرء" مشبہ ہے، "الظل" مشبہ بہ ہے اور وجہ شبہ "الزوال" ہے اور یہ سب کے سب مفرد ہیں۔

3۔ اَلْمَاءُ مِثْلُ اللُّجَیْنِ فِي الصَّفَاءِ (پانی صفائی کے اعتبار سے چاندی کی طرح ہے) اس میں "الماء" مشبہ ہے اور مفرد ہے، اس کی تشبیہ "اللجین" یعنی چاندی سے دی گئی ہے یہ بھی مفرد ہے اور وجہ شبہ "الصفاء" ہے یہ بھی مفرد ہے، گویا اس میں تمام چیزیں مفرد ہیں لہٰذا ایسی تشبیہ کو تشبیہ مفرد کہا جاتا ہے۔

☆ تشبیہ تمثیل

ایسی تشبیہ جس میں ایک منظر کی تشبیہ دوسرے منظر سے دی گئی ہو اور وجہ شبہ متعدد چیزوں سے ماخوذ کوئی صورت ہو۔ جیسے:

1۔ وَکَأَنَّ الهِلَالَ نُوْنُ لُجَیْنٍ غَرِقَتْ فِي صَحِیْفَةٍ زَرْقَاءَ

ترجمہ: (نیلگوں آسمان میں نیا چاند ایسا ہی ہے جیسے چاندی کا نون (حرف نون) نیلے رنگ کی پلیٹ میں ڈبو دیا گیا ہو)

اس میں ایک پورا منظر یعنی نیلے رنگ کا صاف آسمان ہے اس میں کمان نما نیا چاند نمودار ہوتا ہے تو اس کی مشابہت اس چاندی کے ڈھلے ہوئے نون سے دی جاتی ہے جس کو نیلے رنگ کی پلیٹ میں ڈبو دیا گیا ہو۔

اس تشبیہ میں مشابہت کسی مفرد شئے کی دوسری مفرد شئے سے نہیں بتائی گئی ہے بلکہ ایک پورا منظر "نیلے رنگ کے صاف آسمان میں کمان نما نئے چاند کا وجود" مشبہ ہے جس کی تشبیہ دوسرے منظر یعنی "نیلے رنگ کی صاف پلیٹ میں چاندی کے نون کے ڈوبے ہوئے ہونے" سے دی گئی ہے اور وجہ شبہ بھی کوئی مفرد صفت نہیں ہے بلکہ پورے منظر کا خلاصہ یعنی "ایک کمان نما سفید چیز کا نیلے رنگ کے صاف سطح پر ہونا" وجہ شبہ بنے گا۔

2۔ یَهُزُّ الْجَیْشُ حَوْلَكَ جَانِبَیْهِ کَمَا نَفَضَتْ جَنَاحَیْهَا الْعُقَابُ

ترجمہ: (تیرے دونوں جانب لشکر ایسے حرکت کر رہا ہے جیسے عقاب اپنے پروں کو ہلاتا ہے)

یہ شعر متنبی کا ہے جو اس نے سیف الدولہ کی تعریف میں کہا ہے، اس شعر میں اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شاعر کسی ایک چیز کی تشبیہ دوسرے چیز سے دینے کا ارادہ نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ ایک مجموعی حالت کو دوسری مجموعی حالت سے تشبیہ دینا چاہتا ہے، چنانچہ وہ سیف الدولہ کے لشکر کے میمنہ اور میسرہ کے درمیان کھڑے ہونے اور لشکر کے حرکت کرنے کی کیفیت بیان کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے اس نے عقاب پرندے کے پروں کے پھڑ پھڑانے کو مشبہ بہ بنایا ہے اور اس کی حالت و کیفیت سے سیف الدولہ کے اطراف لشکر کی حرکت کو تشبیہ دی ہے۔ اسی حالت کی تشبیہ کو "تشبیہ تمثیل" کہتے ہیں۔

☆ تشبیہ ضمنی

یہ وہ تشبیہ ہے جس میں طرفین تشبیہ صراحتاً مذکور نہیں ہوتے بلکہ سیاق کلام میں دونوں کو اشارۃً ذکر کیا جاتا ہے، جو کہ ضمناً سمجھ میں آتے ہیں، ایسی تشبیہ کو تشبیہ ضمنی کہتے ہیں۔ جیسے

لاتُنْکِرِيْ عَطَلَ الْکَرِیْمِ مِنَ الْغِنَی فَالسَّیْلُ حَرْبٌ لِلْمَکَانِ الْعَالِي

ترجمہ: (سخی آدمی کے مالداری سے خالی ہونے کو عیب کی بات نہ سمجھو، اونچی جگہ سیلاب کا پانی نہیں رکتا)

اس مثال میں شاعر ابوتمام کا مخاطب اس کی بیوی ہے، وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے کہ اگر کوئی آدمی شریف ہے لیکن مالدار نہیں ہے تو اس پر نکیر نہ کرو، اس لیے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ پہاڑ کی چوٹی جو کہ تمام جگہوں میں سب سے بلند ہوتی ہے، اس پر سیلاب کا پانی نہیں ٹھہرتا۔ اس مثال میں آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ابوتمام نے شریف آدمی جو مالدار نہیں ہے اس کو ضمناً تشبیہ دی ہے پہاڑ کی چوٹی سے جو سیلاب کے پانی سے خالی ہے، لیکن اس نے صراحتۂ تشبیہ کا مضمون نہیں رکھا، بلکہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مستقل جملہ لایا اور اس کے ضمن میں دلیل کی شکل میں اسی معنی کو ادا کیا۔

2۔ مَنْ يَهُنْ يَسْهُلُ الْهَوَانُ عَلَيْهِ مَا لِجُرْحٍ بِمَيِّتٍ إِيْلامُ

ترجمہ: (جو بے حیثیت ہوتا ہے اس پر ذلت برداشت کرنا آسان ہے، مردہ آدمی کو زخم سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی)۔

یہ شعر متنبی کا ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ جو شخص ذلت ورسوائی کا عادی ہوتا ہے اس کے لیے ذلت کو برداشت کرنا آسان ہوتا ہے اور اس کو اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور یہ دعوی باطل نہیں ہے اس لیے کہ مردہ آدمی کو جب زخم لگایا جائے تو اس کو تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ اس مثال میں اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں بغیر صراحت کے تشبیہ کا اشارہ ہے۔

☆ تشبیہ مقلوب

ایسی تشبیہ جس میں مبالغہ کی غرض سے مشبہ کو مشبہ بہ بنا کر الٹی تشبیہ دی جائے، جیسے:

1۔ كَأَنَّ ظَلامَ اللَّيلِ شِعرُهَا (رات کی تاریکی اس کے زلفوں کی طرح ہے)۔ اس مثال میں سیاہ زلفوں کی تشبیہ رات کی تاریکی سے دینے کے بجائے تشبیہ الٹ کر رات کی تاریکی کو سیاہ زلفوں سے تشبیہ دی ہے اور یہ معنی میں مبالغہ پیدا کرنے کے لیے کیا گیا ہے، ایسی تشبیہ کو تشبیہ مقلوب کہتے ہیں۔

2۔ محمد بن وھیب حمیری کا شعر:

وبداَ الصَّباحُ كأَنَّ غُرَّتَه وَجْهُ الخليفةِ حيْنَ يُمتَدَحُ

ترجمہ: (اور صبح نمودار ہوگئی اور صبح کی روشنی گویا کہ خلیفہ کا چہرہ ہے، جب اس کی تعریف کی جاتی ہے)۔

اس مثال میں شاعر حمیری صبح کی ابتدائی روشنی کو خلیفہ کے چہرے سے تشبیہ دے رہا ہے، جب خلیفہ کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس مثال میں آپ غور کیجیے اس میں صبح کی ابتدائی روشنی کو خلیفہ کے چہرے سے تشبیہ دی گئی ہے، حالانکہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ کسی چیز کو ہمیشہ ایسی چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے جو وجہ شبہ میں پہلی چیز سے مضبوط اور طاقتور ہو اور یہی معروف طریقہ ہے، لیکن ہم یہاں دیکھ رہے ہیں کہ یہ بالکل الٹا ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خلیفہ کے چہرے کو صبح کی روشنی سے تشبیہ دی جاتی اور یہ کہا جاتا کہ: خلیفہ کا چہرہ صبح کی روشنی کے مشابہ ہے، لیکن اس شعر میں شاعر نے تشبیہ کو الٹ دیا ہے اور وہ اس لیے کہ وہ اپنے دعوے میں مبالغہ پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ بتانا چاہتا ہے کہ وجہ شبہ مشبہ میں زیادہ قوی اور طاقتور ہے۔ اس طرح کی تشبیہ مقلوب کہلاتی ہے۔

3۔ ابن المعتز کا شعر:

والصُّبحُ في طُرَّةِ ليلٍ مسفرٍ كأنّه غُرَّةُ مُهرٍ أشْقَر

ترجمہ: (اور صبح روشن ہونے والی رات کے کنارے پر نمودار ہوئی، گویا وہ سرخ گھوڑے کی پیشانی کی سفیدی ہے)۔

اس مثال میں ''غرۃ مہر'' (سرخ گھوڑے کی پیشانی کی سفیدی) کو صبح سے تشبیہ دی جانے کے بجائے، خود صبح کو ''غرۃ مہر'' سے تشبیہ دی گئی ہے، گویا کہ شاعر نے مشہور طریقے سے ہٹ کر مبالغہ پیدا کرنے کے لیے تشبیہ کو پلٹ دیا ہے۔

5.9 تشبیہ کے اغراض

پچھلے مباحث سے ہم نے اندازہ کرلیا کہ کوئی ادیب یا شاعر تشبیہ کے اسلوب کو اختیار اس وجہ سے کرتا ہے کیونکہ یہ اسلوب مقصد کو واضح کرنے اور معنی مطلوب پر وضاحت کے ساتھ دلالت کرنے میں سب سے زیادہ کارگر اور معاون ہوتا ہے۔ تشبیہ کی اغراض مختلف قسم کی ہوتی ہیں، یہ اغراض بالعموم مشبہ کے اردگرد گھومتی ہیں لیکن بسااوقات اس کا مرجع مشبہ بہ بھی ہوتا ہے۔ تشبیہ کی چند اغراض درج ذیل ہیں:

1۔ **بیان إمکان المشبہ** (مشبہ کے ممکن ہونے کا بیان): یہ غرض اس وقت ہوتی ہے جب کہ مشبہ کی طرف ایک ایسے عجیب وغریب معاملے کی نسبت کردی جائے جس کی اجنبیت اس کے مثیل کے بغیر زائل نہ ہو پائے۔ جیسے بحتری کا یہ شعر:

دَانٍ إِلَي أَيْدِي العُفَاةِ وَشَاسِعٌ   عَنْ كُلِّ نِدٍّ فِي النَّدَى وَضَرِيْبِ

كَالْبَدْرِ أَفْرَطَ فِي الْعُلُوِّ وَضَوْؤُهُ   لِلعُصْبَةِ السَّارِيْنِ جِدُّ قَرِيْبِ

ترجمہ: (وہ ضرورت مندوں کے ہاتھوں سے بہت قریب ہے اور سخاوت میں ہر ہمسر و ہم پلہ سے بہت دور ہے، جیسے چاند بلندی میں بہت دور ہے اور اس کی روشنی رات میں چلنے والی جماعت سے بہت قریب ہے)۔

ان اشعار کے پہلے حصے میں بحتری اپنے ممدوح کی تعریف کر رہا ہے کہ وہ محتاجوں کے قریب ہے اور سخاوت میں اپنے ہم مثلوں سے بہت دور ہے، اس کے اور اس کے ہمسر کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے۔ بحتری کو جب احساس ہوا کہ اس نے اپنے ممدوح کو دو متضاد صفتوں (قرب اور بعد) سے متصف کر دیا تو اس نے دوسرے شعر میں اس بات کے ممکن ہونے کو بیان کیا ہے اور یہ ثابت کیا کہ ایک چیز ایک ہی وقت میں دور اور نزدیک ہوسکتی ہے اور اس میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ممدوح کو اس چاند سے تشبیہ دی جو بہت دور آسمان میں ہے، لیکن اس کی روشنی رات میں چلنے والوں کے لیے قریب ہے۔

تشبیہ کے امکان کو بیان کرنے کے لیے متنبی کا یہ شعر بھی پیش کیا جاسکتا ہے:

فَإِن تَفُقِ الْأَنَامَ وَأَنتَ مِنهُمْ   فَإِنَّ الْمِسْكَ بَعْضُ دَمِ الْغَزَالِ

ترجمہ: (تو ساری مخلوق پر فوقیت لے گیا اور تو انھیں میں سے ایک فرد ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ مشک ہرن کے خون کا حصہ ہوتا ہے)۔

اس شعر میں متنبی نے اپنے ممدوح کی نسبت یہ دعوی کیا کہ وہ اپنی اصل یعنی مخلوق سے جدا ہے اور چونکہ اس دعوے میں ظاہراً تضاد نظر آرہا ہے، اس لیے شاعر اپنے شعر کے دوسرے حصے میں ایک ایسی چیز سے استدلال کر رہا ہے جو یہ بتلا رہی ہے کہ کوئی چیز اپنی اصل سے الگ اور ممتاز بھی ہوسکتی ہے، جیسے مشک، جو کہ ہرن کے خون کا حصہ ہے لیکن اس کی قدر و قیمت اور خون کی حیثیت و قیمت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

2۔ **بیان حال المشبہ** (مشبہ کی حالت کو بیان کرنا): یہ غرض مشبہ کی حالت کو بتلانے کے لیے لائی جاتی ہے، جیسے نابغہ ذبیانی کا یہ شعر:

فَإِنَّك شَمْسٌ وَالْمُلُوكُ كَوَاكِبُ   إِذَا طَلَعَتْ لَمْ يَبْدُ مِنْهَا كَوكَبُ

ترجمہ: (توسورج ہےاور باقی بادشاہ ستارے ہیں، جب سورج طلوع ہوتا ہےتوکوئی ستارہ ظاہرنہیں ہوتا)۔

اس شعرمیں نابغہ اپنے ممدوح بادشاہ کی عظمت وسطوت دیگر بادشاہوں پر بیان کررہاہےاوروہ کہہ رہاہے کہ میرے ممدوح کی حالت دیگر بادشاہوں کے مقابلے میں ایسی ہی ہے جیسے سورج کی عظمت دیگر سیاروں کے درمیان ہے اور یہ کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے وہ سارے سیاروں کو مدھم کردیتاہے، اسی طرح میراممدوح ہے کہ جس کے سامنے سارے بادشاہوں کی سطوت وعظمت مدھم اور ماند پڑ جاتی ہے۔

اسی طرح متنبی کا یہ قول بھی بیان حال مشبہ کی مثال میں آتا ہے:

أرى كل ذي جودٍ إليَك مصيره   كأنک بحرٌ والملوکُ جداوِلُ

ترجمہ: (میں ہرسخی بادشاہ کا مرجع آپ ہی کو پاتا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ سمندر ہیں اوردوسرے بادشاہ چھوٹی نہریں ہیں)۔

اس مثال میں بھی متنبی اپنے ممدوح یعنی مشبہ کی دیگر بادشاہوں کے مقابلے میں حالت اورعظمت کو بیان کررہاہےاورمشبہ کی حالت کو بیان کرنا تشبیہ کے اغراض میں سے ہے۔

3۔ **بیان مقدار حال المشبہ** (مشبہ کی حالت کے مقدار کو بیان کرنا): یہ ایسی چیز کی حالت کے مقدار کو بیان کرنا ہے جومخاطب کے ذہن میں پہلے سے تھا لیکن اس کا تصوراجمالی طور پر معروف تھا، جیسے: عنترہ کا یہ شعر:

فِيهَا اثْنَتَانِ وَأَرْبَعُونَ حَلُوبَةً   سُوداً كَخَافِيَةِ الغُراب الأَسودِ

ترجمہ: (اس (محبوبہ) کے گھرمیں بیالیس دودھ سے لبالب کالی اونٹنیاں ہیں، جن کی سوادی کالے کوے کے پروں جیسی ہے)۔

عنترہ اس شعر میں اپنے محبوبہ کے گھرمیں پائے جانے والی فراوانی کوذکرکررہاہےاور کہہ رہاہے کہ اس کے بیالیس کالے اونٹنیوں پر مشتمل ریوڑ ہے، کالے اونٹنیوں کا ذکر اس لیے کیا کیونکہ اس قسم کے اونٹ عربوں کے پاس سب سے قیمتی مانے جاتے ہیں۔عنترہ ان کالی اونٹنیوں کے رنگ کی حالت کے مقدار کو بیان کرنے کے لیے کالے کوے کے پر کی تشبیہ کا سہارالیا ہےاورتشبیہ سے شاعر کی غرض مشبہ کے حالت کی مقدار کو بیان کرنا ہے۔یعنی جس قدر کوے کے پر کالے ہوتے ہیں اسی کے بقدر محبوبہ کے اونٹنیوں کا رنگ کالا ہے۔

متنبی کا یہ شعربھی اس غرض کو بیان کرنے کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے:

ما قُوبِلتْ عيناهُ إلَّا ظُنَّتَا   تحتَ الدُّجى نارَ الفَريقِ حُلُولاَ

ترجمہ: (اس (شیر) کی آنکھیں نہیں دیکھی گئیں مگر یہ سمجھا گیارات تاریکی میں اترنے والی جماعت کی آگ ہے)۔

متنبی اس شعرمیں شیر کے دونوں آنکھوں کی لالی اور چمک کو بیان کررہاہےاوروہ یہ کہہ رہاہے کہ شیر کی دوآنکھوں کو دور سے دیکھنے والا یہ گمان کرے گا کہ یہ مسافروں کی ایک جماعت رکی ہوئی ہےاوراس نے آگ جلائی ہے۔اس تشبیہ سے بھی متنبی کی غرض مشبہ کی حالت کے مقدار کو بیان کرنا ہے۔یعنی مسافرین رات میں آگ جلاتے ہیں اور یہ آگ دور سے نظر آتی ہے ٹھیک اسی طرح شیر کی آنکھ بھی اس قدر چمکدار ہوتی ہے کہ دور سے نظر آتی ہے۔

4۔ **بیان تقریر حال المشبہ** (مشبہ کی حالت کو ثابت کرنا): یہ غرض اس وقت لائی جاتی ہے جب کہ مشبہ کی طرف ایک ایسے امر کی اسناد

کردی جائے جس کو ثابت کرنے کی یا مثال سے وضاحت کرنے کی ضرورت پڑتی ہو، جیسے اللہ تعالی کا یہ قول: (وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ)۔ ترجمہ: وہ اللہ کے علاوہ جن ہستیوں کو پکارتے ہیں وہ ان کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں، ان کا پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر درخواست کرے کہ وہ میرے منہ تک پہنچ جائے، حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالی ان لوگوں کی حالت کو بیان فرمارہے ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو معبود بناتے ہیں اور ان سے حاجتیں طلب کرتے ہیں جب کہ یہ لوگ ان کی کسی بھی طرح سے مدد نہیں کر سکتے۔ اس بات کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے اور اس حالت کو ثابت کرنے کے لیے ان بت پرستوں کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی جو اپنا ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہیں تاکہ اس کو پی جائے جب کہ وہ پانی ان کے منہ تک نہیں پہنچتا۔

تشبیہ کی اس غرض میں یہ بات ذہن نشیں کرنے کی ہے کہ اس غرض کا استعمال ان ہی حالتوں میں ہوگا جب کہ مشبہ معنوی صورت میں ہو۔ کیونکہ انسان کی طبیعت میں ہے کہ وہ جس طرح حسی چیزوں کا یقین کرتا ہے معنوی چیزوں کا یقین نہیں کرتا اور اسی وجہ سے یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسی چیزوں کو ثابت کیا جائے۔

5۔ **تزيين المشبه أو تقبيحه** (مشبہ کو خوب صورت انداز میں یا قبیح انداز میں پیش کرنا): اس غرض میں مشبہ کو یا تو مزین کر کے پیش کیا جاتا ہے یا پھر اس کو قبیح طور پر پیش کیا جاتا ہے، جیسے: ابوالحسن الانباری سولی پر چڑھے اپنے ممدوح کے مرثیے میں کہتا ہے:

مَدَدْتَ يَدَيْكَ نَحْوَهُمْ احْتِفَاءً كَمَدِّهِمَا إِلَيْهِمْ بِالْهِبَاتِ

ترجمہ: (تو نے اپنے ہاتھوں کو ان کی طرف اعزاز و اکرام میں اس طرح پھیلایا ہے جیسا کہ وہ تحفے اور عطایا دینے کے لیے پھیلایا کرتے تھے)۔

یہ شعر ابوالحسن الانباری کے مشہور قصیدے سے ماخوذ ہے، جس میں اس نے ابو طاہر (جو عز الدولہ بن بویہ کا وزیر تھا) کے مرثیے میں کہا ہے، یہ شعر اس قصیدے کا سب سے بہترین شعر ہے۔ کسی مقتول یا سولی پر چڑھائے ہوئے انسان کا مرثیہ اتنا پر اثر انداز میں بیان نہیں کیا گیا۔ اس قصیدے کو جب اس بادشاہ نے سنا جس نے خود قتل کا حکم دیا تھا تو تمنا کرنے لگا کہ کاش مقتول وہ ہوتا اور یہ مرثیہ اس کی شان میں کہا گیا ہوتا۔

اس شعر میں شاعر نے اس منظر میں حسن اور چاشنی پیدا کیا کہ جس کی قباحت اور ناپسندیدگی پر تمام دنیا کا اتفاق ہے، وہ کہتا ہے کہ میرا ممدوح سولی پر ضرور چڑھا ہوا ہے لیکن اس کے ہاتھ ابھی بھی ضرورت مندوں اور محتاجوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں جس طرح کہ اس کے حین حیات ہوتے تھے۔

تشبیہ کی یہ غرض تزئین یا مشبہ کو خوشنما بنانے کے لیے ہے۔ کبھی تشبیہ کی غرض مشبہ کی مذمت بیان کرنے کے لیے آتی ہے، جیسے اعرابی (دیہاتی) کا یہ شعر جو اس نے اپنے بیوی کے بارے میں کہا:

وتَفْتَحُ -لا كانت- فَماً لو رأيتَه توهَّمْتَهُ باباً من النارِ يُفتحُ

ترجمہ: (وہ اپنے منہ کو کھولتی ہے۔ کاش کہ وہ نہ ہوتی۔ اگر تو اسے دیکھے تو تمہیں ایسا لگے گا کہ دوزخ کا ایک دروازہ کھل گیا ہے)۔

اس شعر میں جیسا کہ ظاہر ہے اعرابی اپنے بیوی سے نالاں ہے اور اس کا غصہ اس قدر ہے کہ وہ اپنی بیوی کے نہ ہونے کی تمنا ان الفاظ سے

کر رہا ہے ''لا کانت''۔اسی طرح وہ اپنی بیوی کے منہ کو جہنم کے کھلے ہوئے دروازے سے تشبیہ دے رہا ہے۔اس شعر میں تشبیہ کی غرض مشبہ کی قباحت کو بیان کرنا ہے۔

5.10 کلام کی بلاغت میں تشبیہ کا اثر

کلام کی بلاغت میں تشبیہ کا بڑا اہم رول ہے،تشبیہ کے ذریعہ جہاں مخاطب کو اپنی بات سمجھانے میں مدد ملتی ہے وہیں کلام میں قوت اور زور پیدا کرنے کا پورا میدان ہوتا ہے جس سے متکلم کو طویل گفتگو اور لمبی چوڑی وضاحت کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ وہ مختصر سی تشبیہ کے ذریعہ مخاطب کو مطمئن کر دیتا ہے،تشبیہ میں اس بات کی بھی پوری گنجائش موجود ہوتی ہے کہ متکلم تشبیہ دیتے وقت مشبہ بہ کے انتخاب میں صحیح ذوق اور نازک خیالی کا سہارا لے کر کلام کو خوب صورت اور لطیف بنا سکتا ہے،تشبیہ میں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ مشبہ بہ اور مشبہ میں باہم مماثلت موجود ہو اور یہ مماثلت جتنی نازک اور ڈھکی چھپی ہوگی اسی قدر تشبیہ میں ندرت اور جمال کا عنصر پایا جائے گا اور یہی چیز تشبیہ کی جان سمجھی جاتی ہے۔اگر تشبیہ سیدھی سادی اور عام فہم ہوگی تو اس کا جمالیاتی پہلو مدھم پڑ جائے گا اور مطلوبہ ادبی نتائج حاصل نہیں ہو سکیں گے۔

مثال کے طور پر اگر ہم کہیں کہ خالد لمبا ہونے میں عمر کے جیسا ہے یا زمین اپنی گولائی میں گیند کی طرح ہے یا یہ کہ جزیرہ نما برطانیہ جاپان کے مشابہ ہے،تو یہ تینوں مثالوں میں بلاغی اعتبار سے آپ زیادہ اثر محسوس نہیں کریں گے کیونکہ دونوں چیزوں مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان مشابہت بالکل واضح ہے اور اس کی وضاحت کرنے کے لیے کسی مہارت یا ادبی کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔اس طرح کی تشبیہات سے مقصود،معنی مطلوب کو بیان کرنا اور چیزوں کو مثالوں کے ذریعے ذہنوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔تشبیہ کا یہ اسلوب علوم وفنون میں زیادہ کارگر ہے اور زیادہ مستعمل بھی ہے۔

لیکن جب ہم معری کا یہ شعر دیکھیں گے جس میں اس نے ستارے کا وصف بیان کیا ہے تو ہمیں تشبیہ کی خوب صورتی کا احساس ہوگا اور اس کے جمال اور رعنائی کی ایک جھلک ہم دیکھ پائیں گے۔وہ کہتا ہے:

يُسرِع اللَّمحَ فِي احمِرَارٍ كما تُسـ ـــــرعُ في الَّلمحِ مُقلَةُ الغضبانِ

ترجمہ: (وہ ستارہ تیزی کے ساتھ سرخ روشنی میں چمکتا ہے،جس طرح غصہ میں آئے آدمی کی آنکھ کی پتلی تیزی کے ساتھ چمکتی ہے)۔

اس شعر میں اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ شاعر نے ستارے کی سرخ روشنی کی چمک کو غصہ ور آدمی کی آنکھ سے تشبیہ دی ہے جو غصے کے وقت سرخ اور چمکدار ہو جاتی ہے۔سوچیے کس قدر عمدہ انداز میں شاعر نے اس وصف کو بیان کیا ہے اور کیا ہی خوب صورت انداز ہے۔یہ تعبیر ہر کس وناکس ادا نہیں کر سکتا بلکہ اس طرح کی تشبیہ ایک کہنہ مشق ادیب ہی کے لیے ممکن ہو سکتا ہے۔

اسی طرح شاعر کا ایک شعر:

وكَأَنَّ النُّجومَ بين دُجَاهَا سننٌ لاَحَ بَينهُنَّ ابتِداعُ

ترجمہ: (ستارے رات کی تاریکی کے درمیان گویا ایسی سنتیں ہیں جن کے درمیان بدعت ظاہر ہوئی ہے)۔

اس شعر میں شاعر نے بڑے حسن وجمال کے ساتھ دو حالتوں کے درمیان مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جب ہم اس تشبیہ میں غور وفکر کرتے ہیں تو ہمیں شاعر کی مہارت اور حذاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔شاعر نے اس شعر میں رات کی تاریکی میں ستاروں کی حالت کو تشبیہ دی ہے ان

دینی سنتوں کی حالت سے جو باطل بدعتوں کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں۔یعنی ستارے رات کی تاریکی کے باوجود روشن اور چمکدار ہوتے ہیں اور اس کی روشنی سے لوگ فیض یاب ہوتے ہیں،ٹھیک اسی طرح بدعات وخرافات کے ماحول میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم عوام الناس کے لیے مشعل راہ ہیں اور لوگ اس کے ذریعے ضلالت اور گمراہی سے بچتے ہیں اور ہدایت یافتہ ہوجاتے ہیں۔

اس شعر میں ایک اور لطیف بات ملتی ہے اور وہ یہ کہ شاعر نے یہ تصور کیا کہ سنتیں روشن اور چمکدار ہوتی ہیں اور بدعتیں نہایت ہی تاریک اور بے فیض ہوتی ہیں۔

اسی طرح متنبی کا یہ شعر بھی نادر تشبیہات میں سے ایک ہے:

بَلِيتُ بِلَى الأَطْلَالِ إِنْ لَمْ أَقِفْ بِهَا　　　وُقُوفَ شَحِيحٍ ضَاعَ فِي التُّرْبِ خَاتَمُهُ

ترجمہ: (میں ٹیلوں کے بوسیدہ ہونے کی طرح بوسیدہ ہوجاؤں، اگر میں ان ٹیلوں پر نہ ٹھہروں، ایسے لالچی بخیل کی طرح جس کی انگوٹھی مٹی میں گم ہوگئی ہو)۔

ہم نے عربی ادب کی تاریخ میں پڑھا ہے کہ عرب شعرا خاص طور پر جاہلی شعرا اپنے قصائد میں ٹیلوں اور پہاڑوں کا ذکر بہت کثرت سے کرتے ہیں اور ان ٹیلوں اور پہاڑوں کے درمیان جا کر اپنے محبوبہ کو یاد کر کے قصیدے بیان کرتے ہیں جو عربی غزل کا بہت ہی عمدہ اور انمول سرمایہ ہے۔اسی طرز کو اپناتے ہوئے متنبی نے بڑی عجیب وغریب تشبیہ کا استعمال کیا ہے۔متنبی کہتا ہے کہ اگر وہ ٹیلوں پر کھڑا ہو کر اپنے اعزا واقربا کو یاد نہ کرے تو اس کے لیے ہلاکت وبربادی ہے، گویا وہ اپنے لیے بددعا کر رہا ہے، پھر اس نے ان ٹیلوں کے درمیان کھڑے ہونے کی منظرکشی کرتے ہو کہا کہ وہ ان ٹیلوں کے درمیان ایسے ہی کھڑا ہے جیسے ایک بخیل جس کی انگوٹھی مٹی میں گم ہوگئی ہو۔یعنی بخیل اپنی انگوٹھی مٹی میں گم ہونے کے بعد کس قدر حیران وپریشان اور غمزدہ ہوتا ہے،ٹھیک اسی طرح میں بھی اپنوں کو یاد کر کے بے قرار اور بے چین ہوتا ہوں۔

متنبی نے اس شعر میں بے قراری اور خوف ودہشت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والے آدمی کی حالت کو ایسے بخیل کی حالت سے تشبیہ دی ہے جس کی انگوٹھی مٹی میں گم ہوگئی ہو۔اس شعر میں بہت ہی عمدہ اور نادر تشبیہ دی گئی جس کی وجہ سے اس شعر کی فصاحت وبلاغت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن سے ہم جان لیں گے کہ کلام میں تشبیہ کی کتنی اہمیت ہے اور اس کا کلام میں کتنا اثر پایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے معلوم ہوا کہ فن بلاغت میں تشبیہ کو بہت اہمیت حاصل ہے، شاعر یا ادیب اپنے کلام میں تشبیہات کو بیان کر کے اس کو پراثر اور دل کش بناتا ہے،تشبیہ کا معیار بلاغت میں پائے جانے والے تخیل کی مقدار کے اعتبار سے طے کیا جاتا ہے، البتہ جس کلامی صورت میں تشبیہ کی ترتیب دی جاتی ہے اس اعتبار سے تشبیہ کی بلاغت مختلف انداز کی ہوتی ہے، چنانچہ سب سے کم درجے والی تشبیہ وہ ہوتی ہے جس میں اس کے چاروں ارکان مذکور ہوں، کیونکہ تشبیہ کی بلاغت کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ مشبہ بعینہ مشبہ بہ ہے اور ادات تشبیہ اور وجہ شبہ کا ایک ساتھ موجود ہونا اس دعوے کے لیے رکاوٹ ہے۔جب ادات تشبیہ کو یا صرف وجہ شبہ کو حذف کر دیا جائے تو بلاغت کے اندر تشبیہ کا درجہ تھوڑا بلند ہوجاتا ہے، اس لیے کہ ادات تشبیہ اور وجہ شبہ میں سے ایک کے حذف سے مشبہ اور مشبہ بہ کے اتحاد کے دعوے کو تھوڑی سی تقویت ملتی ہے، بہرحال تشبیہ کی اقسام میں سب سے زیادہ بلیغ تشبیہ بلیغ ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ مشبہ اور مشبہ بہ کے ایک ہونے کے دعوے پر مبنی ہوتی ہے۔

5.11 اکتسابی نتائج

☆ فن نقد اور فن بلاغت زمانہ قدیم میں دو الگ الگ فن نہیں تھے، یہ دونوں علوم ابتداءً تبصرے اور تنقیدی آرا پر مشتمل تھے، عصر عباسی میں اس کی تدوین کا باضابطہ آغاز ہوا، فن بلاغت اپنے تینوں شاخوں معانی، بدیع اور بیان کے ساتھ ایک اکائی کے طور پر جانا جاتا تھا، پانچویں صدی ہجری میں عبدالقاہر جرجانی نے شاخوں کو الگ کیا اور پھر ساتویں صدی ہجری میں ابو یعقوب السکاکی کے ہاتھ پر اس فن کے حدود متعین ہوئے۔

☆ علم بیان فن بلاغت کی ایک اہم شاخ ہے۔علم بیان کے ذریعے ایک بات کو مختلف پیرایہ اور متعدد اسلوبوں میں بیان کیا جا سکتا ہے، ایسا کرنے سے متکلم کا مقصد سامعین تک اپنی بات کو مؤثر انداز میں پہنچانا ہوتا ہے۔

☆ علوم بلاغت کے تینوں اقسام علم البیان، علم المعانی اور علم البدیع میں علم البیان کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس علم کے تحت آنے والی بحثوں میں تشبیہ، مجاز لغوی، استعارہ، مجاز مرسل، مجاز عقلی اور کنایہ قابل ذکر ہیں، ان بحثوں میں علم البیان کے محاسن مختلف اسالیب میں کلام کو واضح کرتے ہیں اور متکلم موقع ومحل کے لحاظ سے اپنے کلام کو حسن وقوت عطا کرنے کے لیے ان کا سہارا لیتا ہے۔

☆ کلام میں تشبیہ کا پایا جانا کلام کی فصاحت وبلاغت میں اضافے کا باعث ہے۔تشبیہ کا عمل کلام کی تفہیم کو آسان بنانے اور اس میں خوب صورتی اور نازک خیالی پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

☆ تشبیہ کے کل ارکان چار ہوتے ہیں: ۱۔مشبہ ۲۔مشبہ بہ ۳۔اداۃ تشبیہ ۴۔وجہ شبہ۔ ان چاروں میں مشبہ اور مشبہ بہ بہت اہم تصور کیے جاتے ہیں اور ان کو طرفین تشبیہ بھی کہا جاتا ہے۔تشبیہ دیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں باہم مماثلت پائی جا رہی ہو، البتہ مشبہ بہ میں صفت کی زیادتی ہوتی ہے۔

علمائے بلاغت نے تشبیہ کے متعدد اقسام بیان کیے ہیں اور یہ اقسام ارکان تشبیہ کے حذف وذکر کے اعتبار سے طے ہوتے ہیں۔لہذا تشبیہ کے جملہ اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ ادات تشبیہ کے حذف وذکر کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں: ۱۔تشبیہ مرسل: وہ تشبیہ ہے جس میں ادات تشبیہ مذکور ہوں یعنی حرف تشبیہ کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہو۔ ۲۔تشبیہ مؤکد: وہ تشبیہ ہے جس میں ادات تشبیہ محذوف ہوں اور اس حذف سے مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان مشابہت میں شدت پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

☆ وجہ شبہ کے حذف وذکر کے لحاظ سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں: ۱۔تشبیہ مفصل: وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ مذکور ہو۔ ۲۔تشبیہ مجمل: وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ مذکور نہ ہو۔

☆ تشبیہ بلیغ: وہ تشبیہ ہے جس میں ادات تشبیہ اور وجہ شبہ دونوں محذوف ہوں اور صرف طرفین تشبیہ مذکور ہوں۔

☆ تشبیہ کی مزید چار قسمیں ہیں: ۱۔تشبیہ مفرد: وہ تشبیہ جس میں مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ شبہ تینوں مفرد ہوں۔ ۲۔تشبیہ تمثیل: وہ تشبیہ ہے جس میں ایک مکمل منظر کی تشبیہ دوسرے پورے منظر سے دی گئی ہو اور وجہ شبہ متعدد چیزوں سے ماخوذ کوئی صورت ہو۔ ۳۔تشبیہ ضمنی: وہ تشبیہ

ہے جس میں طرفین تشبیہ صراحتاً مذکور نہ ہو بلکہ اشارۃً اس کا ذکر موجود ہو جو ضمناً سمجھ میں آئے۔ ۴۔تشبیہ مقلوب: وہ تشبیہ ہے جس میں مشبہ کو مشبہ بہ بنا کر الٹ دیا گیا ہو اور الٹی تشبیہ دی گئی ہو۔

☆ کلام میں تشبیہ کو استعمال کرنے کی اغراض مختلف ہوتی ہیں اور تمام اغراض مشبہ کے اردگرد گھومتی ہیں۔تشبیہ کے اغراض و مقاصد میں سے یہ ہے کہ مشبہ کے ممکن ہونے کو بیان کرنا، یامشبہ کی حالت کو بیان کرنا، یامشبہ کی حالت کے مقدار کو بیان کرنا، یا کبھی مشبہ کی حالت کو ثابت کرنا اور بسا اوقات مشبہ کو خوب صورت انداز میں یا قبیح انداز میں بیان کرنا۔ان تمام مقاصد و اغراض کے لیے تشبیہ کا استعمال ہوتا ہے۔

☆ فن بلاغت میں تشبیہ کی بحث بہت اہمیت کی حامل ہے اور یہ ایسی بحث ہے جس سے واقف ہوئے بغیر ہم شعر و شاعری اور ادبی نصوص کی گہرائی اور گیرائی تک نہیں پہنچ سکتے اور شاعر یا ادیب کے مراد کو نہیں سمجھ سکتے۔اس لحاظ سے تشبیہ اور اس کے تمام اقسام سے واقف ہونا بہت ضروری اور ناگزیر ہے۔

☆ تشبیہ کے استعمال کی وجہ سے کلام مؤثر اور دلکش ہوتا ہے اور تشبیہ کے ذریعے مخاطب کو اپنی بات سمجھانے میں مدد ملتی ہے،کلام میں قوت پیدا ہوتی ہے، مخاطب مطمئن ہوتا ہے،شاعر یا ادیب اپنے ذوق کے اعتبار سے کلام کو خوب صورت اور لطیف بنا کر پیش کرتا ہے۔

5.12 امتحانی سوالات کے نمونے

۱۔علم البیان کسے کہتے ہیں اس کے لفظی و اصطلاحی معنی بتائیے۔

۲۔علوم بلاغت میں علم البیان کی اہمیت واضح کیجیے۔

۳۔علوم بلاغت کے کتنے اقسام ہیں؟

۴۔علم البیان کن کن بحثوں پر مشتمل ہے؟

۵۔علم البیان اور علم المعانی میں فرق واضح کیجیے۔

۶۔علم البیان اور علم البدیع کا فرق بیان کیجیے۔

۷۔علم البیان کا کلام کے حسن میں کیا کردار رہتا ہے؟

۸۔تشبیہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کیجیے۔

۹۔ادات تشبیہ کے حذف و ذکر کے اعتبار سے تشبیہ کی کتنی قسمیں ہیں؟ اور کون کون سی ہیں؟ مع مثال بیان کیجیے۔

۱۰۔تشبیہ تمثیل کسے کہتے ہیں، مثالوں سے سمجھائیے ۔

۱۱۔تشبیہ مفرد اور تشبیہ تمثیل میں فرق کو واضح کیجیے۔

۱۲۔تشبیہ ضمنی کی تعریف کیجیے اور مثال دیجیے۔

۱۳۔تشبیہ مقلوب کسے کہتے ہیں، اس کی نمایاں خصوصیت کیا ہے۔

۱۴۔مندرجہ ذیل شعر میں تشبیہ کی غرض کو واضح کیجیے۔

مددتَ يديکَ نحوَهم احتفاءً كمدّهما إليهم بالهبات

۸۔کلام میں تشبیہ کی اہمیت اوراس کے اثر پر مختصر روشنی ڈالیے۔

5.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

۱-	فيض البلاغة	از ڈاکٹر شیر افگن ندوی
۲-	البلاغة الواضحة	علي الجارم ومصطفى أمين
۳-	الإيضاح في علوم البلاغة	الخطيب القزويني
۴-	علوم البلاغة	محمد أحمد قاسم ومحي الدين ديب
۵-	علم البيان	عبد العزيز عتيق
۶-	دروس البلاغة	حفني ناصف وزملائه
۷-	مفتاح العلوم	ابو يعقوب السكاكي
۸۔	فى البلاغة العربية: علم البيان	د۔ محمد مصطفى هدارة
۹۔	علم البيان: دراسة تحليلية لمسائل البيان۔	د۔ بسيوني عبد الفتاح فيود

اکائی 6 مجاز مرسل، مجاز عقلی و کنایہ

اکائی کے اجزا

6.1 تمہید

6.2 مقصد

6.3 حقیقت کی لغوی و اصطلاحی تعریف

6.4 مجاز کی لغوی و اصطلاحی تعریف

6.5 مجاز کے ارکان

6.6 مجاز کی قسمیں

6.7 مجاز لغوی کی قسمیں

6.8 مجاز مرسل کی تعریف اور اس کے علاقات

6.9 کنایہ

6.10 اکتسابی نتائج

6.11 امتحانی سوالات کے نمونے

6.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

6.1 تمہید

علم بیان میں ایک اہم بحث مجاز ہے۔ مجاز تعبیر کا ایک بہترین ذریعہ ہے جس کو سلیم اللسان شخص اپنی بات کو بآسانی اور وضاحت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مجاز کے ذریعہ کلام کا معنی ایسے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ محسوس کی جانے والی چیز ہو اور سننے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ عربوں نے مجاز کو شروع ہی سے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے اور وہ کلام کو وسیع پیمانے پر کہنے اور ایک لفظ کے کئی معانی نکالنے کو پسند کرتے ہیں اور کلام میں موجود باریکیوں سے ایک قسم کی لذت اور سرور حاصل کرتے ہیں۔ عربوں کے کلام میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ دقیق معنی کو اپنے کلام کا حصہ بناتے ہیں اور اپنے نثر و نظم کو اس سے مزین کرتے ہیں، کیونکہ جب کلام میں کسی غیر محسوس چیز کو محسوس شئے کا جامہ پہنایا جاتا ہے تو انسان کا نفس اس کلام کی جانب مائل ہوتا ہے اور وہ اس کلام سے لذت حاصل کرتا ہے۔ مجاز کو شروع کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ مجاز کی قسیم (تقسیم میں ہم مرتبہ) حقیقت کو جان لیں تا کہ ہمیں مجاز کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے، دونوں کے درمیان فرق معلوم ہو، کیونکہ عربی کا قاعدہ ہے کہ ''تتبینُ الأشیاء بأضدادھا'' چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔

مجاز کی طرح کنایہ بھی علم بیان کی ایک قسم ہے جس کا استعمال کلام عرب میں کثرت سے ہوتا ہے۔ عرب اپنی باتوں کو صراحۃً کہنے کے بجائے بسا اوقات اشارۃً اور کنایۃً کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ اس سے کلام میں دلکشی اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے اور سامع کو خوشگوار لگتا ہے۔ اس اکائی میں کنایہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کی اقسام کی تفصیل پیش کی جائے گی۔

6.2 مقصد

اس اکائی میں علم بیان کے ایک اہم موضوع ''حقیقت و مجاز'' اور اس کی قسموں کو بیان کیا جائے گا اور کنایہ اور اس کی اقسام سے بحث کی جائے گی اور کنایہ اور مجاز کے مابین فرق کو واضح کیا جائے گا۔ اس اکائی کو مکمل کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ اکائی میں موجود مثالوں کے ذریعے حقیقت و مجاز کے درمیان فرق کر سکیں۔

☆ مجاز کی لغوی اور اصطلاحی تعریف جان لیں۔

☆ مجاز کے ارکان کو متعین کر سکیں۔

☆ مجاز مرسل کے علاقات کو سمجھ سکیں۔

☆ کنایہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف جان لیں۔

☆ کنایہ کی اقسام سے واقف ہو سکیں۔

6.3 حقیقت کی لغوی و اصطلاحی تعریف

6.3.1 لغوی تعریف

لفظ حقیقت عربی زبان میں اپنے اصلی حروف ''حقق'' سے نکلا ہے اور اسی مادہ سے ''حقّ'' بھی نکلا ہے۔ حقیقت کا معنی ہے: ''موجود'' یا ''ثابت شدہ چیز''، یعنی ایسی چیز جس کا وجود ہو اور اس کی سچائی پائی جاتی ہو۔

ابن منظور نے ''لسان العرب'' میں حقیقت کی لغوی تعریف میں کہا ہے کہ: '' وہ لفظ جو اپنی اصل وضع کے مطابق ہی استعمال کیا جائے، یعنی اسے جس معنی کے لیے وضع کیا گیا یا بنایا گیا تھا اس معنی کے لیے ہی استعمال کیا جائے اور اگر لفظ کو حقیقی معنی میں استعمال نہ کیا جائے تو وہ مجاز کہلاتا ہے۔

6.3.2 اصطلاحی تعریف

حقیقت کی اصطلاحی تعریف حقیقت کی لغوی تعریف سے ہی لی گئی ہے۔ حقیقت کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ حقیقت ایسے کلمے کو کہتے ہیں جو اپنے اس اصلی معنی میں استعمال کیا جائے جس کے لیے اس کا وضع ہوا تھا۔ جب کلمات کا استعمال اس ناحیے سے ہو تو اسے حقیقت لغویہ کہتے ہیں یہ بات ذہن میں رہے کہ " وضع " کا معنی یہ ہے کہ اہل زبان کسی ایک معنی کو کسی ایک لفظ کے ساتھ خاص کر دیں اور وہ لفظ اسی خاص معنی پر دلالت کرے۔ جیسے: لفظ ''أسد'' کا استعمال ایک حیوان کے لیے ہوتا ہے جو چوپایوں کی قسم میں سے چیر پھاڑ کرنے والا جانور ہے۔ اہل زبان (عرب) نے اس لفظ ''أسد'' کو اسی معنی کے لیے وضع کیا ہے۔ اب اگر یہ لفظ اسی خاص معنی میں یعنی چیر پھاڑ کرنے والے جانور کے لیے استعمال ہوتا ہو تو یہ حقیقت یا دوسرے الفاظ میں حقیقت لغویہ یا وضعیہ ہوگا۔

6.4 مجاز کی لغوی و اصطلاحی تعریف

6.4.1 لغوی تعریف

عربی زبان میں لفظ مجاز کا مادۂ اصلیہ "جوز" ہے اور یہ لفظ عرب کے کلام "جاز الموضع جوزا، جوازا و مجازا" سے لیا گیا ہے۔ یہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی چیز اپنی اصلی اور حقیقی جگہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ تجاوز کر جائے۔ اس راستے کو مجاز کہتے ہیں جسے ایک جانب سے دوسری جانب موڑ دیا جائے۔ مجاز حقیقت کا برعکس ہے۔ اسی لغوی معنی سے اہل بلاغت نے مجاز کا اصطلاحی معنی بیان کیا ہے لیکن انھوں نے اس کلمے کے اشتقاق میں دو چیزوں کو مدنظر رکھا ہے۔

ا۔ مجاز "مَفْعَلٌ" کے وزن پر مصدر میمی ہے اور اس کا معنی آگے بڑھ جانا یا حد سے گزر جانا ہے اور یہ اشتقاق جَازَ المَكَانَ يَجُوزُه سے ماخوذ ہے۔ اہل بلاغت نے اس قسم کو مجاز سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ اس میں معنی اپنے اصلی جگہ سے آگے بڑھ جاتا ہے یا یہ کہ متکلم اپنے کلام میں اس لفظ کو اس کے حقیقی معنی سے آگے بڑھا دیتا ہے اور دوسرا معنی مراد لیتا ہے۔ اس لحاظ سے مجاز مصدر ہے اور اس سے اسم فاعل یا اسم مفعول مراد لیا جاتا ہے، بایں طور کہ لفظ اپنے معنی سے خود آگے بڑھ جائے یا متکلم اسے اس کے حقیقی معنی سے نکال کر مجازی معنی تک پہنچا دے۔

۲۔ مجاز اسم مکان ہے۔ اس صورت میں اس کا معنی ہوگا آگے بڑھنے اور حد سے گزرنے کی جگہ۔ اس صورت میں یہ لفظ عرب کے اس کلام کی طرح ہوگا "جعلت هذا مجازا لي حاجتي أي طريقا إليها" یعنی میں اسے اپنی حاجت کے پورا ہونے کی جگہ سمجھا۔ اس لحاظ سے مجاز جاز المکان سے مشتق ہوگا۔

6.4.2 اصطلاحی تعریف

علمائے بلاغت نے مجاز کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجاز ایک ایسا لفظ ہے جسے ایسے معنی میں استعمال کیا جائے جس کے لیے اسے وضع

نہ کیا گیا ہواور یہ استعمال کسی تعلق یا علاقہ کی وجہ سے ہوتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ لفظ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں ہے مثال کے طور پر لفظ ''قمر'' خوب صورت چہرے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اوراسی طرح لفظ ''أسد'' بہادر آدمی کے لیے اور لفظ ''شمس ''خوب صورت عورت کے لیے اور ''بحر'' سخی اور دریا دل آدمی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ تمام الفاظ اپنے موضوع لہ میں مستعمل نہیں ہیں بلکہ ان تمام کلمات سے کوئی اور ہی معنی مراد لیے جارہے ہیں اوراس مرادی معنی کی تعیین کسی تعلق کی بنا پر ہوتی ہے جو کہ حقیقی معنی مراد لینے میں مانع ہوتا ہے۔

6.5 مجاز کے ارکان

مجاز کی اصطلاحی تعریف سے آپ کو ضرور یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ مجاز کے لیے چند امور کا ہونا بہت ضروری ہے تا کہ اس پر مجاز کا اطلاق ہو سکے۔ اس چیز کو ہم آنے والی مثالوں سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

قَامَتْ تُظَلِّلُنِيْ من الشمس نفسٌ أحبُّ إليَّ مِنْ نَفْسِيْ

قامتْ تُظَلِّلُنِيْ وَمِنْ عَجَبٍ شَمْسٌ تُظَلِّلُنِيْ مِنَ الشَّمْسِ

ترجمہ: مجھے سورج کی دھوپ سے بچانے کے لیے وہ شخص مجھے سایہ دے رہی ہے جو میرے نزدیک میری جان سے زیادہ محبوب ہے اور کیا عجیب بات ہے کہ مجھے سورج سے بچانے کے لیے ایک دوسرا سورج سایہ کر رہا ہے۔

عزیز طلبہ! اگر ہم دوسرے شعر میں غور کریں تو پتا چلے گا کہ لفظ "شمس" دومعنوں میں استعمال ہوا ہے، پہلا معنی تو حقیقی ہے، یعنی اس سے وہی سورج مراد ہے جسے آپ اور ہم جانتے ہیں اور دوسرا شمس سے وہ انسان مراد ہے جو روشن اور خوب صورت چہرے والا ہے اور اپنی چمک دمک میں سورج کے مشابہ ہے، اس طرح دوسرا شمس غیر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے اور اسی کو مجازی معنی کہا جاتا ہے، کیونکہ شمس کے حقیقی اور مجازی معنی میں جو تعلق انھیں آپس میں جوڑ رہا ہے وہ مشابہت کا ہے، کیونکہ روشن چہرا چمک دمک اور خوب صورتی میں سورج سے مشابہ ہے۔ اسی طرح شعر میں موجود کلمہ (تظللني) میں حقیقی معنی مراد لینے میں مانع ہے۔ کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ حقیقی سورج سایہ نہیں کرتا، اس طرح کے کلمات جو حقیقی معنی مراد لیے جانے میں مانع ہوں قرینہ کہلاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجاز کے لیے پانچ چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ لفظ۔

۲۔ لفظ کا حقیقی معنی جس کے لیے اس لفظ کو وضع کیا گیا۔

۳۔ لفظ کا مجازی معنی جس کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا جارہا ہے۔

۴۔ علاقہ یا تعلق جو دونوں معنوں کو جوڑے۔

۵۔ ایسا اشارہ جو بتادے کہ لفظ کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ مجازی معنی مراد ہے۔ یہ اشارہ اور قرینہ لفظی بھی ہوسکتا ہے اور سیاق کلام سے بھی سمجھا جا سکتا ہے جسے قرینہ حالیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

مجاز کے ارکان

لفظ — حقیقی معنی — مجازی معنی — علاقہ — قرینہ

معلومات کی جانچ:

۱۔حقیقت اور مجاز کے درمیان کیا فرق ہے؟

۲۔قرینے سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

۳۔علاقہ کسے کہتے ہیں؟

6.6 مجاز کی قسمیں

بلاغت کی اصطلاح میں مجاز کا اطلاق دو قسم کے اسلوبوں پر ہوتا ہے۔پہلی قسم کا تعلق الفاظ سے اور دوسری قسم کا تعلق اسناد اور نسبت سے ہے۔پہلی قسم کو مجاز لغوی کہتے ہیں اور دوسری کو مجاز عقلی۔اس طرح مجاز کی دو قسمیں ہیں: ۱۔مجاز عقلی ۲۔مجاز لغوی۔

۱۔مجاز عقلی: کسی فعل کی نسبت فاعل غیر حقیقی کی طرف کر دیا جائے۔جیسے ہمارا یہ کہنا: **بنى الأمير المدينة** (بادشاہ نے شہر بنایا)۔اگر ہم اس مثال میں غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بنی تعمیراتی کام کو کہتے ہیں اور الأمیر بادشاہ یا حکومتی امور انجام دینے والے کو کہتے ہیں اور **المدینۃ** شہر کو کہتے ہیں۔لہذا اس جملہ میں تمام الفاظ اپنے اصلی اور موضوع لہ معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔اس کے باوجود یہ جملہ مجاز ہے کیونکہ اس میں شہر بنانے کی نسبت بادشاہ کی طرف کی گئی ہے اور بادشاہ بذات خود تعمیراتی کام انجام نہیں دیتا بلکہ وہ حکم دیتا ہے اور اس کا عملہ اس کام کو انجام دیتے ہیں۔لہذا فعل بنی کی نسبت الأمیر کی طرف مجاز ہوا اور یہ اسناد مجازی ہوگی اور اس کو مجاز عقلی کہا جائے گا۔معلوم ہوا کہ فعل کی نسبت اس کے فاعل حقیقی کے بجائے کسی اور کی طرف کرنا مجاز عقلی کہلاتا ہے۔

مجاز عقلی کی اسناد اور نسبت کے اعتبار سے چند صورتیں ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ فعل کی نسبت سبب فعل کی طرف: جیسے **قتل السلطانُ سجینا**۔(بادشاہ نے قیدی کو قتل کیا۔)اس مثال میں فعل قتل کی نسبت بادشاہ کی طرف مجازاً ہے کیونکہ قیدی کو بادشاہ اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کرتا بلکہ وہ حکم دیتا ہے اور جلاد اس کے حکم کے مطابق اسے قتل کرتا ہے۔چونکہ بادشاہ کے حکم کی وجہ سے فعل قتل واقع ہوا اور بادشاہ وقوع فعل کا سبب بنا، لہذا سبب یعنی بادشاہ کی طرف فعل کی نسبت کر دی گئی۔اسے مجاز عقلی بہ نسبت سبب کہتے ہیں۔

۲۔ فعل کی نسبت زمان فعل کی طرف: جیسے **أنبت الربیعُ البقلَ** (موسم بہار نے سبزی اگائی۔)اس مثال میں زمانہ یعنی موسم بہار کی طرف فعل کی نسبت کی گئی ہے جو کہ فاعل حقیقی نہیں ہے بلکہ فاعل حقیقی تو اللہ تعالی ہے جس نے موسم بہار میں سبزی اگایا۔چونکہ حدوث فعل اور فاعل میں زمانی نسبت ہے اس لیے فاعل حقیقی کے بجائے اس کی طرف فعل کی نسبت کر دی گئی۔اسے مجاز عقلی بہ نسبت زمان کہتے ہیں۔

۳۔ فعل کی نسبت مکان فعل کی طرف: جیسے **جری النهرُ** (نہر جاری ہوگئی۔)اس مثال میں نہر کی طرف فعل کی نسبت مجازی ہے کیونکہ نہر نہیں

بہتی بلکہ نہر ایک مکان ہے جس میں پانی بہتا ہے۔ فاعل حقیقی تو پانی ہے جو نہر میں بہتا ہے مگر یہاں فعل کی نسبت اس مکان کی طرف کر دی گئی ہے جس میں فاعل حقیقی جاری و ساری ہوا۔ اسے مجاز عقلی بہ نسبت مکان کہتے ہیں۔

۴۔ فعل کی نسبت مفعول بہ کی طرف: خسِر المالُ (مال کا نقصان ہوگیا۔) اس مثال میں غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نقصان مال کا نہیں بلکہ صاحب مال کا ہوا اور خسر کا فاعل حقیقی صاحب مال ہے مگر مفعول بہ کے ساتھ تعلق و نسبت کی بنیاد پر فعل کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔ اسے مجاز عقلی بہ نسبت مفعول کہتے ہیں۔

یاد رکھیں کہ مجاز عقلی میں الفاظ اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوتے ہیں البتہ ان کی نسبت اور اسناد حقیقی فاعل کی طرف نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف مجاز لغوی میں اسناد اور نسبت اپنے حقیقی فاعل کی طرف ہوتی ہے مگر الفاظ اپنے اصلی معنی میں استعمال نہیں ہوتے۔ مجاز لغوی کی تفصیل حسب ذیل ہے:

6.7 مجاز لغوی کی قسمیں

۲۔ مجاز لغوی: مجاز لغوی اسے کہتے ہیں جس میں لفظ اپنے موضوع لہ اور اصلی معنی کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہو اور اس میں کوئی ایسا قرینہ بھی ہو جو اس کا اصلی معنی مراد لینے سے مانع ہو۔ جیسے: جاءني أسد يحمل بندوقيته۔ (میرے پاس شیر (بہادر آدمی) اپنا بندوق لیے ہوئے آیا۔ اس مثال میں أسد اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ اس کا مجازی معنی مراد ہے کیونکہ أسد بندوق لے کر نہیں چلتا بلکہ بندوق لے کر انسان چلتا ہے۔

مجاز عقلی میں حقیقی معنی اور مجازی معنی کے درمیان کوئی نہ کوئی نسبت اور تعلق کا ہونا ضروری ہے تاکہ ذہن اس اصلی معنی سے مجازی معنی کی طرف منتقل ہو سکے۔ اسی نسبت اور تعلق کی بنیاد پر مجاز لغوی کی دو قسمیں ہیں: مجاز مرسل اور استعارہ۔

۱۔ استعارہ: یہ مجاز لغوی کی ایک قسم ہے اور اس میں حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان مشابہت کا تعلق ہوتا ہے۔ جیسے: رأيت بحراً يغترف الناس من كرمه (میں نے ایک ایسے سمندر کو دیکھا جس کی سخاوت سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں) اس مثال میں بحراً اور الرجل الكريم میں مشابہت کا تعلق ہے اور یہ دونوں عطا میں ایک دوسرے کے مماثل و مشابہ ہیں۔ اس کی تفصیلی بحث اگلی اکائی میں آ رہی ہے۔

۲۔ مجاز مرسل: مجاز مرسل بھی مجاز لغوی کی ایک قسم ہے، مجاز مرسل وہ کلمہ ہے جس کو قصدی طور غیر موضوع لہ معنی میں استعمال کیا گیا ہو اور جس میں مشابہت کا علاقہ نہ ہو بلکہ کوئی اور ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قرینہ بھی ہو جو اصلی معنی مراد لینے سے مانع ہو۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ لفظ اگر اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہ ہو کر مجازی معنی میں استعمال ہوا ہو اور حقیقی و مجازی معنی میں نسبت و تعلق مشابہت و مماثلت کا نہ ہو بلکہ کوئی اور ہو تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں۔ جیسے: رأيت رجلاً يعصر خمراً۔ (میں نے ایک شخص کو انگور نچوڑتے ہوئے دیکھا۔) اس مثال میں خمر سے مراد شراب نہیں ہے بلکہ انگور کے دانے ہیں جسے نچوڑ کر شراب بنایا جاتا ہے۔ جملہ کا مفہوم ہوگا میں نے ایک شخص کو شراب بناتے ہوئے دیکھا۔ شراب اور انگور دو مختلف چیزیں ہیں اور یہاں ایک بول کر دوسرا مراد لیا گیا اس لیے ضروری ہے کہ دونوں میں کوئی رشتہ اور تعلق ہو تاکہ ایک بول کر دوسرا مراد لینا

صحیح ہو اور یہ تعلق اور رشتہ اس مثال میں مشابہت کا نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے اور وہ اعتبار مستقبل ہے یعنی مستقبل میں نچوڑے ہوئے انگور کا شراب میں تبدیل ہونا ہے، لہذا مستقبل کا اعتبار کرتے ہوئے اسے شراب سے تعبیر کر دیا گیا۔

مجاز مرسل کو مرسل اس لیے کہا گیا کیونکہ وہ اپنے تعلق یا علاقے میں آزاد ہے اور استعارے کی طرح اسے مشابہت کے علاقے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ اور بہت سارے علاقے مجاز مرسل کے تابع ہوتے ہیں۔

6.8 مجاز مرسل کے علاقات

مجاز مرسل کے بہت سارے علاقات ہیں جسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر ایک قسم کے تحت چند علاقات ہیں۔ آپ آئندہ صفحات میں ان تمام علاقات کو مثالوں کے ذریعے بآسانی سمجھ پائیں گے۔

ا۔علاقہ غائیہ: یہ تعلق غایت یا مقصد سے متعلق ہے اس کے تحت سببیت، مسببیت، آلیت، لازمیت اور ملزومیت آتا ہے۔

ب۔علاقہ کمیت یا تعلق کمیت: اس کے تحت کلیت، جزئیت، عمومیت اور خصوصیت آتے ہیں۔

ج۔علاقہ زمان یا تعلق زمان: اس قسم کے تحت دو علاقے آتے ہیں: ۱۔اعتبار ماضی (ما کان) ۲۔اعتبار مستقبل (ما یکون)

د۔علاقہ مکان یا تعلق مکان: اس کے تحت محلیت (ظرف یا مکان کا اعتبار) حالیت (مظروف کا اعتبار) اور مجاورت (پڑوس کا اعتبار) آتے ہیں۔

آیئے اب ہم مجاز مرسل کے چند علاقات کو مجاز مرسل کی مثالوں کے ساتھ پڑھیں:

ا۔العلاقہ الغائیۃ: اس میں حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان تعلق سبب، نتیجہ، اثر یا اثر کرنے والی ذات پر مبنی ہوتا ہے اور اس کے تحت مذکورہ علاقے آتے ہیں۔

ا۔سببیت: یہ اس وقت ہوتا ہے جب مذکورہ لفظ کا اصلی معنی مرادی معنی کا سبب ہو، بایں طور کہ سبب کو مسبب کی جگہ استعمال کیا جائے یا مسبب کو سبب کا نام دیا جائے۔ جیسے: رعینا الغیث (ہم نے کھیتی کی نگہداشت کی) یہاں لفظ غیث کا استعمال کھیتی کے لیے کیا گیا ہے، کیونکہ بارش سے ہی کھیتی اگتی ہے لہذا غیث مجاز مرسل ہوا اور مجاز کا تعلق سببیت ہے اور بارش کی اہمیت اور اس سے حاصل ہونے والی خوشی اور ان پر اس کا گہرا اثر قرینہ ہے اور یہ قرینہ حالیہ ہے۔ بعض علمائے بلاغت نے اس جیسی مثال میں لفظ رعینا کو قرینہ قرار دیا ہے، جو کہ لفظی قرینہ ہے۔

اسی طرح اللہ تعالی کا یہ قول: ''فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم'' (سورۃ البقرۃ:194) یعنی: (جو تم پر زیادتی کرے تم اس کو ویسا ہی بدلہ دو جیسا کہ وہ تم پر زیادتی کیا ہے) اس مثال میں ''اعتدی'' یعنی زیادتی اور ظلم کا ذکر تین مرتبہ ہوا ہے: پہلی اور آخری مرتبہ اعتدی کے حقیقی معنی مراد ہیں اور دوسری مرتبہ یعنی ''فاعتدوا علیه'' (تم بھی ان پر زیادتی کرو یعنی تم ان سے زیادتی کا بدلہ لو) میں مجازی معنی مراد ہیں، مطلب یہ ہوگا کہ تم اس زیادتی کا ردعمل دو۔ یہاں ''اعتدی'' (مجازی معنی) مراد لینے میں تعلق یا علاقہ سببیت کا ہے۔ یعنی دشمنوں کی طرف سے کی گئی زیادتی سبب ہے اور اس کا ردعمل مسبب ہے، لہذا جوابی کاروائی یا ردعمل (قصاص یا مجازاۃ) کو بھی اعتدی فرمایا گیا، اس کے علاوہ یہاں تعلق سببیت کے قوت کے اظہار سے مجاز کی بلاغت کا بھی اندازہ ہو رہا ہے۔ چونکہ یہ آیت دشمنوں کی سرکوبی سے

متعلق ہے اس لیے یہاں کلام میں اس قسم کی شدت پائی جارہی ہے۔

ایک اور مثال سببیت کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "إنّ مِنْ أكبرِ الكبائرِ أَنْ يَسُبَّ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ" یعنی والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے پوچھا کہ کوئی آدمی اپنے ہی ماں باپ کو کیسے گالی دے سکتا ہے تو جواب میں فرمایا کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے اپنے ماں اور باپ کو گالی دی ہے کیونکہ وہ اس کے والدین کی طرف ہی لوٹتی ہے۔ گویا وہ اپنے ہی ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے۔ یہاں "أَنْ يَسُبَّ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ" مجاز مرسل ہے اور اس کا تعلق یا علاقہ سببیت ہے۔ یعنی وہ کام جو والدین کو برا بھلا کہنے کا سبب بنا اسے والدین کو برا بھلا کہنے کے برابر قرار دیا گیا۔ اب یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ اس کلام میں کس قدر قوت ہے اور کس انداز سے اِس برے کام سے بچایا جا رہا ہے اور اس میں مسلمانوں کو ہر اس کام سے بچنے کی تاکید ہو رہی ہے جو والدین کی نافرمانی میں شامل ہو۔ اس طرح کا اسلوب بلاغتِ مجاز میں آتا ہے۔

ب: مسببیت: مسبَّب یعنی نتیجہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور سبب مراد لیا جاتا ہے اور سبب کو مسبب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ یہاں لفظ مذکور کا حقیقی معنی مسبب ہوتا ہے اور مرادی معنی سبب ہوتا ہے۔ اسے "تَسمِيَةُ الشَّيءِ بِاسمِ نَتِيجَتِهِ" یا "تَسمِيَةُ الشَّيءِ مَا يَتَسَبَّبُ عَنهُ" کہتے ہیں۔ یعنی نتیجے کا نام سبب کو دے دینا، جیسے: آیت مبارکہ میں ہے: " هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُم مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا، وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُنِيب" (غافر:13)۔ (وہی ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں بتاتا ہے اور تمہارے لیے آسمان سے رزق نازل فرماتا ہے اور نصیحت حاصل نہیں کرتے سوائے ان لوگوں کے جو رجوع کرنے والے ہیں۔) اس آیت میں "ینزل لکم من السماء رزقا" میں غور کیجیے یہاں "ماء" کی جگہ " رزقا" لایا گیا ہے یعنی ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا کہنے کی بجائے رزق نازل کیا فرمایا۔ سبب کا ذکر کر کے نتیجہ مراد لیا گیا ہے اور سبب کے ذریعے مسبب کو تعبیر کیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں مجاز یہ ہے کہ پانی اور رزق کے درمیان سببیت کی قوت کا اظہار کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس جانب بھی اشارہ ہے کہ ایک مومن کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالی ہی رزق نازل فرمانے والا ہے اور وہی کفیل ہے اور اللہ تعالی نے آسمان کو رزق کا سرچشمہ بنایا ہے۔

ایک اور جگہ قرآن مجید میں یتیموں کے مال کو کھانے والوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ آگ کھا رہے ہیں۔ یہاں پر آگ مسبب اور نتیجہ ہے اور سبب مال حرام کھانا ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے: "إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلما إنما يأكلون في بطونهم نارا" (النساء:15) (بے شک جو لوگ یتیموں کے مالوں کو زبردستی کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں)

ج: آلیت: یہ ایسا تعلق ہے جس میں لفظ کے حقیقی معنی مجازی معنی کے لیے آلہ یا ذریعہ ہوتے ہیں جیسے لفظ "لسان" ذکر کر کے لغت مراد لینا۔ جیسے: "يتكلم محمد خمسة ألسنة" (محمد پانچ زبانوں میں بات کرتا ہے) یہاں خمس لغات مراد ہے لیکن خمسة ألسنة کہا گیا ہے اور ألسنة کا لفظ بطور مجاز استعمال ہوا ہے۔ اس مثال میں تعلق آلیت کا ہے یعنی زبان لغت کے لیے آلہ ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالی کا فرمان ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ، فَيُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ" اس آیت کریمہ میں "بلسان قومه" سے مراد "بلغة قومه" ہے۔

اسی طرح حدیث پاک میں ہے: ''المسلم من سلِم المسلمون من لسانه ویده'' اس میں لفظ ''لسان'' اور ''ید'' سے ہاتھ اور منھ کے ذریعہ ہونے والی برائی مراد ہے، یعنی مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور منھ کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہے۔ یہاں لفظ ''لسان'' اور ''ید'' بری باتوں اور برے کاموں کے لیے آلہ ہے اور اسے مجازاً یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

2۔ **العلاقة الكمية:** کمیت یا مقدار کا تعلق یا علاقہ یعنی اس قسم کے تعلق میں حقیقت اور مجاز کے درمیان کل کا جز سے تعلق ہوتا ہے، کبھی کل کہہ کر جز مراد لیتے ہیں اور کبھی جز بول کر کل مراد لیتے ہیں۔ اس تعلق میں مقدار کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ا۔ جزئیت: تعلق جزئیت یہ ہے کہ مذکورہ لفظ کے مرادی معنی کے لیے حقیقی معنی جز ہو، اسے ہم ''تسمية الشيء باسم جزئه'' یعنی تسمية الكل بالجزء کہتے ہیں یعنی جز کہہ کر کل مراد لینا۔ جیسے: ''أرسلنا العيون لمراقبة الحدود'' (ہم نے سرحد کی حفاظت کے لیے جاسوس کو بھیجا ہے) یہاں جاسوس کے لیے لفظ ''عیون'' (یعنی: آنکھیں) استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ عیون جاسوس کے لیے جز ہے اور اس کا استعمال یہاں اس لیے کیا گیا ہے کہ جاسوس کا کام زیادہ تر آنکھوں سے ہی انجام پاتا ہے۔ اس لیے جاسوس کو آنکھ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ آیت کریمہ میں ہے: ''قم الليل إلا قليلا'' (المزمل:2) یہاں قیام سے مراد نماز ہے اور قیام جز ہے نماز کا۔ اسے ''تسمية الكل باسم الجزء' کہتے ہیں، یہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں مذکور ہے، نیز اردو زبان میں بھی یہ کثیر الاستعمال ہے۔

ب۔ کلیت: کلیت یہ ہے کہ کل کا ذکر کر کے جز مراد لیا جائے۔ اسے ''تسمية الجزء باسم الكل'' بھی کہتے ہیں۔ جیسے: ''أكلت تفاح كشمير و شربت ماء النيل'' (میں نے کشمیر کے سیب کھائے اور دریائے نیل کا پانی پیا)، اس مثال میں ''تفاح'' سے کشمیر کے تمام سیب مراد نہیں ہیں بلکہ کچھ سیب مراد ہیں۔ اسی طرح ماء النيل سے نیل کا تمام پانی نہیں بلکہ اس کا بعض مراد ہے۔ کلیت کی ایک اور مثال قرآن مجید کی یہ آیت ہے: ''أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ'' (البقرة:19)، اس آیت مبارکہ میں ''يجعلون أصابعهم في آذانهم'' (وہ اپنے کانوں میں انگلیوں کو رکھ لیتے ہیں) سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی پوری انگلیاں کانوں میں رکھ لیتے ہیں اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے، بلکہ یہاں ''أصابع'' سے انگلیوں کے اوپری حصے مراد ہیں۔ اس آیت کریمہ میں منافقوں کی حالت کو ان لوگوں سے تشبیہ دی گئی ہے جن لوگوں پر اندھیری اور کڑک کے ساتھ طوفانی بارش ہوئی تو وہ لوگ شدت خوف سے چاہتے ہیں کہ اگر ہو سکے تو پوری کی پوری انگلیاں کانوں میں ڈال لیں۔ یہاں انگلی اور انگلی کے پور (إصبع اور أنملة) کے درمیان کلیت علاقہ کا ہے۔

3۔ **العلاقة الزمانية:** یہاں پر حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان زمانی تعلق ہوتا ہے، اس میں ماضی اور مستقبل دو زمانوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے، کبھی ماضی کہہ کر مستقبل مراد لیتے ہیں تو کبھی اس کے برعکس مستقبل کہہ کر ماضی مراد لیتے ہیں۔ اب ہم ان دونوں تعلقات کو مثالوں کے ساتھ سمجھتے ہیں۔

ا۔ اعتبار ما کان (یعنی اعتبار ماضی): مذکورہ لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان زمانۂ ماضی کے حساب سے تعلق ہوتا ہے اسے ''تسمية الشيء باعتبار أصله'' بھی کہتے ہیں۔ یعنی گذشتہ زمانے میں شئے کی جو کیفیت و حالت تھی اس کا اعتبار کرتے ہوئے لفظ کا ذکر کر دینا اور

معنی مراد زمانۂ مستقبل ہو اس علاقے یا تعلق کو عربی زبان میں ''العلاقه الماضوية'' بھی کہتے ہیں۔اس کی مثال ہم اس آیت مبارکہ سے سمجھ سکتے ہیں: ''وآتوا اليتامى أموالهم ولا تتبدلوا الخبيث بالطيب، ولا تأكلوا أموالهم إلى أموالكم، إنه كان حوبا كبيرا'' (النساء:2)۔اس آیت میں یتیم کو اس کے اموال واپس کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔لفظ یتیم کا اصلی معنی وہ کم سن لڑکا یا لڑکی ہے جس کے والد فوت ہو گئے ہوں لیکن یہاں کم سن لڑکا یا لڑکی مراد نہیں ہے بلکہ وہ جوان مراد ہے جو کم سنی میں یتیم ہو گئے تھے اور اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ خود کے مال میں تصرف کر سکیں۔لہذا یہاں پر مجازاً ''یتیم'' کہہ کر زمانے ماضی کے یتیم جو اب جوان ہیں وہ مراد ہیں اور یہاں مجاز مرسل کا تعلق تعلقِ زمانی ہے اور اس میں زمانے ماضی کا اعتبار کیا گیا ہے اور مجازی معنی کو بتانے کے لیے قرینہ یہ ہے کہ انہیں ان کا مال واپس دینے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہری بات ہے کہ کم سن بچوں کو مال حوالے نہیں کیا جاتا اور نہ وہ اس میں تصرف کر سکتے ہیں۔

ب۔اعتبار ما یکون (یعنی اعتبار مستقبل): مذکورہ لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان زمانۂ مستقبل کا اعتبار کیا جائے اور زمانۂ مستقبل کہہ کر ماضی مراد لیا جائے یہ اعتبار ما کان کا عکس ہے۔اسے عربی زبان میں: ''العلاقة المستقبلية'' بھی کہا جاتا ہے۔جیسے اللہ تعالی نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوش خبری دینے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ'' (الصافات:101) (ہم نے انھیں ایک بردبار لڑکے کی خوش خبری دی)۔یہاں صفت ''حلیم'' ایک عاقل و بالغ شخص کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور پیدا ہونے والے نومولود لڑکے کو حلیم نہیں کہا جاتا لہذا یہاں پر اعتبار ما یکون یا مستقبل کا اعتبار کرتے ہوئے ''حلیم'' صفت لائی گئی ہے۔جس لڑکے کی پیدائش کی خوش خبری دی جا رہی ہے وہ سن رشد کو پہنچ کر حلیم یعنی بردباری کے عظیم درجے پر فائز ہونے والا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری آیت میں حضرت اسحاق کے بارے میں ہے: ''قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ'' (الحجر:53)، اس آیت میں صفت ''علیم'' گذشتہ مثال کی طرح ایک جوان مرد کی صفت ہو سکتی ہے۔یعنی دونوں مثالوں میں حلم اور علم کا ذکر کر کے اعتبار مستقبل کیا گیا ہے کہ مستقبل میں ایسا ہوگا۔عام طور پر ہم بھی اس قسم کے علاقے یا تعلق کا استعمال کرتے ہیں اور علم طب کے طالب علم کو ڈاکٹر اور علم ہندسہ کے طالب علم کو انجینئر کہہ کر بلاتے ہیں، لفظ کے ایسے استعمال سے ایک طرف تو ہمت افزائی کرنا ہے اور دوسرے طرف مجاز مرسل اور اعتبار ما یکون ہے۔

4۔العلاقة المكانية (تعلق مکانی): یہاں پر حقیقی یا مجازی معنی کے درمیان مکان یا جگہ کے لحاظ سے تعلق ہوتا ہے بایں طور کہ ظرف کہہ کر مظروف مراد لیا جاتا ہے یا پھر مظروف کہہ کر ظرف مراد لیا جاتا ہے۔اسے حالیت یا محلیت کہتے ہیں۔حال سے مراد مظروف ہے اور یہ فاعل ہوتا ہے اور محل سے مراد مکان یا ظرف یا قیام کی جگہ ہے اور یہ مکان ہوتا ہے۔

ا۔حالیت: یہاں حالیت سے مراد فاعل کی نسبت مکان کی طرف کرنا مقصود ہے، لفظ حال اسم فاعل ہے ''حلّ بالمكان'' سے ہے، اس کا معنی نازل یا مقیم ہے۔اس تعلق کے بارے میں علمائے بلاغت کا کہنا ہے کہ مذکورہ لفظ معنی مراد کا حال ہو اور معنی مراد کو حال کا نام دے دیا جائے، جیسے کہتے ہیں: ''فلاں شخص بڑی عیش وعشرت میں رہتا ہے'' اس مثال میں ''بڑی عیش وعشرت'' کہہ کر ایسی جگہ مراد لی گئی ہے جہاں پر نعمتیں ہوں، کیونکہ کوئی بھی شخص کسی نہ کسی مکان اور جگہ میں رہتا ہے اور اس جگہ میں اسے نعمتیں میسر ہوتی ہیں۔اسی لیے اس طرح کہا جاتا ہے۔آیت کریمہ میں اللہ تعالی کا

فرمان ہے:''إن الأبرار لفي نعيم''(الانفطار:13)،(بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہیں) یہاں نعمتوں سے نعمتوں کے نازل ہونے کی جگہ مراد ہے لہذا لفظ ''نعیم'' حال ہے اور ''جنت'' محل ہے اور یہاں حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان تعلقِ حالیت ہے۔

ب۔محلیت: محلیت یعنی جگہ کا ذکر کر کے وہاں موجود اشخاص یا اشیا کو مراد لینا دوسرے الفاظ میں محل کا ذکر کر کے حال مراد لینا۔ جیسے: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد سے کہا تھا:''واسئل القرية التي كنا فيها والعير التي أقبلنا فيها وإنا لصادقون''(یوسف:82) (آپ گاؤں والوں سے اور قافلے والوں سے پوچھ لیں جن کے ساتھ ہم آئے ہیں ہم بالکل صحیح کہہ رہے ہیں) اس آیت مبارکہ میں دو مرتبہ مجاز مرسل کا استعمال کیا گیا ہے جس کا علاقہ محلیت ہے۔ پہلا تو لفظ:''القرية'' ہے اور دوسرا لفظ ''العير'' ہے۔ یہاں ''القرية'' سے مراد گاؤں نہیں ہے اور نہ ہی ''العير'' سے جمادات اور حیوانات مراد ہیں، بلکہ ''القرية'' سے أهل القرية یعنی گاؤں والے مراد ہیں اور ''العير'' سے أصحاب العير یعنی قافلے والے مراد ہیں اور یہاں حقیقی لفظ چھوڑ کر مجازی لفظ استعمال کرنے پر اس جانب اشارہ ہے کہ یہ بات اتنی سچی ہے کہ اگر آپ اس گاؤں یا جمادات اور حیوانات سے بھی پوچھیں تو وہ بتا دیں گے۔

اس قسم کی ایک اور مثال جو ہماری روزمرہ کی زبان اور استعمال میں رائج ہے اس سے بھی اس کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں:''مجلس نے یہ بات طے کی ہے''، اس مثال میں مجلس سے مراد اہل مجلس ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے:''فليدع نادية'' (العلق:17) (تو وہ اپنے اہل مجلس کو بلالیں)، اس آیت کریمہ میں نادية (مجلس) کہہ کر اہل مجلس مراد لیے گئے ہیں۔

ج۔مجاورت: کسی شئے کا اصلی نام ذکر کرنے کے بجائے اس کے پڑوس یا صحبت میں رہنے والی چیز کا ذکر کیا جائے تو اسے تعلق مجاورت کہیں گے اور یہ تعلق بھی مکانی ہوتا ہے۔ یہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب حقیقی معنی مجازی معنی کے لیے پڑوسی ہو اور اس کا اکثر استعمال دو اسموں کے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسے:''ركبت الفرسان سروجهم'' (گھوڑ سوار اپنے کجاووں پر سوار ہو گئے)، یہاں گھوڑوں کے ذکر کے بجائے ان کے کجاووں کا ذکر بطور مجاز کیا گیا ہے اور یہاں مجاز کا تعلق تعلق مجاورت ہے۔

6.8 مجاز مرسل کی بلاغت

حقیقت سے عدول کر کے مجاز مرسل کو ذکر کرنے کی وجہ سے کلام میں بلاغت کے بہت سارے لطائف اور اسرار سما جاتے ہیں۔ ان میں اہم ترین: ایجاز (کلام کو مختصر کرنا) اور مبالغہ ہے۔ اسی طرح مجاز مرسل کے استعمال سے ادیب کو قافیہ اور فاصلے کے لیے مناسب الفاظ اختیار کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور نئی راہ ملتی ہے جس کی وجہ سے وہ بعض ایسے کلمات جن کو ذکر کرنا ناپسندیدہ لگتا ہے اسے چھوڑ کر ایسے کلمات سے اپنے کلام کو تعبیر کرتا ہے کہ الفاظ میں ملاحت آجاتی ہے اور اسے سننا اور پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ اسی طرح مجاز مرسل بہت ساری بلاغی اغراض کو بآسانی ہموار کر دیتا ہے جو سیاق کلام کے لحاظ سے مناسب ہوتی ہے۔ جیسے: تعظیم، تحقیر یا تخویف (یعنی ڈرانا) وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ مجاز مرسل معانی کو محسوسات کی طرح مؤثر صورت دینے میں بھی ایک ادیب اور شاعر کو کامیاب بناتا ہے۔

معلومات کی جانچ:

1۔ مجاز مرسل کے تعلقات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ مجاز عقلی کی تعریف مثالوں کے ساتھ ذکر کیجیے۔

3۔ سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

4۔ حالیت، محلیت اور مجاورت مجاز مرسل کے کس تعلق کے تحت آتے ہیں؟ مثالوں کے ذریعے واضح کیجیے۔

6.9 کنایہ

6.9.1 لغوی تعریف

عربی زبان میں کنایہ مصدر ہے اور اس کا مادہ **كني** ہے۔ جب کوئی شخص کسی چیز کی تصریح نہیں کرے تو اس سے کہا جاتا ہے **كنيت عن كذا** یعنی آپ نے اس چیز کی صراحت نہیں کی بلکہ اشارہ میں بیان کر دیا۔ ابن حماد جوہری (1002-940) کنایہ کا معنی بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص کچھ بولے اور اس سے اس کے معنیٔ اصلی کے علاوہ کچھ اور مراد لے تو اسے کنایہ کہتے ہیں۔ ''**قد كنيت بكذا عن كذا وكنوت**'' اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی چیز کو اشارہ میں کہے اور کلام کا ظاہری معنی مراد نہ لے۔ ابن منظور نے **لسان العرب** میں کنایہ کا مصدر **كني** بتایا ہے اور **تكني** کو **تستر** سے تعبیر کیا ہے یعنی چھپانا اور اس کے بعض مشتقات کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ **استكن الشيء** کا معنی **استتر الشيء** ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ کسی چیز کے چھپانے کو لغت میں کنایہ کہتے ہیں۔

6.9.2 اصطلاحی تعریف

اسالیب بیان میں سے ایک عمدہ اسلوب کا نام کنایہ ہے جسے اہل بلاغت اپنی قدرت وصلاحیت اور تخلیقی قوت کے اعتبار سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کی تعریف علامہ عبدالقاہر جرجانی یوں کرتے ہیں: **كلام استتر المراد منه بالاستعمال وإن كان معناه ظاهرا في اللغة سواء كان المراد به الحقيقة أو المجاز**۔ یعنی ایسا کلام جس کی مراد استعمالاً ظاہر نہ ہو اگرچہ اس کا معنی لغۃً ظاہر ہو خواہ اس سے حقیقت مراد ہو یا مجاز۔

آسان لفظوں میں کنایہ کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ کنایہ ایسا لفظ جس سے اس کا لازم معنی مراد لیا جائے اور اس کا اصلی معنی مراد لینا بھی جائز ہو۔ جیسے: "**زيد طويل النجاد**" اور اس سے مراد ایک بہادر انسان لیا جائے کیونکہ جس انسان کے تلوار کے پٹے کی لمبائی زیادہ ہوگی وہ لازمی طور پر ایک لمبا انسان ہوگا اور عام طور پر عرب میں لمبے انسان کو بہادروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس جملے میں **نجاد** کا اصلی معنی مراد لینا بھی درست ہے۔

یاد رکھیں کہ کنایہ کی طرح مجاز میں بھی حقیقی معنی متروک ہوتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ کنایہ میں لازمی اور اصلی دونوں معنی مراد لینا جائز ہے اور مجاز میں اصلی معنی مراد لینا جائز نہیں ہے۔

6.9.3 کنایہ کے اقسام

کنایہ میں دو چیزیں اہم ہوتی ہیں: ایک وہ لفظ جس کا ظاہری معنی مراد نہ ہو اسے مکنی عنہ کہا جاتا ہے اور دوسرا اس لفظ (مکنی عنہ) کا وہ لازمی معنی جو مراد ہو اسے مکنی کہا جاتا ہے۔ مثلاً: **زيد ألقى سلاحه** یعنی زید نے ہتھیار ڈال دیا۔ اس مثال میں ہتھیار ڈالنے کے ذریعے شکست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں مکنی عنہ **إلقاء السلاح** ہے جو یہاں مراد نہیں بلکہ اس کا لازمی معنی مراد ہے اور وہ استسلام اور شکست تسلیم کرنا ہے اور اسے

مکنی کہتے ہیں۔

مکنی عنہ کے اعتبار سے کنایہ کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ کنایۃ عن الصفۃ　　۲۔ کنایۃ عن الموصوف　　۳۔ کنایۃ عن النسبۃ

6.9.3.1 كناية عن الصفة

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں کوئی ایسی صفت ہو جس کے ذریعے اس کے لازم معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہو اور وہی متکلم کا مقصود ہو۔ یہاں صفت سے لفظی صفت نہیں بلکہ معنوی صفت مراد ہے جیسے سخاوت اور بہادری وغیرہ۔ مثلاً **خالد نقي الثوب**۔ یعنی خالد کا لباس صاف ستھرا ہے۔ اس میں لباس کی صفائی سے عفت و پاکیزگی اور نیکی کی طرف کنایہ کیا گیا ہے۔ خنساء نے اپنے بھائی کی موت پر جو اشعار کہیں ان میں اس شعر میں غور کریں:

رفيعُ　العِماد　طويلُ　النِجا　دِ　ساد　عشيرتَه　أمرَدًا

بلند عصا اور طویل دستے والا ہے جو کم سنی ہی میں اپنے قبیلہ کا سردار ہو گیا۔

خنساء نے اس شعر کے ذریعے اپنے بھائی صخر کی بہادری و عظمت اور کرم کو بیان کیا ہے۔ شاعرہ نے صراحۃً اپنے بھائی کو بہادر، صاحب عظمت و کرم نہیں کہا بلکہ اس کے لیے ان تینوں صفات کا استعمال کیا۔ پہلی صفت **طویل النجاد** ہے، اس سے بہادری کی طرف کنایہ ہے کیونکہ جس کے تلوار کا پٹہ طویل ہوگا وہ یقیناً لمبی قامت کا انسان ہوگا اور طویل القامت انسان کا شمار بہادروں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری صفت **رفیع العماد** سے سرداری اور عظمت و رفعت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عام طور پر بلند عصا بلند مرتبت کا متقاضی ہے۔ **ساد عشيرته أمردا** سے مراد انتہائی باکمال انسان ہے کیونکہ کم سنی میں سردار ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ اس میں سرداری کی تمام خصوصیات پائی جائیں اور کم سنی میں ان تمام صفات کا حامل ہونا بڑے کمال کی بات ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ خنساء کا بھائی صخر کم سنی میں ہی عظمت و شرافت اور بہادری کی وجہ سے اپنی قوم کا سردار بن گیا۔

کبھی لفظ کا لازم معنی کی طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا بلکہ معنیٔ مطلوب تک پہنچنے میں ایک یا چند واسطوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے **أحمد كثير الرماد**۔ یعنی احمد زیادہ راکھ والا ہے۔ اس مثال میں راکھ کی کثرت سے زیادہ جلاون جلنے پر دلالت ہوتی ہے اور زیادہ جلاون کا استعمال زیادہ کھانا پکانے کا متقاضی ہے جو زیادہ مہمان کو مستلزم ہے اور اس سے اہل خانہ کی زیادہ مہمان نوازی پر دلالت ہوتی ہے اور یہی مقصود ہے۔

6.9.3.2 كناية عن الموصوف

کنایہ میں اگر مکنی عنہ موصوف ہو تو اسے کنایہ عن الموصوف کہتے ہیں۔ جیسے **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ** یعنی اپنے رب کے حکم آنے تک صبر کریں اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں۔ اس مثال میں صاحب حوت جو کہ موصوف ہے سے یونس علیہ السلام کی طرف کنایہ ہے۔

کنایہ عن الموصوف میں کبھی مکنی عنہ اور مکنی دونوں ایک ہوتے ہیں اور کبھی مکنی عنہ تو متعدد ہوتے ہیں مگر مکنی ایک ہی ہوتا ہے یعنی کبھی کسی ایک

موصوف کا ایک لازم معنی ہوتا ہے اور کبھی چند موصوف کا بھی ایک ہی لازم معنی ہوتا ہے۔ ایک موصوف کی مثال ابونواس کے اس شعر میں ملاحظہ کریں:

فلما شربناها ودبَّ دبيبُها إلى موطنِ الأسرار قلت لها: قفي

یعنی جب ہم شراب پی چکے اور اس کے آثار دل یا دماغ پر طاری ہونے لگے تو میں نے اس کہا کہ ٹھہر جا۔

اس شعر میں موطن الأسرار مکنی عنہ ہے اور اس سے مراد دل یا دماغ ہے کیونکہ انہی دونوں میں سے ایک خیالات کا مسکن وموطن ہے اور یہیں سارے خیالات محفوظ رہتے ہیں۔ لہذا موطن الأسرار سے دل یا دماغ کی طرف اشارہ کنایہ عن الموصوف کہلائے گا۔

کبھی کبھی مکنی عنہ اور موصوف چند ہوتے ہیں۔ جیسے: جاءني حي مستوى القامة، عريض الأظفار یعنی میرے پاس ایک قبیلہ لمبی قامت اور چوڑے ناخن والا آیا۔ اس مثال میں حي مستوى القامة اور عريض الأظفار سے انسان کی طرف کنایہ ہے کیونکہ یہ ساری خوبیاں انسان میں ہی پائی جاتی ہیں اور جیسے بحتری کا یہ شعر:

فأَتبعتُها أخرى فأضلَلْتُ نَصلَها بِحَيثُ يكونُ اللبُّ والرُّعبُ والحِقْدُ

تو میں نے دوسرا تیر چلایا جس کا پھل ٹھیک اس جگہ پیوست ہو گیا جہاں عقل، رعب اور کینہ ہوتے ہیں۔

اس شعر میں بحتری نے اپنے شکار کی منظر کشی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب ایک تیر سے بات نہیں بنی تو اس نے دوسرا تیر چلایا اور اتنا درست نشانہ لگایا کہ تیر ٹھیک اس کے دل کے پار ہو گیا مگر شاعر نے صراحت کے ساتھ دل کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ اس کی چند صفات کا ذکر کیا اور وہ عقل، رعب اور کینہ ہیں اور چونکہ یہ صفات دل کی ساتھ خاص ہیں لہذا اسے کنایہ عن الموصوف کہیں گے۔ واضح رہے کہ یہاں موصوف ایک نہیں بلکہ چند ہیں۔

6.9.3.3 كناية عن النسبة

کنایہ عن النسبہ میں موصوف کی طرف منسوب کسی نسبت سے کنایہ کیا جاتا ہے خواہ وہ نسبت مثبت ہو یا منفی۔ بالفاظ دیگر موصوف سے متعلق کوئی نسبت اگر مکنی عنہ ہو تو اسے کنایہ عن النسبہ کہیں گے۔ جیسے: الفصاحة في بيان خالد۔ یعنی خالد کے بیان میں فصاحت ہے۔ اس مثال میں فصاحت کی نسبت خالد کے بیان کی طرف ہے اور اس سے مراد خالد کی ذات ہے لہذا جملہ کا مفہوم ہوگا کہ خالد فصیح ہے اور جیسے زیاد الاعجم کا یہ شعر ابن حشرج کی مدح میں:

إنّ السماحةَ والمروءةَ والنَدَى في قُبَّةٍ ضُرِبَت على ابن الحشرج

یعنی درگزری، مروت اور جود وسخاوت ایک ایسے گنبد میں ہے جو ابن حشرج کے اوپر ہے۔

اس شعر میں شاعر نے ابن حشرج کی درگزری، مروت اور جود وسخا کو بیان کیا ہے مگر صراحت کے بجائے اس نے ان اوصاف کو ایک گنبد میں جمع کر دیا اور اس کی نسبت ممدوح کی طرف کر دیا۔ لہذا یہ کنایہ عن النسبہ ہوا۔

اسی طرح ابونواس کا یہ شعر:

فما جازَہ جُودٌ ولا حلَّ دونَہ   ولکن یسیرُ الجود حیثُ یَسِیرُ

سخاوت نہ اس کے آگے چلتی ہے اور نہ ہی پیچھے بلکہ وہ جہاں جاتا ہے سخاوت اس کے ساتھ چلتی ہے۔

شاعر اس شعر میں اپنے ممدوح کی طرف جود و کرم کی نسبت کیا ہے اور اس کی یہ صفت بیان کیا ہے۔ لیکن اس نے صراحۃً اسے کریم اور صاحب جود و سخا نہ کہہ کر جود و سخا کی نسبت اس کی طرف کر دی اور کہا کہ جہاں جہاں وہ جاتے ہیں جود و سخا ان کے ساتھ چلتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے ان کا صاحب جود و سخا ہونا لازم آتا ہے یعنی ممدوح پیکر جود و سخا ہے۔

6.10 اکتسابی نتائج

حقیقت اور مجاز کا شمار اسالیب بیان میں ہوتا ہے۔ لفظ اگر اپنے اصلی اور موضوع لہ معنی میں استعمال ہو تو اسے حقیقت کہتے ہیں اور اگر دوسرے معنی میں استعمال ہو اور کوئی ایسا قرینہ بھی پایا جائے جس کی وجہ سے حقیقی معنی مراد لینا درست نہ ہو تو اسے مجاز کہتے ہیں۔ مجاز کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ مجاز لغوی، ۲۔ مجاز عقلی۔

مجاز لغوی میں مجاز مرسل اور استعارہ شامل ہوتے ہیں، مجاز مرسل کے بہت سارے تعلقات ہیں جسے عربی میں علاقات کہتے ہیں۔ یہ علاقات حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان پیدا ہونے والے رابطوں کا دوسرا نام ہے۔ مجاز مرسل کے مشہور علاقات یہ ہیں: سببیت، مسببیت، آلیت، کلیت، جزئیت، حالیت، محلیت، مجاورت، اعتبار ماضی اور اعتبار مستقبل۔

لفظ اگر حقیقی معنی میں استعمال نہ ہوا ہو بلکہ دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہو اور اس کا حقیقی اور موضوع لہ معنی مراد لینا بھی درست ہو تو اسے کنایہ کہتے ہیں۔ بلفظ دیگر کسی لفظ کا ظاہری معنی ترک کر کے اس کا لازمی معنی مراد لینا کنایہ کہلاتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ کنایہ عن الصفہ، کنایہ عن الموصوف اور کنایہ عن النسبہ۔ اگر لازمی معنی کسی صفت کا ہو تو اسے کنایہ عن الصفہ کہتے ہیں اور اگر لازمی معنی کسی موصوف کا ہو تو اسے کنایہ عن الموصوف کہتے ہیں اور اگر لازمی معنی کسی صفت یا موصوف کا نہ بلکہ موصوف کی طرف کی گئی کسی نسبت کا ہو تو اسے کنایہ عن النسبہ کہتے ہیں۔

6.11 امتحانی سوالات کے نمونے

1۔ حقیقت اور مجاز کے درمیان کیا فرق ہے مثالوں کے ذریعے واضح کیجیے۔

2۔ مجاز مرسل کے مشہور تعلقات کو مع امثلہ بیان کیجیے۔

3۔ کلام میں مجاز مرسل کے اسلوب کی اہمیت اور مجاز مرسل کی بلاغت کو قلمبند کیجیے۔

4۔ مجاز کی کتنی قسمیں ہیں اور کون کون سی ہیں؟ تعریف اور مثالوں کے ساتھ واضح کیجیے۔

5۔ تعلق غائیت کے تحت کتنے تعلقات آتے ہیں؟ مثالوں کے ذریعے واضح کیجیے۔

6۔ مجاز مرسل کے کس تعلق کے تحت کلیت اور جزئیت آتے ہیں؟ بالتفصیل لکھیے۔

7۔ کنایہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف کیجیے۔

8۔ کنایہ کی اقسام بیان کرتے ہوئے ہر ایک کی ایک ایک مثال پیش کیجیے۔

6.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔البلاغة الواضحة	علي جارم، مصطفى أمين
۲۔علم البيان	عبد العزيز عتيق
۳۔في البلاغة العربية: علم البيان	محمد مصطفى هدارة
۴۔دروس البلاغة	حفني ناصف، سلطان محمد
۵۔أسرار البلاغة في علم البيان	عبد القاهر الجرجاني

اکائی 7 استعارہ: تعریف اور اقسام

اکائی کے اجزا

7.1 تمہید

7.2 مقصد

7.3 استعارہ کی تعریف

7.4 استعارہ کے ارکان

7.5 استعارہ کی اقسام

7.5.1 استعارہ تصریحیہ ومکنیہ

7.5.2 استعارہ اصلیہ وتبعیہ

7.5.3 استعارہ مرشحہ

7.5.4 استعارہ مجردہ

7.5.5 استعارہ مطلقہ

7.5.6 استعارہ

7.6 اکتسابی نتائج

7.7 فرہنگ

7.8 امتحانی سوالات کے نمونے

7.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

7.1 تمہید

استعارہ علم البیان کا ایک اہم جز ہے جس میں کلام کو خوب صورت اور بلیغ بنانے کے لیے ایک لفظ کو معنوی مناسبت کی بنا پر دوسری جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز استعارہ میں حقیقی اور مجازی معنی میں مشابہت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔لیکن اس میں اداۃ تشبیہ محذوف ہوتی ہے۔ جیسے زید أسد (زید شیر ہے) اور کبھی مشبہ ذکر کر کے مشبہ بہ مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے: چاند کہہ کر چہرہ اور شیر کہہ کر شجاع مراد لینا۔ استعارہ اور تشبیہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ استعارہ تشبیہ سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے، کیونکہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کو ذکر کیا جاتا ہے جب کہ استعارہ میں مشبہ کو ذکر نہیں کیا جاتا صرف مشبہ بہ مذکور ہوتا ہے۔

استعارہ کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں حقیقی اور مجازی معنی میں مشابہت کے علاقہ کے باوجود حقیقی معنی مراد نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ حقیقی معنی مراد لینے سے متکلم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور کلام غیر بلیغ ہو جاتا ہے۔

7.2 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ:

☆ فن استعارہ سے واقف ہو سکیں۔

☆ استعارہ کی اقسام اور ارکان اور اس کے بنیادی عناصر کو بخوبی سمجھ سکیں۔

☆ طالب علم اپنا کلام بلیغ بنانے کے لیے استعارہ کا استعمال کرنے پر قادر ہو سکیں۔

☆ عربی نصوص اور عبارتوں میں استعارہ کو پہچان سکیں۔

7.3 استعارہ کی تعریف

7.3.1 استعارہ کا لغوی معنی

استعار یستعیر استعارة یہ باب استفعال سے ہے اور اس کے لغوی معنی ادھار لینا ہے **(طلب العارية)**۔ اسی سے عربوں کا قول ہے: **استعرت الشيء استعارة.** (میں نے ایک چیز ادھار لی) جیسے اگر کوئی اپنے دوست سے کتاب ادھار لے تو وہ مستعیر اور دوست مستعار منہ اور کتاب مستعار ہوگی اور یہ ادھار لین دین استعارہ کہلائے گا۔

7.3.2 استعارہ کا اصطلاحی معنی

اصطلاح میں ایک شئے کو بعینہ دوسری شئے قرار دے دیا جائے اور اس دوسری شئے کے لوازمات پہلی شئے سے منسوب کر دیے جائیں تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ مثلاً: خالد تو شیر ہے۔

توضیح: اگر آپ خالد کی بہادری کا وصف بیان کرنا چاہیں، تو آپ اس کو بہادری میں شیر سے تشبیہ دیں گے اور آپ یہ کہیں گے: **خالد كالأسد في الشجاعة**، لیکن اس مثال میں شیر ہی (خالد سے) زیادہ بہادر رہے گا، کیونکہ تشبیہ کی یہ شرط ہوتی ہے کہ مشبہ بہ وجہ شبہ میں مشبہ سے زیادہ قوی ہو اور اگر

آپ کلام کواور زیادہ بلیغ کرنا چاہتے ہیں تو آپ اس طرح کہیں گے: خالد کالأسد(خالد شیر کی طرح ہے)، یہ تشبیہ پچھلی تشبیہ سے زیادہ بلیغ ہوگی کیونکہ اس مثال میں آپ خالد کو شیر سے تشبیہ دے رہے ہیں بغیر وجہ شبہ کی طرف اشارہ کیے۔لیکن اس مثال میں بھی شیر خالد سے قوی رہے گا کیونکہ تشبیہ کی یہ شرط ہوتی ہے کہ مشبہ بہ وجہ شبہ میں مشبہ سے زیادہ قوی ہو۔اگر آپ کلام کو تشبیہ میں انتہائی درجے تک بلیغ بنانا چاہتے ہیں تو آپ اس طرح کہیں گے۔ خالد أسد(خالد تو شیر ہے) یہ تشبیہ سب سے بلیغ ہوگی لیکن اب بھی استعارہ نہیں ہوگی کیونکہ مشبہ بہ ابھی بھی اقوی ہے۔اگر مشبہ کو ذکر ہی نہ کیا جائے اور بولا جائے ذهبت إلى المدرسة ولقيت من الطلاب و رأيت منهم أسداً۔اس مثال میں اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہاں مشبہ محذوف ہے اور سیاق کلام سے پتا چل رہا ہے کہ جس کو شیر کہا گیا درحقیقت وہ بھی طلبا میں سے ایک طالب علم ہے چنانچہ اس مثال میں منهم وہ قرینہ لفظیہ ہے جو لفظ کے حقیقی معنی مراد لینے سے مانع ہے۔پس متکلم کا حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی میں لفظ أسد کا استعمال کرنا ہی استعارہ کہلائے گا۔

لہذا معلوم ہوا کہ کسی لفظ کو مجازی معنی میں اس طرح استعمال کرنا کہ اس لفظ کا اپنے حقیقی معنی سے مشابہت کا علاقہ ہو اور کوئی ایسا قرینہ بھی موجود ہو جو لفظ کے حقیقی معنی مراد لینے سے مانع ہو(قرینہ کبھی لفظیہ ہوتا ہے اور کبھی حالیہ)، نیز طرفین تشبیہ میں سے ایک محذوف بھی ہو، اس کو استعارہ کہتے ہیں۔

قرینہ لفظیہ کی مثال:

کوئی شاعر اپنی ممدوحہ کو تشبیہ دیتا ہے جب کہ وہ اس کے اوپر سایہ کررہی ہے:

قَامَتْ تُظَلِّلُنِيْ ومِنْ عَجَبٍ   شمسٌ تُظلِّلني مِنَ الشمْسِ

(وہ مجھ پر سایہ کرنے لگی اور تعجب ہے کہ سورج ہی سورج سے سایہ کررہا ہے)

مذکورہ بالا مثال میں پہلے شمس سے ممدوحہ مراد اور دوسرے شمس سے حقیقی سورج مراد ہے اور دونوں میں علاقہ مشابہت کا ہے، یعنی سورج کی چمک اور ممدوحہ کے چہرے کی چمک مشترک صفت ہے اور اصلی سورج سایہ نہیں کرسکتا اس لیے لفظ تظللني وہ لفظی قرینہ ہے جو شمس کے حقیقی معنی مراد لینے سے مانع ہے۔

قرینہ حالیہ کی مثال:

الٓرٰ كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ(سورة إبراهيم، آیت-1)

(الرٰ! یہ عالی شان کتاب ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف لائیں، ان کے پروردگار کے حکم سے، زبردست اور تعریفوں والے اللہ کے راستہ کی طرف۔)

اللہ تعالی کے اس قول میں لفظ ظلمات کو تشبیہ دی گئی ہے ضلال سے۔ظلمات اور ضلال کا عدم ہدایت میں یکساں ہونے کی وجہ سے۔ اسی طرح لفظ نور کو إيمان سے تشبیہ دی گئی، ان دونوں کے ہدایت میں یکساں ہونے کی وجہ سے اور لفظ صراط کو إسلام سے تشبیہ دی گئی، ان دونوں میں اس بات کی مشابہت ہونے کی وجہ سے کہ ان میں سے ہر ایک مقصد(مطلوب) تک پہنچانے والا ہے اور اس استعارہ میں قرینہ حالیہ ہے اور وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ حقیقی تاریکی (ظلمات) سے حقیقی روشنی (نور) کی طرف دعوت نہیں دے رہے تھے بلکہ کتاب (قرآن) کے ذریعے کفر کی تاریکی (گمراہی) سے ایمان کی روشنی کی طرف ہدایت دے رہے تھے۔

7.4 استعارہ کے ارکان

استعارہ کے تین اجزا ہوتے ہیں۔

مستعار له: وہ شخص یا چیز جس کے لیے کوئی لفظ یا خوبی ادھار لیا جائے۔(المشبه)

مستعار منه: وہ شخص یا چیز جس سے کوئی لفظ یا خوبی کو مستعار لیا جائے۔(المشبه به)

ان دونوں ارکان کو طرفان کہا جاتا ہے۔

مستعار: مستعار له اور مستعار منه میں جو وصف اور خوبی مشترک ہو اسے مستعار یا وجہ جامع کہا جاتا ہے۔

یاد رکھنے کے نکات:

- متکلم کا حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی میں لفظ کا استعمال کرنا ہی استعارہ کہلاتا ہے۔
- ایک شئے کو بعینہ دوسری شئے قرار دے دیا جائے اور اس دوسری شئے کے لوازمات پہلی شئے سے منسوب کر دیے جائیں اسے استعارہ کہتے ہیں۔

استعارہ کے تین اجزا ہوتے ہیں۔مستعار، مستعار لہ اور مستعار منہ۔

مستعار لہ: وہ فرد یا چیز جس کی بات کی جا رہی ہو(المشبہ)۔

مستعار منہ: وہ چیز ہے جس کو مستعار لیا جائے (المشبہ بہ)

مستعار: مستعار لہ اور مستعار منہ میں جو بات مشترک ہو اسے مستعار یا وجہ جامع کہا جاتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1- استعارہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف کیجیے۔

2- استعارہ کی دو مثالیں دیجیے۔

3- استعارہ کے ارکان کتنے ہیں مثال کے ساتھ واضح کیجیے؟

7.5 استعارہ کے اقسام

استعارہ کے درج ذیل اقسام ہیں۔

7.5.1 الاستعارة التصريحية و المكنية

طرفین (مشبہ اور مشبہ بہ) کے مذکور ہونے کے اعتبار سے استعارہ کے درج ذیل اقسام ہیں۔

ا- الاستعارة التصريحية

وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ محذوف ہو اور اس کی جگہ مشبہ بہ کو مستعار (ادھار) لے لیا جائے تا کہ یہ دعوی کیا جا سکے کہ مشبہ محذوف بعینہ مشبہ بہ کی طرح ہے اور مشبہ محذوف پر دلالت کرنے کے لیے اس کے لوازمات میں سے کسی کا ذکر کیا گیا ہو نیز یہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ

صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو،اس کو استعارہ تصریحیہ کہتے ہیں۔مثلاً:

فَقَدْنَا الْيَوْمَ شَمْساً مُنِيراً (آج ہم نے ایک روشن آفتاب کھو دیا)

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (سورة الفاتحة-6)

پہلی مثال میں عالم کو سورج سے تشبیہ دی گئی ہے لہذا عالم مشبہ ہے جس کو حذف کر کے اس کی جگہ مشبہ بہ یعنی سورج کو مستعار لے لیا گیا ہے اور فقدنا ایک ایسا لازمہ یا قرینہ لفظیہ ہے جس کا تعلق انسان سے ہے اس لیے وہ مشبہ بہ پر بھی دلالت کر رہا ہے۔لہذا اس کو استعارہ تصریحیہ کہیں گے۔

دوسری مثال میں دین اسلام کو الصراط المستقیم سے تشبیہ دی گئی ہے لہذا دین اسلام مستعار لہ (مشبہ) ہے جس کو حذف کر کے اس کی جگہ مستعار منہ (مشبہ بہ) یعنی الصراط المستقیم کو مستعار لے لیا گیا ہے اور اس کا قرینہ حالیہ ہے اور وہ یہ کے مستعار لہ اور مستعار منہ دونوں ہی مقصد میں ہم آہنگ ہیں۔

ب- الاستعارة المكنية

جس میں مشبہ بہ حذف کر دیا جائے اور مشبہ بہ کے لوازم میں سے کسی لازم کے ذریعہ مشبہ بہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے اسی کو استعارہ مکنیہ کہتے ہیں۔مثلاً :قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْباً (مریم: 4) (اے میرے رب! بے شک میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور سر کے بال سفید ہو گئے ہیں)اور حجاج بن یوسف کا یہ قول:إِنِّي لأَرَىٰ رُؤُوساً قَدْ أَيْنَعَتْ وَحَانَ قِطَافُهَا وَإِنِّي لَصَاحِبُها- (یقینا میں کچھ ایسے سر دیکھ رہا ہوں کہ وہ پک گئے ہیں اور ان کے توڑنے کا وقت آچکا ہے اور میں ان کو توڑنے ہی والا ہوں)

دوسری مثال میں إني لأَرَىٰ رُؤُوساً قَدْ أَيْنَعَتْ میں غور کرنے پر پتا چلتا ہے کہ یہاں حجاج بن یوسف نے رؤوس یعنی سروں کو ثمرات یعنی پھلوں سے تشبیہ دی ہے اور فعل أينعتْ محذوف مشبہ بہ کے لوازمات میں سے ایک لازم ہے جو مشبہ بہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔لہذا اصل عبارت اس طرح ہوگی "إني لأَرَىٰ رُؤُوساً كَالثَّمَرَاتِ قَدْ أَيْنَعَتْ" اس لیے یہ استعارہ مکنیہ کہلائے گا۔

اسی طرح پہلی مثال میں 'رأس 'کو ایندھن سے تشبیہ دی گئی ہے، پھر مشبہ بہ کو حذف کر کے اس کی طرف اس کے ایک لازم "اشتعل" کے ذریعہ اشارہ کر دیا گیا،لھذا یہاں استعارہ مکنیہ ہے۔

یاد رکھنے کی باتیں:

- طرفین (مشبہ اور مشبہ بہ) کے مذکور ہونے کے اعتبار سے استعارہ کی دو اقسام ہیں ان میں سے ایک استعارہ تصریحیہ ہے اور ایک مکنیہ کہلاتی ہے۔
- استعارہ تصریحیہ وہ ہے جس میں مشبہ محذوف ہو اور اس کی جگہ مشبہ بہ کو مستعار (ادھار) لے لیا جائے۔
- استعارہ مکنیہ وہ ہے جس میں مشبہ بہ حذف کر دیا جائے اور مشبہ بہ کے لوازم میں سے کسی لازم کے ذریعہ مشبہ بہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

معلومات کی جانچ

1- استعارہ تصریحیہ کو مثالوں سے واضح کیجیے۔

2- استعارہ مکنیہ کسے کہتے ہیں؟

3- استعارہ تصریحیہ اور مکنیہ کی ایک ایک مثال دیجیے۔

4- استعارہ تصریحیہ اور مکنیہ میں کیا فرق ہے۔

7.5.2 الاستعارة الأصلية و التبعية

أ- **الاستعارہ الأصلية**

وہ استعارہ ہے، جس میں استعارہ کیا جانے والا لفظ اسم جامد ہو۔ مثلا:

غَضَّنَا الدَّهْرُ بِنَابِه لَيتَ مَا حَلَّ بِنَابِه

(زمانے نے ہمیں داہنے دانت سے کاٹ کھایا، کاش جو مصیبت ہم پر اتری، زمانے پر اترتی)۔

متنبی نے کہا ہے:

حَمَلْتُ إلَيه مِنْ لِسَانِي حَدِيْقَةً سَقَاهَا الْحِجى سَقْيَ الرِّيَاضِ السَّحَائِب

(میں ممدوح کے پاس اپنی زبان کا باغ اٹھا کر لایا، جس کو عقل نے سیراب کیا بادلوں کے باغ کو سیراب کرنے کی طرح)

توضیح: پہلی مثال میں دھر کو پھاڑ کر کھانے والے درندے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے وجہ جامع ایذا ہے، پھر مشبہ بہ کو حذف کر کے اس کے ایک لازم 'غضنا' سے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ لہذا یہ استعارہ مکنیہ اصلیہ ہے کیونکہ 'الدھر' اسم جامد ہے۔

دوسری مثال میں شاعر نے شعر کو باغ سے دونوں میں وجہ جامع جمال کے سبب سے تشبیہ دی ہے پھر مشبہ بہ پر دلالت کرنے والے لفظ کو مشبہ کے لیے مستعار لے لیا گیا پس یہ استعارہ تصریحیہ ہے اور 'الحجی' بمعنی عقل کو سحاب سے وجہ جامع حسن تاثیر کی وجہ سے تشبیہ دی گئی اور مشبہ بہ کو حذف کر کے اس کے ایک لازم 'سقی' سے اشارہ کیا گیا ہے۔ لہذا یہ استعارہ مکنیہ اصلیہ ہے۔

ب- **الاستعارة التبعية**

جس لفظ میں استعارہ جاری ہوا ہے اگر وہ اسم مشتق ہو یا فعل ہو تو وہ استعارہ تبعیہ کہلائے گا۔ جیسے: شاعر اپنے کلام کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

إذَا مَا صَافح الأَسْماعَ يوماً تبسَّمَتْ الضَّمائِرُ وَالْقُلُوْب

(جب یہ کلام کانوں میں داخل ہوتا ہے تو ضمیر اور دل دونوں ہی جھومنے لگتے ہیں۔)

مذکورہ مثال میں کانوں میں داخل ہونے کو صافح یعنی مصافحہ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے، جب کہ حقیقتاً اشعار کانوں سے مصافحہ نہیں کر سکتے بلکہ کانوں میں داخل ہوتے یا سنائی پڑتے ہیں، لہذا سنائی پڑنے یا إصابة کو مصافحہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ دونوں میں آپس میں ملنا مشابہت کا علاقہ ہے۔ پھر إصابة کو محذوف کر کے اس کی جگہ صافح فعل کو بمعنی إصابة مشتق کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ استعارہ تبعیہ کہلائے گا۔

اسی طرح متنبی نے شیر کی تعریف میں کہا ہے:

وَرْدٌ إذَا وَرَدَ البُحَيرةَ شارباً وَرَدَ الْفُرَاتَ زَئِيْرُهُ وَالنِّيْلاَ

(وہ سرخی مائل شیر جب طبریہ جھیل پر پانی پینے کے لیے آتا ہے تو اس کی چنگھاڑ دریائے فرات اور نیل تک پہنچتی ہے)

اس مثال میں شیر کی آواز کے دریائے فرات ونیل تک پہنچنے کو پانی کے پہنچنے کے ساتھ، دونوں میں علاقہ مشابہت غایت تک پہنچنا ہے اور مشبہ بہ پر دلالت کرنے والے لفظ الورود کو مشبہ (وصول الصوت) کے لیے مستعار لیا گیا، پھر الورود بمعنی وصول الصوت سے ورد معنی وصل مشتق کیا گیا۔

یاد رکھنے کے نکات:

- استعارہ اصلیہ وہ استعارہ ہے، جس میں استعارہ کیا جانے والا لفظ اسم جامد ہو۔
- جس لفظ میں استعارہ جاری ہوا ہے اگر وہ اسم مشتق ہو یا فعل ہو تو استعارہ تبعیہ کہلائے گا۔

معلومات کی جانچ

1- استعارہ اصلیہ کسے کہتے ہیں؟

2- استعارہ تبعیہ کی تعریف اپنے الفاظ میں کیجیے نیز مثالوں سے واضح کیجیے۔

3- استعارہ اصلیہ اور تبعیہ میں کیا فرق ہے؟

7.5.3 الاستعارة المرشحة

وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کے مناسب کو ذکر کیا جائے۔ یعنی جس میں استعارہ کا عمل مکمل ہونے کے بعد آگے مشبہ بہ کی مناسبت کی کوئی بات ذکر کی گئی ہو مرشحہ کہلائے گا۔ جیسے: خُلُقُ فُلانٍ أَرَقُّ مِنْ أَنفاس الصَّبا إذا غازلت أَزْهارَ الرُّبا. (فلاں شخص کے اخلاق بادصبا کے جھونکوں سے زیادہ نرم ہیں، جب وہ ٹیلے کے پھولوں سے عشق ومحبت کی باتیں کرے)

اس مثال میں کلمہ صبا (مشرق سے چلنے والی ہوا) میں استعارہ کا عمل جاری ہوا ہے، اس لیے کہ صبا کو انسان سے تشبیہ دی ہے، پھر مشبہ بہ کو حذف کر کے اس کی طرف اس کے لازم انفاس سے اشارہ کیا گیا اور یہی انفاس مکنیہ کا قرینہ ہے اور غازلت یعنی باتیں کرنا مشبہ بہ کے مناسب عمل ہے۔ اس لیے یہ استعارہ مکنیہ مرشحہ کہلائے گا۔

7.5.4 الاستعارة المجردة

وہ استعارہ جس کے ساتھ مشبہ کا مناسب ذکر کیا جائے یعنی جس میں استعارہ کا عمل مکمل ہونے کے بعد آگے مشبہ کی مناسبت کی کوئی بات ذکر کی گئی ہو۔ وہ مجردہ کہلاتا ہے۔ جیسے بحتری کا یہ شعر:

يُؤَدُّونَ التَّحِيَّةَ مِنْ بَعيدٍ إلٰى قَمرٍ مِنَ الإيوان بادِ

(وہ لوگ دور ہی سے سلام کرتے ہیں ایسے چاند کو جو بالا خانے سے ظاہر ہوتا ہے۔)

اس مثال میں ممدوح کو قمر یعنی چاند سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس کی طرف اشارہ کرنے والا قرینہ یؤدون التحیة ہے۔ چنانچہ قمر مشبہ بہ ہے اور آگے بعید من الإیوان باد کا ذکر کیا گیا جو مشبہ یعنی ممدوح سے متعلق ہے اور مشبہ محذوف ہے۔ لہذا یہ استعارہ تصریحیہ مجردہ ہے۔

نوٹ: استعارہ مرشحہ یا مجردہ اسی وقت ہوتا ہے جب کہ استعارہ اپنے قرینہ لفظیہ یا حالیہ سے مل کر پورا ہو چکا ہو۔

7.5.5 الاستعارة المطلقة

یہ وہ استعارہ ہے جو مشبہ بہ اور مشبہ کے مناسبات سے خالی ہو، یعنی وہ استعارہ جس میں استعارہ کا عمل مکمل ہونے کے بعد آگے مشبہ یا مشبہ بہ سے متعلق کوئی بات ذکر نہ کی گئی ہو۔ اسی کو استعارہ مطلقہ کہتے ہیں۔ جیسے: **إنّي شديدُ العطشِ إلى لِقائِک**. (مجھے آپ سے ملنے کا شدید اشتیاق ہے)۔ اس مثال میں اشتیاق کی تشبیہ عطش سے دی گئی ہے اور دونوں میں قرینہ إلى لقائک ہے اور آگے مشبہ اور مشبہ بہ کا کوئی متعلق مناسبات بھی نہیں پایا جارہا ہے۔ لہذا یہ اسعتارہ مطلقہ کہلائے گا۔

7.5.6 الاستعارة التمثيلية

ہر وہ ترکیب جو غیر موضوع لہ معنی میں مستعمل ہو مشابہت کے علاقہ کی وجہ سے اور ساتھ ہی وہ قرینہ بھی موجود ہو جو حقیقی معنی مراد لینے سے مانع ہو تو اس کو استعارہ تمثیلیہ کہتے ہیں۔ جیسے متنبی کا یہ قول:

وَمَن يَکُ ذَا فَمٍ مُرٍّ مَرِيضٍ يَجِدْ مُرًّا بِهِ المَاءَ الزُّلَالَا

(جو شخص کڑوے منہ والا مریض ہوتا ہے، تو وہ اس کی وجہ سے میٹھا پانی بھی کڑوا محسوس کرتا ہے)

اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ وہ مریض جس کا ذائقہ کڑوا ہو تو اس کو میٹھا پانی بھی کڑوا ہی لگتا ہے۔ لیکن شاعر نے اس کا حقیقی معنی مراد نہیں لیا ہے، بلکہ اس نے یہ شعر ان لوگوں کے لیے کہا ہے جو شعر و ادب کا عمدہ ذوق نہ ہونے کی وجہ سے ہر شعر پر عیب لگاتے ہیں، لہذا یہاں علاقہ مشابہت کا ہے اور قرینہ حالیہ ہے۔ اسی طرح یہ مثال:

عَادَ السَّيفُ إِلىٰ قِرَابِه وَحَلَّ اللَّيثُ مَنِيعَ غَابِه

(تلوار اپنی میان میں لوٹ آئی اور شیر اپنے محفوظ کچھار میں داخل ہو گیا)

اس مثال میں تلوار کے میان میں لوٹنے اور شیر کے کچھار میں داخل ہونے سے مراد مجاہد کا محاذ جنگ پر خطرات کا سامنا کرنے اور مشکلات سے دو چار ہونے کے بعد گھر لوٹنا ہے چنانچہ یہاں حقیقی معنی مراد نہ لے کر مجازی معنی مراد لیے گئے ہیں اور قرینہ حالیہ ہے کیونکہ حقیقت میں تلوار میان میں نہیں لوٹتی اور نہ ہی کوئی حقیقی شیر اپنے کچھار میں اترتا ہے اور علاقہ مشابہت کا ہے اور وہ ہے آدمی کا اپنے وطن کی سرخروئی کے لیے نکلنا پھر لمبی محنت ومشقت کے بعد واپس وطن لوٹنا اور جنگ کے بعد تلوار کا میان میں واپس لوٹنا یا شیر کا کچھار میں لوٹنا ہے۔ لہذا یہ استعارہ تمثیلیہ ہے۔

یاد رکھنے کے نکات:

- استعارہ مرشحہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کے مناسب کو ذکر کیا جائے۔
- استعارہ مجردہ وہ ہے جس کے ساتھ مشبہ کے مناسب کو ذکر کیا جائے۔
- استعارہ مطلقہ وہ استعارہ ہے جو مشبہ بہ اور مشبہ کے مناسبات سے خالی ہو۔
- استعارہ تمثیلیہ وہ ترکیب جو مشابہت کے علاقہ کی وجہ سے غیر موضوع لہ معنی میں مستعمل ہو اور ساتھ ہی وہ قرینہ بھی موجود ہو جو حقیقی معنی مراد لینے سے مانع ہو اس کو استعارہ تمثیلیہ کہتے ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- استعارہ مرشحہ کی تعریف کیجیے اور مثالوں سے واضح کیجیے۔

2- استعارہ مجردہ کی تعریف کیجیے اور مثالوں سے واضح کیجیے۔

3- استعارہ مطلقہ کی تعریف کیجیے اور مثالوں سے واضح کیجیے۔

4- استعارہ تمثیلیہ کی تعریف کیجیے اور مثالوں سے واضح کیجیے۔

5- استعارہ مرشحہ اور مطلقہ میں کیا فرق ہے؟

7.6 اکتسابی نتائج

استعارہ علم البیان کا ایک اہم اور دقیق حصہ ہے جس میں ایک چیز کو بعینہ دوسری چیز قرار دے دیا جائے اور اس دوسری چیز کے لوازمات کو پہلی چیز سے منسوب کر دیا جائے۔ لیکن کسی بھی لفظ کا مجازی معنی مراد لیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ لفظ کے اصلی اور مجازی معنی میں مشابہت کا علاقہ ہو اور کوئی ایک ایسا قرینہ (حالیہ یا لفظیہ) بھی موجود ہو جو اس لفظ کے حقیقی معنی مراد لینے سے مانع ہو۔ کبھی استعارہ میں مشبہ اور کبھی مشبہ بہ محذوف ہوتا ہے۔ اس وقت جملہ میں موجود کوئی ایسا قرینہ ہونا ضروری ہے جو محذوف کی طرف اشارہ کرے۔ استعارہ کی کئی اقسام ہیں جو اس طرح ہیں؛ تصریحیہ و مکنیہ، اصلیہ و تبعیہ، مرشحہ، مجردہ، مطلقہ اور تمثیلیہ۔ ہر قسم کی اپنی کچھ خاص صفات ہیں نیز طرفین تشبیہ کے حذف و ذکر کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں جب مشبہ بہ مذکور ہو تو تصریحیہ اور جب مشبہ بہ محذوف ہو تو استعارہ مکنیہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر استعارہ کا عمل اسم جامد میں ہوا ہو تو اصلیہ اور اسم مشتق یا فعل میں ہوا ہو تو تبعیہ کہلائے گا اور جب جملے میں استعارہ کے بعد مشبہ یا مشبہ بہ کے مناسبات کا ذکر ہو تو وہ مجردہ اور مرشحہ کہلائے گا اور جب کلام مناسبات کے ذکر سے خالی ہو تو وہ مطلقہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح کسی قرینہ کی بنا پر جب کسی غیر موضوع لہ لفظ کے ذریعے استعارہ کیا جائے تو وہ تمثیلیہ کہلاتا ہے۔

7.7 امتحانی سوالات کے نمونے

1- استعارہ کے معنی اور اس کے ارکان پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

2- اپنے جملوں میں استعارہ کا استعمال کرتے ہوئے اس کی دس مثالیں لکھیے۔

3- استعارہ کی کل کتنی اقسام ہیں؟

4- استعارہ اصلیہ اور تبعیہ کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کیجیے۔

5- استعارہ تصریحیہ اور مکنیہ سے آپ کیا سمجھے مثالوں کے ساتھ لکھیے۔

6- استعارہ اصلیہ و تبعیہ کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

7.8 فرہنگ

تظللني	مجھ پر سایہ کرتی ہے	أَنْزَلْنَاهُ	ہم نے اس کو اتارا

لِتُخْرِجَ	تاکہ آپ نکالیں	النَّاسَ	لوگوں کو
الظُّلُمَاتِ	اندھیرا	النُورِ	روشنی
بِإِذْنِ	اجازت سے	صِرَاطِ	راستہ
اَيَنعَثُ	پھلوں کا پک جانا	حان	وقت کا قریب آنا
قطاف	توڑنا	غضنا	ہمیں کاٹ دیا
الدهر	زمانہ	بنابه	اپنے نوکیلے دانت سے
سقى	سیراب کرنا	الحجى	عقل
السحائب	بادل	صافح	مصافحہ کیا
الأسماع	کان	تبسمت	مسکرائی
القلوب	دل	ورد	آیا
البحيرة	تالاب	أرق	زیادہ نرم
غازلت	قریب ہونا	الأزهار	پھول
مُراً	کڑوا	زُلالا	میٹھا پانی
عَادَ	وہ لوٹا	السَيْفُ	تلوار
قِرَابِه	تلوار کی میان	حَلَّ	اتر گیا، داخل ہو گیا
اللَّيْث	شیر	عجب	تعجب

7.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1- البلاغة الواضحة — علي الجارم ومصطفى أمين.
2- الإيضاح في علوم البلاغة — الخطيب القزويني
3- علم البيان — عبد العزيز عتيق
4- دروس البلاغة — حفني ناصيف وزملائه

اکائی 8 علم المعانی

اکائی کے اجزا

8.1 تمہید
8.2 مقصد
8.3 علم المعانی کی تعریف اور غرض وغایت
8.3.1 علم المعانی کی تعریف
8.3.2 تعریف کی تشریح
8.3.3 علم المعانی کی غرض وغایت
8.4 بلاغت کی اقسام اور علم المعانی کے مباحث
8.4.1 بلاغت کی اقسام
8.4.2 علم المعانی کے مباحث
8.5 علم المعانی کا موضوع ،فوائد اور بلاغت پر اس کے اثرات
8.5.1 علم المعانی کا موضوع
8.5.2 علم المعانی کے فوائد
8.5.3 بلاغت پر علم المعانی کے اثرات
8.6 علم المعانی کی اساس، ابتدا اور نشوونما
8.6.1 علم المعانی کی اساس
8.6.2 علم المعانی کی ابتدا
8.6.3 علم المعانی کی نشوونما اور ابتدائی کتابیں
8.6.4 ”مفتاح العلوم“ کی شروحات وتلخیصات
8.6.5 جدید کتابیں
8.7 علم المعانی کے اہم مؤلفین

8.7.1 **الجرجاني**

8.7.2 **السكّاكي**

8.7.3 **التفتازاني**

8.7.4 دیگر مؤلفین

8.8 اکتسابی نتائج

8.9 امتحانی سوالات کے نمونے

8.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

8.1 تمہید

عزیز طلبہ ! آپ اس اکائی کی ابتدا میں ایک بار پھر یہ ذہن نشیں کرلیں کہ علم بلاغت کی تین شاخیں ہیں: علم بیان، علم بدیع اور علم معانی، علم المعانی علم بلاغت کی اہم شاخ ہے، اس اکائی میں بلاغت کی اسی شاخ پر گفتگو کی جائے گی اور یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ علم المعانی کا عربی زبان کے صحیح استعمال میں کیا مقام ہے، اس کو جاننے کی کتنی ضرورت ہے اور عربی زبان کے ماہرین نے قرآن وحدیث اور عربی شعرونثر کی روشنی میں اس علم کی تفہیم کس طرح کی ہے، اس علم کو حاصل کرنے کے بعد عربی زبان کی چاشنی کیسی دوچند ہوجاتی ہے اور اس کو نہ جاننے کی وجہ سے ذوق سے محرومی کے ساتھ ساتھ مختلف مواقع پر کیسی غلطیوں کا امکان ہے، ہم اس کا مطالعہ اس مقصد سے کریں کہ ہم بھی فصیح عربی کو سمجھنے، اس میں بات کرنے اور لکھنے کی لیاقت پیدا کرسکیں۔

8.2 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ یہ جان سکیں گے کہ علم المعانی کی لغوی واصطلاحی تعریف کیا ہے؟ صحیح عربی زبان کو سمجھنے، بولنے اور لکھنے کے لیے علم المعانی کو جاننے کی کیوں ضرورت ہے؟ اس کی اہمیت اور معنویت کیا ہے؟ علم المعانی کا فن بلاغت سے کیا رشتہ ہے اور اس رشتہ کی نوعیت کیا ہے؟ کون کون سے مباحث علم المعانی کے ذیل میں آتے ہیں؟ علم المعانی کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس علم کے نمایاں اہل قلم کون ہیں؟ اس موضوع پر اہم کتابیں کونسی ہیں؟ اس علم میں تصنیف کے مراحل کیا رہے ہیں؟

8.3 علم المعانی کی تعریف اور غرض وغایت

8.3.1 علم المعانی کی تعریف

فن بلاغت کے مشہور عالم سکّاکی (وفات:626ھ) نے علم المعانی کی تعریف اس طرح کی ہے:

"إنّه تَتَبُّعُ خواصّ تركيبِ الكلامِ في الإفادةِ، ومَا يَتَّصِلُ بِهَا مِنَ الاستِحسَانِ وغيرہ، ليحترزَ بالوقوفِ عليهَا عنِ الخطأ في تطبيقِ الكلامِ على مايقتضي الحال ذكرہ"۔

اس تعریف کو آپ اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ علم المعانی وہ علم ہے جس میں کلام کی ہیئت ترکیبی کی خصوصیات کو تلاش کرکے انہیں اجاگر کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کیا فائدہ دے رہے ہیں اور ان سے کلام میں کیا حسن پیدا ہوا ہے اور کن بنیادوں پر اس کی تحسین کی جاسکتی ہے اور اس قسم کی اور چیزیں ہیں اور یہ اس مقصد سے کہ موقع ومحل کی رعایت کرتے ہوئے گفتگو کرنے کے سلسلہ میں جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اس علم سے واقفیت کے بعد ان سے بچنا ممکن ہو۔

گویا علم المعانی وہ علم ہے جس میں متکلم کو مخاطب کی ذہنی صلاحیت اور مقتضائے حال کے مطابق کلام (گفتگو) کرنے کے قواعد سکھائے جاتے ہیں، نیز کسی عبارت سے حقیقی معنی کے علاوہ قرائن اور سیاق وسباق سے جو مزید معانی سمجھ میں آتے ہیں اور دریافت ہوتے ہیں، ان کی تشریح کی جاتی ہے، اسی لیے عام طور سے بلاغت کے ماہرین نے اس کی اس طرح تعریف کی ہے اور یہ تعریف سکاکی کی تعریف سے زیادہ واضح اور اپنے مقصد کے لیے زیادہ موزوں ہے: جیسا کہ سعدالدین تفتازانی نے مختصر المعانی میں اس کی تعریف کی ہے۔

"هُوَ عِلمٌ يُعرف به أحوالُ اللفظِ العربي التي بها يُطابِقُ اللفظُ مقتضى الحال"۔

(یہ ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ ایک عربی لفظ کے ان احوال کو پہچانا جاتا ہے جن کے ذریعہ لفظ مقتضائے حال کے مطابق ہو جاتا ہے)۔

8.3.2 تعریف کی تشریح

تعریف میں استعمال ہونے والے لفظ "اللفظ" میں مفرد و مرکب دونوں شامل ہیں، لفظ کے احوال سے جملہ کے احوال اور اس کے مختلف اجزا کے احوال مراد ہوتے ہیں، جملہ کے احوال درج ذیل ہیں:

1- وصل 2- فصل 3- قصر 4- ایجاز 5- اطناب 6- مساوات

اجزائے جملہ کے احوال درج ذیل ہیں:

1- مسندالیہ کے احوال 2- مسند کے احوال 3- متعلقات فعل کے احوال

تعریف میں "الحال" کا بھی لفظ استعمال ہوا ہے، حال کو "المقام" بھی کہتے ہیں، اس سے مراد وہ چیز ہے جو متکلم کو اپنے کلام میں منفرد خصوصیت پیدا کرنے پر مجبور کرے، یعنی متکلم خاص پس منظر اور مخاطب کی ذہنی کیفیت وغیرہ کو ذہن میں رکھ کر گفتگو کرے، مثلا ایک شخص کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کے سامنے اپنی بات تاکید در تاکید کے ذریعہ رکھے تاکہ اس کا انکار ختم ہو سکے اور وہ اس کی بات کا قائل ہو جائے۔

تعریف میں ایک تعبیر "مقتضى الحال" کی استعمال ہوئی ہے، مقتضائے حال کو "الاعتبار المناسب" بھی کہتے ہیں، یعنی حال اور مقام کا تقاضہ کیا ہے؟ یہی مقتضی ہے اور اس کی رعایت کرنا مطابقتِ مقتضائے حال کہلاتا ہے۔ مثلاً وعظ و تقریر ایک حال ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ شرح و بسط اور تفصیل سے گفتگو کی جائے، تو یہ تفصیل سے گفتگو کرنا مقتضی ہے اور کلام کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنا مقتضائے حال کی مطابقت ہے، اسی کو ایک مثال سے سمجھیے کہ آپ کا مخاطب علم کی اہمیت کا قائل نہیں، یہ ایک حال ہے جو تاکید چاہتا ہے، چنانچہ تاکید مقتضی ہے اور آپ کا اس طرح علم کی اہمیت کو بیان کرنا کہ "لا شَکَّ أنَّ الإنسَانَ بغير علمٍ کشجر بلا ظل ولا ثمر" (بے شک علم کے بغیر انسان اس درخت کی طرح ہے جس کا نہ سایہ ہو نہ اس میں پھل ہو) مقتضائے حال کے مطابق کلام کرنا ہے۔

اس طرح آپ یہ اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے کہ یہ وہ علم ہے جس میں متکلم کو مخاطب کی ذہنی صلاحیت اور مقتضائے حال کے مطابق کلام کرنے کے قواعد سکھائے جاتے ہیں، نیز کسی عبارت سے حقیقی معنی کے علاوہ قرائن اور سیاق وسباق سے جو اور معانی سامنے آتے ہیں یا اور مفہوم مستنبط ہوتے ہیں ان کی تشریح کی جاتی ہے۔

اسی طرح آپ نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ اس علم کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس وقت کیا بات کرنی ہے اور کس طرح کرنی ہے، کہاں معرفہ لانا ہے کہاں نکرہ، کہاں کسی لفظ کو ذکر کرنا ہے کہاں حذف کرنا ہے، کہاں لفظ کو ظاہر کرنا ہے، کہاں اس کو ضمیر کی شکل میں ذکر کرنا ہے، کہاں مختصر گفتگو کرنی ہے اور کہاں مفصل۔

سکّاکی نے اپنی جامع عبارت میں ان سب کو جمع کر دیا ہے جس سے اس کی مزید تشریح ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"لا يَخفى عليک أنَّ مَقَامَاتِ الكلامِ مُتَفَاوتةٌ فالشكرُ يُبَايِنُ مَقَامَ الشِّكايةِ، ومقامُ التهنئةِ يُبَايِنُ مَقَامَ التَّعْزِيَةِ، وَمَقَامُ الْمدحِ يُبَايِنُ مقامَ الذَّمِّ، ومقامُ الترغيبِ يُبَايِنُ مقامَ الترهيبِ، ومقامُ الجِدِّ في جميعِ ذلک يُبَايِنُ مَقَامَ الْهَزْلِ، وكذا مقامُ الكلامِ

ابتداءً يُغايِرُ مقامُ الكلامِ بناءً عَلَى الاستخبارِ أو الإنكَارِ، ومَقَامُ البِنَاءِ عَلَى السُّؤَالِ يُغَايِرُ مَقَامَ البِنَاءِ عَلَى الإِنْكَارِ، جَمِيعُ ذلك معلومٌ لكلِّ لَبِيبٍ، وَكَذَا مَقَامُ الْكَلامِ مَعَ الذكيِّ يُغَايِرُ مَقَامَ الكلامِ مَعَ الغبيِّ، وَلِكُلٍّ مِنْ ذَلِكَ مُقْتَضَى غَيْرُ مُقْتَضَى الآخرِ، ثُمَّ إِذَا شرعتَ فِي الكَلامِ فَلِكُلِّ كلمةٍ مع صاحبتِها مقامٌ، ولكل حدٍّ ينتهي إليه الْكَلامُ مقامٌ، وارْتِفَاعُ شأنِ الْكَلامِ فِي بابِ الْحُسْنِ وَالْقَبُوْلِ وانْحِطَاطِه فِي ذَلِكَ بِحَسْبِ مُصَادَفَةِ الْكَلامِ لِمَا يَلِيْقُ به، وهُوَ الَّذِي نُسَمِّيْه مُقْتَضَى الْحَالِ"۔

(آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی کہ کلام کے مقامات یکساں نہیں بلکہ جدا جدا ہوتے ہیں، شکریہ کا انداز شکایت سے مختلف ہوتا ہے، مبارکباد دینے کا طریقہ تعزیت کے طریقہ سے جدا ہوتا ہے، مدح کی بات مذمت سے الگ ہوتی ہے، ترغیب یعنی شوق دلانے کا موقع ترہیب یعنی خوف دلانے سے بالکل علیحدہ ہوتا ہے، پھر ان تمام مواقع پر اگر سنجیدگی سے بات کرنی ہو تو انداز الگ ہوگا اور اگر یہی باتیں مزاح میں کہی جائیں گی تو ان کا انداز بالکل جدا ہوگا، اسی طرح ایک بات آپ اپنے طور پر کہہ رہے ہیں تو اس کا طرز الگ ہوگا اور اگر کسی کے استفسار کے جواب کے طور پر کہہ رہے ہیں تو لہجہ بدل جائے گا، کسی کے انکار کے بعد اس کو قائل کرنے کے لیے وہی بات کہیں گے تو اس کا آہنگ بدل جائے گا، (ان دونوں حالتوں میں بھی فرق ہوگا کہ سوال ایک ناواقف کا ہے اور وہ سمجھنا چاہتا ہے یا معترض کا ہے اور وہ امتحان میں ڈالنا چاہتا ہے، تو اسی اعتبار سے اس کے جواب میں ان باتوں کی رعایت کرنی ہوگی جن سے کلام کا مقصد پورا ہو سکے)، اہل عقل ودانش یہ باتیں اچھی طرح سمجھتے ہیں، پھر اسی طرح اگر آپ ایک ذہین آدمی سے گفتگو کر رہے ہیں تو انداز الگ ہوگا اور اگر ایک کند ذہن سے مخاطب ہیں تو الگ، دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، پھر جب آپ نے گفتگو شروع کر دی تو ہر لفظ کا دوسرے لفظ کے ساتھ کیا ربط ہے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے، پھر گفتگو میں توقف اور وقف کے کیا مقامات ہیں ان کی بھی رعایت کرنی ہوتی ہے، کلام کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جب اس کے حسب حال ہونے کا خیال رکھا جاتا ہے اور اگر یہ خیال نہیں رکھا جاتا تو اس کا مرتبہ گھٹ جاتا ہے اور اسی کو ہم مقتضائے حال کہتے ہیں)۔

جب آپ عربوں کی شعری ونثری تخلیقات کا مطالعہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ وہ شکریہ، معذرت اور تعزیت کے مواقع پر اختصار سے کام لیتے ہیں اور کسی کی تعریف وتوصیف کے موقع پر یا مرثیہ میں یا تہنیتی کلمات میں اور تقریر و بیان کرتے ہوئے اطناب اور تفصیل سے کام لیتے ہیں، کسی کی مذمت میں سخت الفاظ کے ساتھ تاکید کا استعمال زیادہ کرتے ہیں، اس کے علاوہ اور بھی خصوصیات ہیں۔

اس تفصیل سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ علم معانی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہم اپنے جملوں کو کس طرح مرتب کریں اور مقتضائے حال کے مطابق کیسے کلام کریں، کہاں جملوں کو مقدم کریں کہاں مؤخر، کہاں پورا جملہ ذکر کریں کہاں حذف سے کام لیں، کہاں معرفہ کا استعمال ہو اور کہاں نکرہ کا، کہاں ایجاز واختصار سے کام لیں اور کہاں تفصیل سے گفتگو کریں اور اس کی جتنی بھی مختلف تعبیرات میں اس کی تعریف کریں ان کا مفہوم یہی ہوگا کہ ہر مقام کے مطابق ایک الگ گفتگو ہوتی ہے، اہل بلاغت کا مشہور جملہ اسی معنی کو بیان کرتا ہے: "لکل مقام مقال"۔

جب ہم ان قواعد وضوابط کو ذہن میں رکھتے ہیں تو ہم ماحول کے تقاضے کے مطابق گفتگو کر پاتے ہیں اور عربوں کے عام اسلوب اور طرز واداسے دور نہیں جاتے اور اس طرح ہمارے کلام میں بلاغت کی جھلک پیدا ہو سکتی ہے۔

8.3.3 علم المعانی کی غرض وغایت

ابھی آپ نے پڑھا کہ گفتگو کے مختلف علیحدہ علیحدہ مقامات ہوتے ہیں، خوشی، غم، شکر، شکایت، مبارکباد، تعزیت، سنجیدگی، مزاح

وغیرہ، متکلم کے لیے ان کی رعایت کرتے ہوئے اپنے کلام کو پیش کرنا علم معانی کا اہم مقصد ہے، اگر اس عتبار سے گفتگو کے انداز میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو تو علم المعانی کے تقاضہ کے خلاف ہے۔

دوسری بات جس سے علم معانی میں بحث ہوتی ہے اور وہ اس کے اہم مقاصد میں سے ہے کہ مزید کلام سے ضمناً کیا فائدے حاصل ہو رہے ہیں، یہ دیکھا جائے اور اس کے قرائن کا مطالعہ کر کے ان تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، اس لیے کہ ایک تو کلام کے حقیقی معنی ہوتے ہیں جس کے لیے اسے تخلیق کیا جاتا ہے یا وضع کیا جاتا ہے، لیکن کبھی ساتھ ہی اس کے دوسرے معنی بھی ہوتے ہیں جو سیاق وسباق سے معلوم ہوتے ہیں اور موقع ومحل یا شان ورود کی واقفیت سے وہ معنی کھلتے ہیں۔

علم معانی کا ایک مقصد یہ ہے کہ انسان درخواست اور گذارش کی جگہ حکم کا انداز یا عاجزی اور تواضع کی جگہ فخر یہ انداز اختیار نہ کرے، تعزیت کے موقع پر ہنسنے ہنسانے کا انداز یا مبارکبادی کے موقع پر منھ بسورنے اور غم انگیز ماحول پیدا کرنے کا طریقہ اختیار نہ کرے، شکریہ، شکایت، مبارکبادی، تعزیت، سنجیدگی اور مذاق اور ان کے علاوہ مختلف حالات میں ان کے مطابق کلام کی مناسب شکل اختیار کی جائے، کبھی عقل وقلب دونوں کے تقاضوں کی رعایت کی جاتی ہے، عقل کو مطمئن کرنے والا منطقی انداز بھی ہوتا ہے اور دل کو مطمئن کرنے والا جذباتی اسلوب بھی اور کبھی موضوع کے لحاظ سے ان میں سے صرف ایک پر ہی اکتفا کرنا ہوتا ہے، یہی علم المعانی کی غرض وغایت ہے۔

8.4 بلاغت کی اقسام اور علم المعانی کے مباحث

8.4.1 بلاغت کی اقسام

اپنے ذہنوں میں تازہ کرلیں کہ بلاغت کے تین مشہور علوم ہیں: معانی، بیان اور بدیع۔

علم بیان: بیان کا لفظی مطلب ہے کہ کھول کر بات کرنا یا ظاہر کرنا۔ ادب کی اصطلاح میں علم بیان ایسے قاعدوں اور ضابطوں کے مجموعہ کا نام ہے جس کو جان لینے کے بعد ہم ایک ہی بات یا مضمون کو مختلف طریقوں سے ادا کر سکیں اور ان میں سے ہر طریقہ دوسرے سے زیادہ واضح اور مؤثر ہو، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کلام کے سمجھنے میں غلطی کا امکان کم ہو اور معانی میں خوب صورتی پیدا ہو، یہ علم بلاغت کی ایک شاخ ہے، کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور مجازی معنوں میں بھی، اس علم کے ذریعے سے تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز مرسل وغیرہ کی مدد سے ایک معنی کو کئی انداز سے بیان کیا جاتا ہے، جن کے لیے لغت سے استناد نہیں کیا جا سکتا، یعنی ان کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے لغت سے مدد نہیں مل سکتی بلکہ اس کے لیے علم بیان کو سمجھنا ضروری ہے۔

علم بدیع: فصیح وبلیغ کلام کو مختلف لفظی یا معنوی خوبیوں سے آراستہ کرنے کو علم بدیع یا بدائع اور صنائع کہتے ہیں، اس علم سے کلام کو مزین کرنے اور خوش نما بنانے کا سلیقہ آتا ہے، یعنی اس علم کی بدولت سجع، تجنیس، ترصیع، توریہ اور اسی قبیل کے دوسرے محاسنِ کلام کے ذریعے سے انسان اپنے کلام کو آراستہ کرتا ہے، یہ وہ علم ہے جس کی بدولت یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام، گفتگو یا تحریر میں خوب صورتی کیسے پیدا کی جا سکتی ہے، کلام کی آرائش وزیبائش کن طریقوں سے ہوتی ہے اور اس میں شستگی اور شگفتگی کس طرح پیدا ہوتی ہے، اس مقصد کے لیے اپنائے گئے تمام طریقوں کو صنائع یا محسنات کہا جاتا ہے اور یہ طریقے صرف حسن کلام کے لیے اپنائے جاتے ہیں یعنی ان کے استعمال نہ کرنے سے کلام کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا

لیکن اگر انہیں استعمال کیا جائے تو کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

علم معانی: یہ بھی علم بلاغت کی اہم شاخ ہے اور اس کا تعلق الفاظ کے ان استعمالات سے ہے جن کے لیے وہ بنیادی طور پر تخلیق کیے گئے ہوں، اس علم کی مدد سے گویا الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، گو کہ موقع محل کے اعتبار سے ان کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔

بلاغت کے ماہرین اس فرق کو اس طرح سمجھاتے ہیں:

اگر ایک ہی معنی کو مختلف تعبیرات کی شکل میں پیش کرنے کی بحث ہو تو یہ علم بیان ہے جس میں تشبیہ، استعارہ، مجاز اور کنایہ وغیرہ کی بحثیں آتی ہیں اور اگر لغوی ترکیب اور اس کو شستہ وشگفتہ اور مسجع ومرصع بنانے کی بحث ہو تو اسے علم بدیع کہتے ہیں اور اگر ایک ہی لفظ اور ایک ہی لغوی ترکیب کے اندر متعدد معانی کا احتمال ہو (قرینہ کے اعتبار سے اس کے معنی بدلتے ہوں، یا الگ انداز سے بات کہنے کی ضرورت ہوتی ہو) تو علم معانی ہے۔ (جس میں خبر، انشاء اور اس کی اقسام سے بحث ہوتی ہے)۔

8.4.2 علم المعانی کے مباحث

علم المعانی میں آٹھ ابواب سے بحث ہوتی ہے:

(1) احوالِ اسنادِ خبری (2) احوالِ مسند الیہ (3) احوالِ مسند (4) احوالِ متعلقاتِ فعل

(5) انشاء (6) قصر (7) فصل ووصل (8) ایجاز، اطناب اور مساوات

8.5 علم المعانی کا موضوع، فوائد اور بلاغت پر اس کے اثرات

8.5.1 علم المعانی کا موضوع

علم المعانی کا موضوع لفظ عربی ہے اس حیثیت سے کہ وہ اپنے اندر کیا معنی رکھتا ہے اور معنی سے مراد دونوں معنی ہیں، ایک تو وہ معنی جس کو نحو میں اصلِ معنی کہتے ہیں یعنی جو الفاظ سے ظاہر ہے، دوسرا وہ معنی جو کلام کا مقصود ہے، مثلاً: "إن زيدًا لقائم" اس جملہ کا ایک معنی تو یہ ہے کہ زید یقینا کھڑا ہے؛ لیکن دوسرا معنی یا مقصد اس جملہ کو اس تاکیدی انداز میں کہنے کا یہ ہے کہ مخاطب کو باور کرا دیا جائے کہ زید کھڑا ہوا ہے، اس میں ذرہ برابر بھی شک کی گنجائش نہیں ورنہ "زید قائم" (زید کھڑا ہے) کہنا بھی کافی تھا۔

8.5.2 علم المعانی کے فوائد

1۔ سب سے پہلا اور عظیم فائدہ تو قرآن کریم کے اعجاز معانی کو جاننا ہے کہ کس طرح قرآن مجید ادب وبلاغت کا شاہکار ہے اور عام انسانی کلام سے ممتاز ہے اور اسی مقصد سے اس علم کا آغاز ہوا، عربوں کو چونکہ فصاحت وبلاغت کا دعوی تھا اور یہ ان کا امتیاز تھا، وہ دوسری قوموں کو عجمی سمجھتے تھے اور وہ قرآن کریم کے مخاطب اول تھے، اس لیے قرآن کریم نے ان کو اس بنیاد پر چیلنج کیا کہ وہ اس سے بہتر نمونہ لا کر دکھائیں، وہ اس میں ناکام رہے، بلکہ ان کے اہل علم اور اہل ذوق نے اس کے معجزہ ہونے کا اقرار کیا کہ اس جیسا کلام پیش کرنا انسان کے بس میں نہیں۔

ولید بن مغیرہ نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے، آپ کو قرآن کریم کی بعض آیتیں تلاوت کرتے ہوئے سنیں تو اتنا متأثر ہوئے کہ وہ بھاگے ہوئے قریش کے بعض سرداروں کے پاس آئے اور کہا کہ: "واللہ لقد سمعتُ مِنْ محمدٍ کلاماً مَا هُوَ مِنْ كلامِ الإنسِ، ولا مِنْ كلامِ

الجنِ، وإنَ لهٗ لَحلَاوۃٌ، وإنَ علیه لَطلاوۃٌ، وإنَ أعلاہ لَمُثْمِرٌ، وإنَ أسفَلَه لَمُغْدِقٌ" (خدا کی قسم میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کلام پڑھتے سنا ہے کہ جو نہ تو انسانوں کا کلام ہو سکتا ہے اور نہ جنات کا، اس میں تو بڑی مٹھاس اور بڑا بانک پن اور دل کشی ہے، اس کا اوپری حصہ (ظاہری الفاظ) بڑا پھل دار اور اس کا نچلا حصہ بہت زیادہ پانی والا ہے (معانی اور مطالب کے لحاظ سے بہت دقیق اور گہرا ہے)، اس اعتبار سے قرآن کریم کا بنیادی اعجاز اعجازِ بیانی اور اعجازِ معانی قرار پایا۔

قرآن کے اس اعجاز کو چار خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1۔ مفردات کا اعجاز 2۔ جملوں اور ترکیبوں کا اعجاز 3۔ اسلوب کا اعجاز 4۔ نظم قرآن یعنی آیات کے درمیان ربط کا اعجاز

ہم مختصر طور پر یہاں صرف چند ترکیبوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مختلف ترکیبیں قرآن نے ایسی استعمال کی ہیں کہ جن سے بہت سی گتھیاں سلجھ گئیں، مثلاً قاتل سے انتقام لینا ایک کمال سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ترغیب کے لیے مختلف جملے زبان زد تھے، مثلاً "القتل أنفی للقتل" (قتل سے قتل کی روک تھام ہوتی ہے)، یا "کثروا القتل لیقل القتل" (قتل زیادہ کرو، تاکہ قتل کی وارداتیں کم ہو جائیں گی)، لیکن قرآن نے اس کے لیے استعمال کیا: { ولکم في القصاصِ حیوۃ}(البقرۃ:179) (اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے)، یہ ترکیب مختصر سی ہے لیکن معانی میں وسعت ہے اور انداز بھی مثبت ہے۔

کسی چیز کی وسعت کو بیان کرنے کے لیے مختلف جملے تھے، لیکن ساری وسعتوں کی ایک انتہا تھی، قرآن نے جہنم کی وسعت کو بیان کرتے ہوئے کہا: {یوم نقول لجھنم ھل امتلئت وتقول ھل من مزید}(ق:30) (جس روز ہم جہنم سے پوچھیں گے: کیا تو سیر ہو گئی تو وہ پکار اٹھے گی کیا کچھ اور ہے) اس وسعت کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔

قرآن ہر مضمون کو بلیغ و فصیح اسلوب میں بیان کرتا ہے خواہ وہ ترغیب و ترہیب ہو، یا رزم و بزم، جنت و جہنم کا بیان ہو یا پھر دنیا کی مذمت کا ذکر، انبیا و صالحین کے کردار کا تذکرہ ہو یا پھر سرکش اور باغی افراد کی عبرت آموز داستان، ہر ایک کو اسی مضمون کے مناسب جوش و خروش اور شوکت وصولت والے الفاظ و انداز میں بیان کرتا ہے جو اس خاص موقع کا تقاضہ ہو، پھر مخاطب بھی ہر قسم کے ہیں، اعلی درجے کے ماہرین بھی اور متوسط طبقہ کے فصیح و بلیغ بھی، نیز عام لوگ بھی، قرآن کریم باوجودیکہ بلاغت کی تمام اقسام پر مشتمل ہے، لیکن اس کے ہر طرح کے مخاطب بیک وقت متاثر ہوتے ہیں اور ہر کوئی سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ قرآن کا اصل خطاب اسی سے ہے۔

2۔ اس کا دوسرا فائدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی بلاغت کو سمجھنا ہے۔ چونکہ آپ ﷺ کے کلام کے انداز اور مخاطب کے لحاظ سے اس میں تنوع ہے اور فصاحت و بلاغت کے نمونے بھی موجود ہیں۔ آپ ﷺ أفصح العرب (عربوں میں سب سے زیادہ فصیح) ہیں اور آپ ﷺ نے خود اس کی وضاحت بھی فرمائی ہے، حضرت عائشہ نے آپ ﷺ کے بارے میں فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ یوں گفتگو نہیں فرماتے تھے جس طرح تم لوگ باتیں کرتے چلے جاتے ہو، بلکہ وہ ایسے انداز میں کلام کرتے تھے جو واضح اور صاف ہوتا جسے آپ ﷺ کے پاس بیٹھنے والا یاد کر لیتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی زبان فصیح تھی اور کلام بلیغ تھا، الفاظ پر رونق، عبارت دلنشیں ہوتی تھی، اس میں تکلف نہ تھا، آپ ﷺ کو "جوامع الکلم" عطا ہوئے مختصر الفاظ میں بہت سی ضروری باتیں سمیٹ لیتے تھے، عربوں کے مختلف لہجوں کا آپ ﷺ کو علم عطا ہوا تھا، آپ ﷺ ہر

قبیلہ سے اس کی زبان میں بات چیت کرتے، چنانچہ قریش، انصار، اہل حجاز اور اہل نجد کے ساتھ گفتگو میں جو انداز بیان اختیار کرتے وہ اس اسلوب کلام سے مختلف ہوتا تھا جو آپ ﷺ قحطانی عربوں کے ساتھ بات چیت کے دوران اختیار کرتے تھے۔

3- تیسرا فائدہ عام عربی شعر ونثر کے بیش قیمت ذخیرے کی بلاغت کے اسرار ورموز سے واقفیت حاصل کرنا ہے تا کہ قیمتی اور بے قیمت کلام میں فرق معلوم ہو سکے۔

4- علم معانی سے کلام کی ترکیبی خصوصیت بھی معلوم کی جاسکتی ہے اور ایک ہی مقصد کے لیے دو مختلف اسلوب میں کیوں گفتگو کی جاتی ہے؟ اس کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ یہ بھی معلوم ہوتا ہے، یہ بات فطری ذوق سے بھی پیدا ہوتی ہے اور کسی حد تک سیکھ کر بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

5- علم معانی سے واقفیت کے نتیجہ میں ہم برمحل گفتگو کرنے کے عادی بنتے ہیں اور زیادہ مؤثر ہو پاتے ہیں، چونکہ مختلف لوگوں کے بولنے کے انداز پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بعض لوگوں کی گفتگو شگفتہ اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ جلد ذہن نشیں بھی ہو جاتی ہیں اور ان کا مطلب جلد سمجھ میں آجاتا ہے، وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو اپنی بات بیان کرنے کا صحیح طریقہ آتا ہے، بعض لوگوں کو وقت اور موقع ومحل کی رعایت کرتے ہوئے بات کہنی نہیں آتی اور وہ برمحل الفاظ استعمال نہیں کر پاتے، اس لیے ان کی بات واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتی۔

8.5.3 بلاغت پر علم المعانی کے اثرات

اس عنوان کے تحت ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ بلاغت پر معانی کے کیا اثرات پڑتے ہیں؟ جیسا کہ آپ نے پڑھا کہ اس موضوع پر لکھنے والے ماہرین کے سامنے دو مقاصد تھے، پہلا مقصد خاص تھا اور دوسرا عام، خاص مقصد قرآن کریم کے اعجاز اور حدیث رسول ﷺ کی بلاغت کو نمایاں کرنا تھا، اسی لیے اعجاز قرآن پر جو ابتدائی کتابیں لکھی گئیں ان میں قرآن کریم کے اعجاز اور اس کے اسرار ورموز کو کھولنے کی کوشش کی گئی، عبد القاہر جرجانی نے اس موضوع کو زیادہ نمایاں کیا، یہ خالص دینی مقصد تھا۔

دوسرا مقصد عام تھا، جو خالص دینی نہیں تھا؛ بلکہ اس کا مقصد قرآن وحدیث کے علاوہ کلام عرب کی بلاغت وفصاحت سے بحث کرنا تھا، اس میں نثر وشعر دونوں شامل ہیں، اس لیے جس شخص کو بلاغت کے مسائل کا علم نہ ہو وہ بلیغ اور غیر بلیغ، یا بلیغ اور زیادہ بلیغ کے درمیان فرق نہیں کر سکتا، ہلال عسکری (وفات: 395ھ) کے مطابق جو شخص عمدہ اور ردی کلام، موزوں اور ناموزوں لفظ، نادر (قیمتی) اور بارد (پھیکے) شعر کے درمیان فرق نہیں کر سکتا، اس کا جہل اور نقص ظاہر ہو جاتا ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ دیکھیں کہ کسی جملہ کو بلیغ بنانے میں معانی اپنا کیا کردار ادا کرتا ہے؟ علم معانی دو طرح سے اپنی تاثیر دکھاتا ہے، ایک تو یہ علم یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ کوئی بھی بات سامعین اور قارئین کے معیار کے مطابق کی جائے اور ان حالات کی بھی رعایت کی جائے جن میں یہ بات کہی جارہی ہے، دوسرے یہ کہ جو بات بھی کی جائے قرائن کی روشنی میں اس بات کی تہہ میں اور مزید کیا باتیں چھپی ہوئی ہیں ان کو جاننے کی کوشش کی جائے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم معانی کے مباحث کا کام یہ واضح کرنا ہے کہ کلام میں سامعین وقارئین اور موقع محل کی رعایت ضروری ہے اور کلام بلیغ نہیں کہا جاسکتا جب تک اس میں یہ دونوں باتیں نہ پائی جائیں، بات کس کے لیے کہی یا لکھی جارہی ہے اور کہاں کہی یا لکھی جارہی ہے۔ آپ کا مخاطب جس سے آپ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں اس کی تین حالتوں میں سے کوئی ایک حالت ہوسکتی ہے:

1 - یا تو وہ خالی الذہن ہے، اس کو بغیر کسی تاکید کے صرف بات بتا دینا کافی ہے۔

2 - دوسری حالت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ اس کو جو بات کہنے جا رہے ہیں اس کا ادھورا علم ہے اور اسے اس سلسلہ میں کوئی شک بھی ہے، تو اس کے لیے بلاغت یہ ہے کہ تاکید کے ساتھ اس سے بات کہی جائے اور اس کے شک کو دور کر کے اس میں یقین پیدا کیا جائے۔

3 - تیسری حالت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اس بات سے واقف ہے؛ لیکن اس کا منکر ہے، اس کا قائل نہیں، تو اس کو قائل کرنے کے لیے تاکید در تاکید کی ضرورت ہوگی، یہ علم المعانی کا ایک حسن ہے۔

اس کا دوسرا حسن یہ ہے کہ ہر انسان سے اس کی فہم اور زبان وادب میں اس کے معیار کے مطابق بات کی جائے، ایک عامی شخص سے اس زبان میں بات نہ کی جائے جس زبان میں ایک ادیب سے بات کی جاتی ہے، اسی طرح اس کے برعکس، جہاں بات ایجاز اور اختصار کے ساتھ کہنی ہو وہاں اس طرح کہی جائے اور جہاں تفصیل اور اطناب کا موقع ہے وہاں اس سے فائدہ اٹھایا جائے، ایک ذہین آدمی سے کوئی بات کہنی ہو تو اس کے لیے اشارہ بھی کافی ہے اور اگر کسی کند ذہن یا مغرور سے کوئی بات کہنی ہے تو تفصیل سے سمجھا کر کہنی چاہیے، تب اسے بلاغت کے زمرہ میں شامل کیا جائے گا، جعفر بن یحیی (وفات: 187ھ) سے ان کا یہ قول منقول ہے: ''جہاں مختصر بات کہنے کا موقع ہو وہاں زیادہ بولنا جہالت ہے اور جہاں تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہو وہاں کنایہ میں بات کہنا کوتاہی ہے''۔

معانی کا تعلق فکر اور معنی دونوں سے ہے، اس علم سے جہاں ہم یہ سیکھتے ہیں کہ موقع ومحل کی رعایت کرتے ہوئے ہمیں کون سی تعبیر استعمال کرنی ہے، اسی طرح یہ علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جو خیال ہمارے ذہن میں ہے اسے مناسب لفظ کا پیکر کس طرح دینا ہے، یا جملہ میں جو سابقہ لاحقہ ہے اس میں کتنی واقعیت ہے اور تقاضے کی رعایت ہے۔

اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے جو ایک بدو کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب اس نے ایک قاری کو پڑھتے ہوئے سنا:

{والسارقُ والسارقةُ فاقْطَعُوا أيديَهما جزاءً بما كسبا نكالاً من الله} (المائدة: 38)

(اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، ان کے کیے کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا کے طور پر)

پھر اس نے پڑھا: ''والله غفور رحيم'' (اور اللہ مغفرت کرنے والا اور رحیم ہے)۔ تو اعرابی کو تعجب ہوا کہ سزا کے بعد مغفرت اور رحمت جیسی صفات کیسے ذکر ہوں گی؟ تو اس نے سوال کیا تو قاری کو تنبہ ہوا اور اس نے دوبارہ صحیح قراءت کرتے ہوئے پڑھا: {والله عزيز حكيم} (اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔) اس وقت اس اعرابی نے کہا: ''الآن استقام المعنى'' (کہ اب معنی صحیح ہوگئے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ عربوں کو فطرۃً یہ بات مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ کوئی بات سیاق کے خلاف کہی جائے، جیسے اس اعرابی نے یہ محسوس کیا کہ جہاں چور کے ہاتھ کاٹنے کا ذکر ہے اور اس کو سخت سزا کی دھمکی دی جا رہی ہے، وہاں معاف کرنے اور رحم کرنے کا ذکر کس طرح ہوسکتا ہے، یہاں تو ''عزیز'' اور ''حکیم'' کی صفات ہی مناسب حال ہیں کہ وہ ''عزیز'' یعنی عزت اور غلبہ والا بھی ہے کہ اپنے حکم کی شدید خلاف ورزی کرنے والے کے لیے جو چاہے سزا تجویز کرسکتا ہے؛ لیکن ساتھ ہی ''حکیم'' بھی ہے، اس کی حکمت یہی ہے کہ سزا اپنی مناسب مقدار سے کم یا زیادہ نہ ہونے پائے؛ بلکہ جرم کے برابر یا اس کے قریب قریب ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ علم بیان کے ذریعہ ایک بات کو متنوع اسالیب میں پیش کیا جاسکتا ہے اور بدیع کے ذریعہ اس میں شگفتگی پیدا کی جاسکتی ہے، لیکن کلام مؤثر اسی وقت ہوگا جب موقع ومحل اور مخاطب کی رعایت کے ساتھ کیا جائے گا اور بلاغت کے یہی معنی ہیں کہ بلند معانی کو واضح تعبیرات

والفاظ میں ماحول کی رعایت کرتے ہوئے ایسے انداز میں پیش کیا جائے کہ مخاطب پر اثر انداز ہو، اس طرح بلاغت پر علم معانی کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

8.6 علم المعانی کی اساس، ابتدا اور نشو ونما

8.6.1 علم المعانی کی اساس

علم معانی کی اصل وہ نظریہ ہے جو عبدالقاہر جرجانی (وفات: 471ھ) نے ''نظم'' کے عنوان سے پیش کیا تھا اور نظم سے مراد اُن کی یہ ہے کہ کلام کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ پر معلق کیا جائے، نظم میں دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس معنی اور مضمون پر توجہ دی جائے جو ہم بیان کرنا چاہتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس کے مناسب حال ہم کون سے الفاظ منتخب کرتے ہیں، اگر ہمارا مقصود بدل جائے تو الفاظ بھی بدلنا ضروری ہے، اگر چہ مضمون ایک ہی ہو یعنی ایک ظاہری شکل ہے اور ایک وہ معنی جس کے لیے ہم جملہ کو ایک خاص قالب میں ڈھالتے ہیں، اس کو دو مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے، پہلی مثال: ''**إنما المتنبي شاعر**'' (متنبی تو شاعر ہے)، یہ جملہ مثلاً اس وقت کہا جاتا ہے جب دو لوگوں میں بحث ہو رہی ہو، ان میں ایک کی رائے یہ ہو کہ متنبی حکیم و دانا تھا شاعر نہیں، تو دوسرا کہتا ہے نہیں وہ تو شاعر ہے، اس جملہ کی ساخت اس وقت بدل جائے گی جب ہمیں کسی دوسرے شاعر سے متنبی کا مقابلہ کرتے ہوئے بتانا ہو کہ وہ بڑا شاعر ہے، مثلاً سوال ہو کہ ابو تمام بڑا شاعر ہے یا متنبی؟ یا یہ کہ بحتری بڑا شاعر ہے یا متنبی؟ تو ہم کہتے ہیں: ''**إنما الشاعر المتنبي**'' (شاعر تو متنبی ہی ہے)۔

ایک اور مثال لیجیے: **أتقرأ ''أولاد حارتنا؟''** (کیا آپ نجیب محفوظ کی ناول **''أولاد حارتنا''** پڑھ رہے ہیں؟)، یہ جملہ مثلاً اس وقت کہہ سکتے ہیں جب ایک طالب علم جس کا کل صبح امتحان ہو اور وہ اپنی نصابی کتاب چھوڑ کر اس کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہو، لیکن اگر کسی سے یہ کہنا ہے کہ اور کوئی کتاب نہیں ملی آپ **''أولاد حارتنا''** جیسی کتاب کیوں پڑھ رہے ہیں؟ تو اسے اس طرح کہیں گے: **''أكتاب أولاد حارتنا تقرأ؟''**۔

دونوں جملوں میں یہ فرق شوقیہ نہیں کیا گیا بلکہ معنوی فرق اور ماحول کا تقاضہ تھا کہ الفاظ میں تقدیم وتاخیر کی جائے، گویا بولنے میں الفاظ کی ترتیب ذہن ودماغ میں پائے جانے والے معنی کی ترتیب کے مطابق ہوتی ہے، یہی وہ نظم ہے جس کی طرف جرجانی نے اشارہ کیا ہے۔

اسی سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں تقدیم وتاخیر کیوں ہوتی ہے؟ مثلاً: **''ذلک الکتاب لا ریب فیه''** **(البقرۃ:2)** (اس کتاب میں کوئی شک وشبہ نہیں) اور دوسری جگہ ہے: **''لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون''** **(الصافات: 47)** (نہ اس میں چکر آئے گا نہ پینے والے اس سے بہکیں گے)۔

پہلی مثال میں **''فیه''** بعد میں ہے اور **''ریب''** کا لفظ **''فیه''** جو جار ومجرور ہے اس سے پہلے ہے اور دوسری مثال میں **''فیھا''** پہلے ہے اور لفظ **''غول''**، **''فیھا''** جو جار ومجرور ہے اس کے بعد آیا ہے، چونکہ پہلی مثال میں صرف قرآن سے شک کی نفی کرنا مقصد ہے اور کسی دوسری کتاب سے اس کا مقابلہ کرنا مقصد نہیں جب کہ دوسری مثال میں دنیا کی شراب کے مقابلہ میں یہ بتانا ہے کہ اس سے چکر نہیں آئے گا جیسا کہ دنیا کی شراب کا یہ عیب ہے کہ اس سے انسان بدمست ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں بے شمار برائیوں میں پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

یہی نظم کا نظریہ ہے اور اسی کی عملی تطبیق کو علم المعانی کہتے ہیں۔

8.6.2 علم المعانی کی ابتدا

ابتدا میں بلاغت کا علم ایک اکائی کے طور پر پڑھا اور پڑھایا جاتا تھا، اس میں یہ تین قسمیں: بیان، بدیع اور معانی نہیں پائی جاتی تھیں۔ بلاغت کی ابتدائی کتابوں میں ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ بلاغت کی تینوں قسموں کو ایک دوسرے کے ساتھ ضم کر دیا گیا ہے، پھر رفتہ رفتہ یہ تینوں قسمیں مستقل علوم کی شکل اختیار کرتی گئیں۔

علم المعانی کے متعلق سب سے پہلے جعفر بن یحییٰ برمکی (وفات ۱۸۷ھ) نے چند اصول لکھے مگر یہ اصول کسی کتاب میں مذکور نہیں ہیں۔ اس کے بعد عمرو بن بحر بن محبوب اصفہانی (وفات ۲۵۵ھ) ان کی کنیت ابوعثمان ہے جو جاحظ سے مشہور ہیں انھوں نے اس فن کو باقاعدہ مرتب و مدون کیا ہے اس لیے بعض حضرات نے علم المعانی کا مدون اول ان ہی کو قرار دیا ہے۔ اس فن میں ان کی کتاب ''البیان و التبیین'' بنیادی کتاب میں شمار کی جاتی ہے۔

اس کے بعد شیخ ابوبکر عبدالقاہر بن عبدالرحمن جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) کا نام آتا ہے ان کی کتاب ''دلائل الإعجاز'' اس فن کی مایہ ناز کتاب ہے۔ انھوں نے علم بیان کا نظریہ اپنی کتاب ''أسرار البلاغة'' میں بالترتیب پیش کیا اور تمام مباحث کو یکجا کر دیا ہے۔ اس کے بعد ابو یعقوب یوسف بن محمد سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) کا دور ہے۔ انھوں نے مایہ ناز کتاب ''مفتاح العلوم'' تالیف فرمائی جو تین قسموں پر مشتمل ہے اور قسم ثالث علم بلاغت کے فنون ثالثہ (معانی، بیان اور بدیع) کے لیے مخصوص ہے۔

علم بیان کے مدونین میں سیبویہ خلیل بن احمد البصری اور ابوعبیدہ معمر بن مثنی تیمی (وفات: ۲۰۹ھ) کا نام آتا ہے اور آخر الذکر نے اس فن میں ایک جامع کتاب ''مجاز القرآن'' کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں اسالیب قرآن کے جملہ انواع کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ فن بدیع میں سب سے پہلے جو کتاب تالیف ہوئی وہ امیر المؤمنین ابوالعباس المرتضی باللہ عبداللہ بن المعتز المتوکل علی اللہ (وفات: ۲۹۶) کی کتاب ''البدیع'' ہے امیر موصوف ہی اس فن کے موجد ہیں اور موصوف ہی نے یہ نام تجویز کیا ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو عربی زبان میں عبدالقاہر جرجانی علم بیان کے ساتھ ساتھ علم معانی کو باضابطہ اور مستقل بیان کرنے میں سب سے ممتاز اور سرفہرست ہیں، انھوں نے دونوں علم کو جوڑ کر ایک اکائی بنا دی ہے جس کے ساتھ ہم بدیع کو ملا کر ایک مکمل علم کا مطالعہ کرتے ہیں جسے بلاغت کہتے ہیں۔

8.6.3 علم المعانی کی نشو ونما اور ابتدائی کتابیں

جرجانی کے علمی کاموں کے اختصار اور تلخیص کی طرف سب سے پہلے فخر الدین رازی (وفات: 606ھ) نے توجہ کی اور ''نهاية الإيجاز في دراية الإعجاز'' لکھی، اس کتاب میں انھوں نے جرجانی کی دونوں کتابوں ''دلائل الإعجاز'' اور ''أسرار البلاغة'' کی تلخیص کی، وہ خود فرماتے ہیں: ''جب اللہ تعالی نے مجھے ''دلائل الإعجاز'' اور ''أسرار البلاغة'' کے مطالعہ کی توفیق دی تو میں نے ان دونوں سے اہم فوائد کا انتخاب کر لیا اور عقلی قواعد کے سلسلہ میں متفرق معلومات یکجا کر دیں''۔

پھر رازی کے ساتھ ساتھ اور اسی زمانہ میں ایک بڑے عالم ابھر کر سامنے آئے، جن کو فلسفہ و منطق، اصول فقہ، عربی زبان و ادب اور

بلاغت میں کمال حاصل تھا، خصوصاً بلاغت پر ان کے گہرے اثرات پڑے، یہ سراج الدین ابویعقوب یوسف سکاکی (وفات: 626ھ) کی شخصیت تھی، انھوں نے اس فن کو آگے بڑھایا اور قواعد کی مزید وضاحت کی جس سے یہ فن اور نکھر کر سامنے آیا، انھوں نے **"مفتاح العلوم"** نامی ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے پانچ چیزوں سے بحث کی:

1- صرف 2- نحو 3- علم معانی اور بیان 4- علم استدلال یا ترکیب کلام کی خاصیات کا علم 5- علم شعر

آپ نے دیکھا کہ رازی کے بعد اس میدان میں سکاکی کا نام ملتا ہے، جو **"مفتاح العلوم"** کے مصنف ہیں، دیکھا جائے تو ان کی یہ کتاب اصلاً چار ہی موضوعات سے بحث کرتی ہے:

(1) علم الصرف (2) علم النحو (3) علوم البلاغة (صرف علم بیان اور معانی) (4) علم الشعر

علم استدلال کا تعلق معانی سے ہی ہے، مزید وضاحت کے لیے انھوں ن نے عناوین بڑھا دیے ہیں۔

رازی اور سکاکی سے پہلے زمخشری (وفات: 538ھ) **"أساس البلاغة"** لکھ چکے تھے، ہاں یہ کتاب اصلاً لغت کے طرز پر ابجدی ترتیب سے لکھی گئی ہے، مثلاً: أبد اور اس سے متعلق الفاظ و تعبیرات اور محاورات ذکر کیے جاتے ہیں اور اس کے حقیقی و مجازی معنی وغیرہ ذکر کیے جاتے ہیں، سکاکی نے جرجانی، زمخشری اور فخر الدین رازی کی تحریروں کی روشنی میں دو کام کیے:

1 - ایک تو ان ماہرین کی آرا کو خلاصہ کی شکل میں جمع کر دیا اور ساتھ ہی وہ افکار جو خود ان کی ذاتی محنت اور شخصی ذوق کے نتیجہ میں سامنے آئے تھے ان کو بھی نقل کر دیا۔

2 - دوسرے یہ کہ ان سب کو انھوں نے قواعد کی شکل دے دی اور تعریف و تقسیم پھر تقسیم در تقسیم کے جو منطقی طریقے رائج تھے انہیں طریقوں پر اپنی کتاب کو ڈھال دیا۔

سکاکی سے پہلے اصل زور اس پر تھا کہ کلام کے حسن و جمال اور اس کی خوبیوں کو نمایاں کیا جائے، ذوق کی تربیت کی جائے اور عربی تحریروں اور خاص طور سے قرآن مجید کی ادبی جمالیات کو بیان کیا جائے، اصل مقصد قواعد کو بیان کرنا نہیں؛ بلکہ ادبی ملکہ پیدا کرنا تھا؛ لیکن سکاکی نے اس فن کو منطقی بنیادوں پر مرتب کیا اور اسے ایک مستقل علم بنا دیا جس کے مخصوص قواعد و نظریات مرتب ہو گئے۔

اس سے یہ تو فائدہ ہوا کہ بلاغت کے قواعد مرتب ہو گئے؛ لیکن جرجانی کے بعد اس فن میں کوئی جدت یا اضافہ نظر نہیں آتا، بلکہ انہیں قواعد کو بلاغت پر لکھنے والے دوہراتے رہے ہیں جو جرجانی نے وضع کر دیے تھے اور اس میں افراط و تفریط کے بھی متعدد نمونے ملتے ہیں، تفریط یہ کہ ان قواعد کو اتنا مختصر کیا گیا کہ وہ چیستاں اور پہیلی بن گئے اور اب اس الجھاؤ کو ختم کرنے کے لیے یہ افراط کی گئی کہ ان قواعد کی طویل ترین تشریحات کی گئیں حتی کہ ان میں اصل علم کھو کر رہ گیا اور بلاغت کے ماہرین پیدا کرنے میں یہ طرز ناکام رہا؛ چونکہ یہ خالص ذوقی چیز تھی اور آج بھی ہے، اسی لیے قواعد سے مدد ضرور لینی چاہیے؛ لیکن براہ راست ادبی عبارتوں میں غور و فکر کے ذریعہ نئے نئے معانی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس سے یہ فن اور ترقی کر سکتا ہے اور نئے گوشے سامنے آ سکتے ہیں۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سکاکی کے بعد یہ فن جمود کا شکار ہو گیا اور اس کے بعد یا تو ان کی کتاب کی شرحیں لکھی گئیں یا اس کی تلخیص پر مشتمل کتابیں تیار ہوئیں، ذیل میں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے:

8.6.3 "مفتاح العلوم" کی شروحات وتلخیصات

1- قطب الدین محمد شیرازی (وفات:710ھ) نے "مفتاح العلوم" کے عنوان سے اس کتاب کی شرح لکھی۔

2 - محمد بن مظفر خلخالی (وفات:745ھ) نے "شرح المفتاح" کے نام سے شرح لکھی۔

3 - سید شریف جرجانی (وفات816ھ) نے مفتاح کی تیسری قسم کی شرح لکھی۔

4- ابن کمال پاشا (وفات:940ھ) نے بھی مفتاح کی شرح لکھی۔

5 - بدرالدین بن مالک (وفات:668ھ) نے "المصباح في اختصار المفتاح" کے نام سے اس کی تلخیص کی۔

6 - خطیب قزوینی (وفات:739ھ) نے "تلخیص المفتاح" لکھی۔

7- عبدالرحمن شیرازی (وفات:756ھ) نے بھی تلخیص کی اور اپنی کتاب کا نام رکھا: "الفوائد الغياثية في علوم المعاني والبيان والبديع"۔

ان میں خطیب قزوینی کا خلاصہ "تلخيص المفتاح" زیادہ مشہور ہوا، اس تلخیص کی مختلف شروحات لکھی گئیں، تفصیل درج ذیل ہے:

1۔ قزوینی نے خود ہی اس کی شرح لکھی اور "إيضاح التلخيص" اس کا نام رکھا، نیز "دلائل الإعجاز" اور "أسرار البلاغة" سے اس میں کچھ اضافے بھی کیے۔

2۔ قزوینی کی کتاب کی دوسری شرح خلخالی نے "مفتاح تلخيص المفتاح" کے نام سے لکھی۔

3۔ سعدالدین تفتازانی (وفات:793ھ) نے اس کی نے دو شرحیں لکھیں: (1) شرح کبیر (2) شرح صغیر۔

شرح کبیر "المطوّل" کے نام سے مشہور ہوئی اور شرح صغیر جو بعد میں ''شرح کبیر'' کے اختصار کے طور پر لکھی گئی اس کا نام "مختصر المعاني" رکھا گیا جو درس نظامی میں داخل نصاب ہے۔

اس کے علاوہ بھی خطیب قزوینی کی تلخیص کی شرحیں اور تلخیصات لکھی جاتی رہیں اور سب کا سہرا سکا کی کے سر جاتا ہے۔

8.6.4 جدید کتابیں

اس کے بعد بھی مختلف کتابیں اور رسائل اس موضوع پر شائع ہوتے رہے، جدید دور میں بھی کتابیں آتی رہیں اور ان کی ترتیب اور قواعد کا التزام وہی رہا جو سکا کی نے شروع کیا تھا، ان میں "البلاغة الواضحة" اور "دروس البلاغة" زیادہ مشہور ہوئیں، جو مشترک تصنیفات ہیں، مستقل علم المعانی پر عبدالعزیز عتیق کی "علم المعاني" اور فضل حسن عباس کی "البلاغة فنونها وأفنانها" مفید کتابیں ہیں۔

8.7 علم المعانی کے اہم مؤلفین

8.7.1 الجرجاني (400-471ھ)

عبدالقاہر بن عبدلرحمن الجرجانی جرجان (ایران) میں پیدا ہوئے اور وہیں وفات پائی، بچپن سے ہی نحو وادب کی کتابوں سے خصوصی دلچسپی تھی۔ انھوں نے سیبویہ (وفات:148ھ)، جاحظ (وفات:255ھ)، ابوعلی فارسی (وفات:377ھ)، ابن قتیبہ (وفات:322ھ)، قدامہ بن

جعفر (وفات:337ھ)، حسن بن بشر آمدی (وفات:370ھ)، ابو ہلال عسکری (وفات:395ھ) اور ابواسحاق زجاج (وفات:311ھ) وغیرہ کی کتابوں سے بڑا فائدہ اٹھایا اور جابجا اپنی کتابوں میں ان کے حوالے دیے ہیں۔

عبدالقاہر جرجانی کی شہرت ابتدا میں نحو ولغت کے مستقل امام کی حیثیت سے تھی، اکثر تذکرہ نگاروں نے انھیں اسی حیثیت سے متعارف کرایا، فن بلاغت ونقد میں ان کی مجتہدانہ حیثیت بعد میں سامنے آئی، ان کی دو کتابیں "دلائل الإعجاز" اور "أسرار البلاغة" سب سے زیادہ مشہور ہوئیں اور انہیں سے ان کا تعارف ہوا۔

ان کے علاوہ ان کی چند اہم تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

(1) "کتاب شرح الفاتح" (2) "درج الدرر في تفسیر الآي و السور": ان دونوں تصانیف کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے لیکن یہ کتابیں ناپید ہیں۔

(3) "المعتضد": ابوعبداللہ محمد بن یزید، الواسطی کی تصنیف "إعجاز القرآن" کی شرح ہے۔ "الشرح الکبیر" کے نام سے یہ کتاب مشہور ہے۔

(4) "الشرح الصغیر": یہ بھی مذکورہ بالا تصنیف "إعجاز القرآن" کی مختصر شرح ہے، اس کتاب کا بھی اب صرف نام باقی ہے۔

(5) "الرسالة الشافیة": اعجاز قرآنی سے متعلق یہ تصنیف "ثلاث رسائل في إعجاز القرآن" میں شامل کر کے شائع ہو چکی ہے۔

(6) "الإعجاز": ابوعلی الفارسی کی تصنیف "الایضاح" کی مختصر شرح ہے، یہ کتاب بھی اب تک طبع نہ ہو سکی۔

(7) "المغني": یہ مذکورہ بالا "الایضاح" کی مبسوط شرح ہے۔ تمام مشہور تذکرہ وتراجم کی کتابوں میں اس کا ذکر ہے لیکن وہ بھی چھپی ہوئی نہیں ملتی۔

(8) "المقتصد": "المغني في شرح الإیضاح" کی تلخیص ہے، جس کی تحقیق مختلف محققین نے کی ہے اور وہ زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔

(9) "الجمل": "العوامل المئة" جو خود جرجانی کی مشہور ومتداول مطبوعہ تصنیف ہے، "الجمل" اس کی شرح ہے، اس کی متعدد شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔

(10) "التلخیص": "کتاب الجمل" کی تلخیص ہے۔

ان کے علاوہ جرجانی کی دیگر تصانیف کا بھی ذکر بھی ملتا ہے لیکن نہ ان کا پوری طرح تعارف کرایا گیا ہے نہ ہی طباعت یا مخطوطات کی نشاندہی کی گئی ہے، جرجانی ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے، لیکن ان کی شہرت آج تک فن بلاغت ونقد کے مجتہد مطلق کی حیثیت سے ہے۔

8.7.2 السکّاکي (555-626ھ)

خوارزم جمہوریہ ازبکستان (روس) کا ایک اہم صوبہ تھا، جہاں عہد اسلام میں بے شمار اہلِ علم پیدا ہوئے، خیوہ اس صوبہ کا مرکزی شہر ہے، مامون الرشید (وفات:218ھ) کے دور کا مشہور منجّم اور الجبرا کا ماہر محمد بن موسی الخوارزمی (وفات:232ھ) اسی مردم خیز خطے میں پیدا ہوا اور معلمِ ثانی ابونصر فارابی (وفات:339ھ) کا مولد فاراب اسی علاقے میں واقع ہے، اسی خطہ سے "مفتاح العلوم" کے مصنف سکاکی کا تعلق ہے۔

سکا کی کا نام ونسب ابوبکر یوسف بن ابی بکر بن محمد مذکور ہے، سراج الدین لقب تھا، مگر شہرت "السكاكي" سے ہوئی، وہ 555ھ کو خوارزم میں پیدا ہوئے، تذکرہ نگاروں نے "السكاكي" کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے مختلف رائے پیش کی ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ شہر ''سکاکہ'' کی طرف نسبت ہے جو نیشاپور میں واقع ہے، بعض محققین کا خیال ہے کہ سکا کی خوارزم کا باشندہ تھا اور ''سکاکہ'' خوارزم میں نہیں، اس لیے اس کی طرف نسبت ممکن نہیں، دوسری رائے یہ ہے کہ سکا کی کے جد امجد ''ابن سکاک'' تھے اور ''سکا کی'' خاندانی نام ہے، تیسری رائے یہ ہے کہ سکا کی چاقو چھریاں بنانے کا کام کرتے تھے، اس کی وجہ سے سکا کی مشہور ہوئے، عربی زبان میں چھری کو ''سکین'' کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن سکا کی نے قلم دان تیار کیا جو نفاست اور مہارتِ فن کی وجہ سے بے نظیر تھا، انھوں نے یہ خوب صورت قلم دان ملک کے حکمران کو تحفہ میں دیا اور انہیں شاہی انعام واکرام سے نوازا گیا، کچھ دیر بعد ان کی موجودگی میں ایک اجنبی دربار میں حاضر ہوا اور نہایت تزک و احتشام سے اجنبی کا استقبال کیا گیا، سکا کی نے نو وارد کا اکرام و تعظیم دیکھ کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اجنبی ایک عالم ہے، سکا کی نے محسوس کیا کہ ایک فن میں مہارت حاصل کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ علم کی تحصیل کی جائے اور انھوں نے حصولِ علم پر توجہ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

سکا کی ترکی زبان کا شاعر تھا اور اس کا ترکی کلام محفوظ ہے، مگر اس کی شہرت ''مفتاح العلوم'' کی بدولت ہے جو ''بلاغت'' پر لکھی گئی، یہ ان کی تمام کتابوں میں جامع ترین ہے، اگرچہ اس پر بعض تنقیدیں بھی کی گئیں ہیں، سکا کی نے مختلف علما کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اپنے ارادہ میں کامیابی حاصل کی، ان کے اساتذہ کا تذکرہ نہیں ملتا، سکا کی حنفی فقہا میں بھی ممتاز تھے، 626ھ کو علم وہنر کا یہ آفتاب صوبہ فرغانہ میں ''المانع'' نامی قصبہ کے قریب ایک گاؤں میں فوت ہوا جو مشہور فلسفی یعقوب بن اسحاق الکندی (وفات: 260ھ) کا مولد ہے۔

8.7.3 التفتازاني (712ھ-793ھ)

آٹھویں صدی ہجری کے مسلمان حکما میں علامہ تفتازانی کا نام نہایت نمایاں ہے، ان کا نام مسعود بن عمر بن عبداللہ تفتازانی، لقب سعد الدین تھا، علم معانی، عربی لغت اور منطق کے امام تصور کیے جاتے ہیں، اس کے علاوہ آپ فقیہ، اصولی، مفسر اور ادیب بھی تھے، ان کی پیدائش تفتازان میں ہوئی جو خراسان میں ہے، تفتازانی نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی، اعلیٰ تعلیم عضد الدین ایجی (وفات: 756ھ) سے حاصل کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے قطب الدین رازی (وفات: 766ھ) سے بھی استفادہ کیا تھا، تفتازانی نے جملہ مروجہ علوم صرف ونحو، منطق وفلسفہ، معانی وبیان اور اصول وتفسیر میں کمال حاصل کیا، ان کی شہرت جلد ہی دور دور تک پھیل گئی اور طلبہ ان سے استفادے کے لیے رجوع کرنے لگے۔

تفتازانی کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مختلف شہروں میں قیام کیا، وہ ہرات، سرخس، سمرقند، جبرون، ترکستان اور خوارزم میں مقیم رہے، تدریس کے ساتھ ساتھ تفتازانی نے مظفریہ حکمران فارس شاہ شجاع کے دربار میں ملازمت اختیار کرلی، تیمور نے خوارزم پر حملہ کیا اور شاہ شجاع کی سلطنت متأثر ہوئی، اس زمانہ میں ملک محمد سرخسی نے اپنے بھتیجے محمد بن غیاث الدین کو لکھا (جو اس وقت تیمور کا درباری تھا) کہ تیمور سے منظوری لے کر تفتازانی کو سرخس بھیج دیا جائے، چنانچہ تفتازانی ملک محمد سرخسی کے پاس سرخس چلے گئے، کچھ عرصہ بعد امیر تیمور کو تفتازانی کے علم وفضل سے آگاہی ہوئی تو انہیں واپس سمرقند بلا بھیجا، تفتازانی نے پہلے تو عذر کیا کہ وہ حجاز جانے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر اصرار پر سمرقند چلے گئے، تیمور نے اپنے دربار میں صدر الصدور کی حیثیت سے جگہ دی۔

تفتازانی نے سولہ سال کی عمر میں پہلی کتاب لکھی اور آخر دم تک قلم ہاتھ سے نہ رکھا، ان کی بے شمار کتابیں یادگار ہیں، تفتازانی نے جملہ

مروجہ علوم میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے، ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں: نحو میں "إرشاد الهادي"، صرف میں "شرح التصريف العزّي" اور بلاغت میں "المطول" لکھی، پھر "المختصر" کے نام سے اس کا اختصار تیار کیا، علم کلام میں "مقاصد الطالبين"، عقیدہ میں "شرح العقائد النسفية"، منطق میں "تهذيب المنطق"، اصول فقہ میں "التلويح إلى كشف غوامض التنقيح" وغیرہ کتابیں ان کے قلم سے نکلیں اور مشہور ہوئیں۔

8.7.4 دیگر مؤلفین

ان کے علاوہ چند اور مؤلفین کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کو علم معانی کے حوالہ سے جانا جاتا ہے، ان میں مشہور یہ ہیں:

1- علی بن محمد بن علی شریف جرجانی (740-816ھ)

عربی زبان کے نابغۂ روزگار عالم اور فلسفی شمار کیے جاتے ہیں، تاکو (استرآباد ایران کا ایک شہر ہے جو آج گرگان کے نام سے جانا جاتا ہے) میں پیدا ہوئے اور شیراز میں تعلیم حاصل کی، علامہ تفتازانی سے ان کے مباحثات رہے ہیں، پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں علمی اصطلاحات پر مبنی کتاب "كتاب التعريفات" زیادہ مشہور ہے، اس کے علاوہ انھوں "المفتاح" کے بعض مباحث کی اور تفتازانی کی "المطول" اور "المختصر" کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔

2- **عضد الدين الإيجي** (680-756ھ)

ان کا نام عبدالرحمن بن رکن الدین البکری ہے، شیراز سے تعلق تھا، بڑے درجہ کے فقیہ اور متکلم تھے، ایک ماہر استاذ اور مربی تھے، ان کے جلیل القدر شاگردوں میں تفتازانی اور شمس الدین الکرمانی کے نام بھی آتے ہیں، حدیث، تفسیر، فقہ واصول وغیرہ میں متعدد کتابیں لکھیں، بلاغت میں قزوینی کی "تلخيص المفتاح" کی مفصل شرح کے علاوہ سکاکی کی "المفتاح" کی بھی شرح لکھی، اسی طرح "الفوائد الغياثية في المعاني والبيان" کے نام سے مستقل تصنیف کی۔

3- برہان الدین حیدر شیرازی (780-854ھ)

صدرالہروی ان کا خطاب تھا، معانی، بیان اور عربی زبان کے ماہر تھے، تفتازانی اور جرجانی سے استفادہ کیا اور قزوینی کی "الإيضاح" کی شرح لکھی۔

4- محمد بن یوسف شمس الدین کرمانی (717-786ھ)

حدیث وتفسیر، عربی زبان اور معانی کے مشہور عالم تھے، کرمان (ایران) کے رہنے والے تھے، لیکن بغداد میں سکونت اختیار کرلی اور وہیں ان کی شہرت ہوئی، ایک مدت تک مکہ مکرمہ میں بھی رہے، ان کی سب سے مشہور کتاب "الكواكب الدراري" ہے جو صحیح بخاری کی شرح ہے، بلاغت میں "الفوائد الغياثية" کی شرح لکھی۔

5- محمود بن مسعود فارسی، قطب الدین شیرازی (634-710ھ)

مشہور زمانہ قاضی، مفسر اور ماہر عقلیات تھے، علم ریاضی اور فلکیات کے مشہور مسلم علما میں ایک نمایاں نام ہے، شیراز میں پیدا ہوئے، نصیر الدین طوسی (وفات: 1274ء) سے تعلیم حاصل کی، سیواس کے قاضی ہوئے، تبریز میں جاکر رہائش اختیار کی اور وہیں وفات پائی، طب میں ابن سینا (وفات: 1037ء) کی کلیات قانون کی شرح لکھی اور بلاغت میں "مفتاح المفتاح" کے نام سے سکاکی کی "المفتاح" کی شرح لکھی۔

8.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد ہمیں درج ذیل نتائج حاصل ہوئے:

☆ عام طور سے بلاغت کے ماہرین نے اس کی اس طرح تعریف کی ہے: "**هو علمٌ يُعرفُ به أحوالُ اللَّفظِ الْعربي التي بها يُطَابِقُ اللَّفظُ مُقْتَضَى الْحَالِ**" (یہ ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ ایک عربی لفظ کے ان احوال کو پہچانا جاتا ہے جن کے ذریعہ لفظ مقتضائے حال کے مطابق ہو جاتا ہے)۔

☆ علم معانی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہم اپنے جملوں کو کس طرح مرتب کریں اور مقتضائے حال کے مطابق کیسے کلام کریں، کہاں جملوں کو مقدم کریں کہاں مؤخر، کہاں پورا جملہ ذکر کریں کہاں حذف سے کام لیں، کہاں معرفہ کا استعمال ہو اور کہاں نکرہ کا، کہاں ایجاز و اختصار سے کام لیں کہاں تفصیل سے گفتگو کریں اور اس کی جتنی بھی مختلف تعبیرات میں اس کی تعریف کریں ان کا مفہوم یہی ہوگا کہ ہر مقام کے مطابق ایک الگ گفتگو ہوتی ہے، اہل بلاغت کا مشہور جملہ ہے: "**لکل مقام مقال**"۔

☆ علم المعانی میں آٹھ ابواب سے بحث ہوتی ہے: (1) احوالِ اسنادِ خبری۔ (2) احوالِ مسند الیہ۔ (3) احوالِ مسند۔ (4) احوالِ متعلقاتِ فعل۔ (5) انشاء۔ (6) قصر۔ (7) فصل و وصل۔ (8) ایجاز، اطناب اور مساوات۔

☆ علم معانی کا موضوع لفظ عربی ہے اس حیثیت سے کہ وہ اپنے اندر کیا معنی رکھتا ہے اور معنی سے مراد دونوں معنی ہیں، ایک تو وہ معنی جس کو نحو میں اصلِ معنی کہتے ہیں یعنی جو الفاظ سے ظاہر ہیں، دوسرے وہ معنی جو کلام کا مقصود ہیں، مثلاً: "**إن زيدًا لقائم**" اس جملہ کا ایک معنی تو یہ ہے کہ زید یقیناً کھڑا ہے؛ لیکن دوسرا معنی یا مقصد اس جملہ کو اس تاکیدی انداز میں کہنے کا یہ ہے کہ مخاطب کو باور کرا دیا جائے کہ زید کھڑا ہوا ہے اس میں ذرہ برابر بھی شک کی گنجائش نہیں ورنہ "**زید قائم**" (زید کھڑا ہے) کہنا بھی کافی تھا۔

☆ علم معانی کی اصل وہ نظریہ ہے جو عبد القاہر جرجانی نے "نظم" کے عنوان سے پیش کیا تھا اور نظم سے مراد اُن کی یہ ہے کہ کلام کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ پر معلق کیا جائے، نظم میں دو باتیں ضروری ہیں: ایک تو یہ کہ اس معنی اور مضمون پر توجہ دی جائے جو ہم بیان کرنا چاہتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس کے مناسب حال اور اس کے لیے ہم کون سے الفاظ منتخب کرتے ہیں۔

☆ ابتدا میں بلاغت کا علم ایک اکائی کے طور پر پڑھا اور پڑھایا جاتا تھا، اس میں یہ تین قسمیں نہیں پائی جاتی تھیں، بلاغت کی ابتدائی کتابوں میں ہمیں ایسا ہی نظر آتا ہے کہ بلاغت کی تینوں اقسام ایک دوسرے کے ساتھ ضم کر کے بیان کی گئی ہیں، پھر رفتہ رفتہ یہ تینوں قسمیں مستقل تین علوم کی شکل اختیار کرتی گئیں، لیکن پھر بھی زیادہ تر مصنفین ان کو خلط ملط کر ہی دیتے تھے، یہی صورت حال تھی جب پانچویں صدی ہجری میں عبد القاہر جرجانی کا دور آیا، جرجانی نے باضابطہ طور پر علم معانی کا نظریہ اپنی کتاب "**دلائل الإعجاز**" میں پیش کیا جب کہ علم بیان کا نظریہ اپنی کتاب "**أسرار البلاغة**" میں پیش کیا، اس سے پہلے ابن المعتز علم بدیع کا نظریہ اپنی کتاب "**البديع**" میں پیش کر چکے تھے، اس طرح یہ تینوں علوم ایک دوسرے سے ممتاز ہو کر بیان ہونے لگے، گویا بلاغت ایک درخت ہے جس کی تین شاخیں ہیں اور یہی شاخیں پھیل کر مستقل چھوٹے چھوٹے درختوں کی جگہ لے چکی ہیں۔

☆ جرجانی کے بعد اس فن میں رازی کا نام آتا ہے، اس کے بعد سکا کی "مفتاح العلوم" لکھتے ہیں جس کتاب کو علم معانی میں ایک بنیادی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے بعد کی کتابیں اس کے ارد گرد گھومتی ہیں، یا تو اس کی شرحیں لکھی گئیں یا اس کی تلخیص کی گئی، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سکا کی کے بعد یہ فن جمود کا شکار ہو گیا، اس فن کے دیگر ماہرین میں علامہ تفتازانی، شریف جرجانی، عضد الدین الایجی، برہان الدین حیدر شیرازی، محمد بن یوسف شمس الدین کرمانی، محمود بن مسعود فارسی اور قطب الدین شیرازی وغیرہ کے نام ذکر کیے جاتے ہیں۔

8.9 امتحانی سوالات کے نمونے

ا- درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے:

1- علم المعانی کی تعریف بیان کیجیے اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالیے۔

2- جرجانی، تفتازانی کے حالات اور فن بلاغت میں ان کے مقام و مرتبے کے بارے میں لکھیے۔

3- بلاغت پر علم المعانی کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔

4- "مفتاح العلوم" اور اس کی شروحات و تلخیصات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

ب- درج ذیل سوالات کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے:

1- علم المعانی کے اہم مؤلفین پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

2- علم المعانی کی غرض و غایت اور اس کی اساس کا جائزہ لیجیے۔

3- علم المعانی کی ابتدا، نشو و نما اور اہم کتابوں پر ایک نوٹ لکھیے۔

8.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1-	مختصر المعاني	سعد الدین تفتازانی
2-	علم المعاني	عبد العزیز عتیق
3-	البلاغة فنونها وأفنانها (علم المعاني)	فضل حسن عباس
4-	دروس البلاغة	مشترکہ تصنیف: حفنی ناصف، محمد دیاب، سلطان محمد، مصطفی طموّم
5-	البلاغة الواضحة	مشترکہ تصنیف: علی الجارم و مصطفی امین

اکائی 9 خبر اور اس کی اغراض وانواع

اکائی کے اجزا

9.1 تمہید

9.2 مقصد

9.3 ''خبر'' اور ''انشاء''

9.4 خبر

9.4.1 خبر کی تعریف

9.4.2 تعریف کی تشریح

9.4.3 صدق خبر اور کذب خبر میں اختلاف

9.5 جملہ کے دو ارکان

9.5.1 محکوم علیہ اور محکوم بہ

9.5.2 جملہ اسمیہ

9.5.3 جملہ فعلیہ

9.5.4 جملہ کی قیود

9.6 خبر کے مقاصد

9.6.1 خبر کے بنیادی مقاصد

9.6.2 خبر کے دیگر مقاصد

9.7 خبر کی اقسام

9.8 خبر کی مؤکدات

9.8.1 ''إنّ''، ''لام ابتدا''، ''أمّا الشرطیة''، ''سین''

9.8.2 ''قد''، ''إنّما''، ''ضمیر فصل''، ''قسم''، ''نون تاکید ثقیلہ وخفیفہ''، ''نفی کی تکرار''

9.8.3 حروف زائدہ وحروف تنبیہہ

9.9 مخاطب کی حالت کے برعکس گفتگو

9.10 اکتسابی نتائج

9.11 امتحانی سوالات کے نمونے

9.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

9.1 تمہید

عام طور سے جب کوئی خبر یہ جملہ بولنے والا اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو مخاطب کو اس سے کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہے جواب تک معلوم نہ تھی، جیسے: میں نے یہ کتاب پڑھ لی، یا خبر کی شکل میں کسی سوال کا جواب ہوتا ہے، جیسے یہ سوال کیا جائے کہ اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تو آپ کہیں میری رائے یہ ہے اور پھر آگے اپنی رائے کا ذکر کریں، اگر خبر واقعہ کے مطابق ہو تو خبر دینے والے کو سچا اور اگر واقعہ کے خلاف ہو تو اسے جھوٹا کہا جاتا ہے، اگر کسی جملہ کی بنیاد پر کسی متکلم کی طرف سچ یا جھوٹ کی نسبت ممکن نہ ہو تو پھر وہ خبر نہیں، وہ انشاء ہے جیسے: یہ کام کرو، یہ مت کرو، کاش میں یہ کر پاتا وغیرہ، انشاء کی بحث علیحدہ اکائی میں آرہی ہے، اس اکائی میں خبر، اس کے مقاصد اور اس کی اقسام کے تذکرہ کے ساتھ یہ بھی بیان ہوگا کہ خبر کب کس طرح دی جاتی ہے، کہاں تاکید کے بغیر بات کہی جاتی ہے، کن مواقع پر تاکید پیدا کرنا درست ہے اور کہاں تاکید پیدا کرنا ضروری ہے، یعنی کسی خبر یہ جملہ کے بلاغت کے معیار پر آنے کے لیے اس میں کن اصولوں کی رعایت ضروری ہے۔

9.2 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ یہ سمجھ سکیں گے کہ ماہرین علم المعانی کے مطابق کلام کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہوتی ہیں: خبر اور انشاء۔ انشاء کی بحث کے لیے ایک اکائی مستقل طور پر آرہی ہے، جب کہ اس اکائی میں یہ بتایا جائے گا کہ خبر کی تعریف کیا ہے، بلاغت کے اعتبار سے اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کی اقسام کیا ہیں؟ خبر یہ جملوں میں تاکید کیوں اور کیسے پیدا کی جاتی ہے، تاکید کے لیے کون سے معاون الفاظ عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں، ان کے استعمال کا کیا طریقہ ہے اور کن مواقع پر ان کو استعمال کرنا ہے۔

9.3 خبر اور انشاء

ہر وہ کلام جو ہم بولتے ہیں تو دو میں سے ایک بات ہوتی ہے، یا تو ہم کسی بات کو ثابت کرتے ہیں اور ماضی میں کسی ہوجانے والے کام کی خبر دیتے ہیں، یا ایسی بات کرتے ہیں جو ابھی نہیں ہوئی اور ہم اس کے کرنے کا یا تو مطالبہ کرتے ہیں، یا اس سے منع کرتے ہیں، یا اس کی تمنا کرتے ہیں، یا اس کے بارے میں استفسار کرتے ہیں، یا اس کو آواز دیتے ہیں۔

اس میں پہلی قسم ''خبر'' کہلاتی ہے، مثلاً اگر ہم کہتے ہیں: **''حُرِقَتْ مكتبةُ الإسكندريةِ قبلَ عهد عمر بن الخطاب رضي الله عنه''** (کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمرؓ کے دور حکومت سے پہلے نذر آتش کردیا گیا) تو ہم ایک خبر کو مؤکد طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کی تردید کرسکیں جو یہ غلط دعوی کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ یا جب ہم یہ کہتے ہیں: **''البلاغة العربية عربية في أصولها''** (عربی بلاغت اپنی اصل کے اعتبار سے بھی عربی ہے) تو ہم ان لوگوں کی تردید کرنا چاہتے ہیں جو یہ غلط دعویٰ کرتے ہیں کہ عربی بلاغت یونانی، فارسی اور ہندوستانی بلاغت کا معجون مرکب ہے۔ اسی طرح اگر ہم یہ کہیں: **''المشكلات الاقتصادية في بلادنا ليست ناشئة عن كثرة السكان''** (ہمارے ملک کی معاشی مشکلات آبادی کی کثرت کی وجہ سے نہیں ہیں) تو ہم ایک خبر دے رہے ہیں اور ایک حقیقت کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں اور یہ تمام خبریں ایسی ہیں جن میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ بعض لوگ ان کی بالکلیہ نفی کردیں یا اس کے کچھ حصہ کی نفی کردیں۔ لیکن جب میں شوقی کا یہ مصرعہ پڑھتا ہوں:

قُمْ للمعلم وفِّهِ التبجيلا   (معلم کے لیے کھڑے ہوجاؤ اور اس کی بھرپور عزت کرو)

یا یہ کہ:

لاتنهَ عن خُلقٍ وتأتيَ مثلَه   (ایسی بات سے منع مت کرو جسے تم خود کرتے ہو)

ان مصرعوں میں کہیں کسی ماضی میں ہونے والے واقعہ کی خبر نہیں؛ بلکہ یہ ایک طرح کا قول ہے، جس میں ایک جگہ امر ہے، ایک جگہ نہی ہے۔ یا قرآن کی اس آیت {يَا لَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ} (يٰس: 26) (کاش میری قوم جان پاتی!) ان تمام میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی طرف سچ یا جھوٹ کی نسبت کی جا سکے، ایسے جملوں کو ''انشاء'' کہتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ خبر وہ ہے جس میں سچ اور جھوٹ کا احتمال ہو اور ''انشاء'' وہ ہے جس میں سچ اور جھوٹ کا احتمال نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ ہر کلام یا تو خبر ہوگا یا انشاء اور خبر وہ کلام ہے جس کے کہنے والے کو یہ کہنا صحیح ہو کہ وہ اس کلام میں سچا ہے یا جھوٹا ہے، جیسے: ذهب حامدٌ (حامد گیا) اور خالدٌ مسافرٌ (خالد سفر پر ہے) اور انشاء وہ کلام ہے جس کے کہنے والے کو یہ کہنا صحیح نہ ہو یعنی سچا ہے یا جھوٹا، جیسے: ''سافِرْ يا خالدُ:'' (اے خالد سفر کرو) یا ''اِذْهَبْ يا حامدُ'' (اے حامد جاؤ)۔

9.4 خبر

9.4.1 خبر کی تعریف

''اَلْخَبَرُ مَا يَصِحُ أَنْ يُقَالَ لِقَائِلِهِ أنّهُ صادقٌ فيهِ أو كاذبٌ، فإنْ كَانَ الكلامُ مُطَابِقًا لِلْوَاقِعِ كَانَ قائلُه صادقاً، وإنْ كانَ غيرَ مطابقٍ له كانَ قائلُه كاذبًا'' (خبر وہ ہے جس کے قائل کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہو کہ وہ اپنی خبر میں سچا ہے یا جھوٹا ہے، اگر کلام واقعہ کے مطابق ہو تو اس کے قائل کو سچا اور اگر واقعہ کے خلاف ہو تو اس کے قائل کو جھوٹا کہا جائے گا)۔

مثالیں: الأرضُ تَدُوْرُ حولَ الشمسِ (زمین سورج کے اردگرد گردش کرتی ہے)، طلعتِ الشمسُ (سورج طلوع ہوگیا)، نزل الغيثُ (بارش ہوئی)، بعث الله محمداً رسولاً (اللہ تعالی نے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا)، سيأتي الدجالُ في آخر الزمان (دجال آخری زمانہ میں آئے گا)، سينزلُ عيسى ويقتُلُ الدجالَ (عیسیٰ کا نزول ہوگا اور وہ دجال کو قتل کردیں گے)، {سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الرُّعْبَ} (آل عمران: 151) (عنقریب کفر کرنے والوں کے دلوں میں ہم رعب ڈال دیں گے)، {وَعَدَ اللهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِيْ الْأَرْضِ} (النور: 55) (اللہ تعالی نے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور بالضرور ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا)، {والْكَافِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ} (الشوریٰ 26) (کفر کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے)۔

9.4.2 تعریف کی تشریح

بلاغت کے ماہرین کی رائے ہے کہ کسی خبر کے سچ اور جھوٹ ہونے کا احتمال خبر کے اعتبار سے ہوتا ہے، خبر دینے والے یا صورتحال کے اعتبار سے نہیں ہوتا، اس لیے کہ اگر ہم خبر پر سچ یا جھوٹ کا حکم لگاتے وقت خبر دینے والے کو دیکھنے لگیں یا اس پس منظر کو دیکھنے لگیں جس میں وہ بات کہی گئی ہو تو ہم پائیں گے کہ کچھ خبریں ایسی ہوتی ہیں جن کی صداقت سو فیصد ہوتی ہے اس میں جھوٹ کا ادنیٰ احتمال نہیں ہوتا اور بعض بالکل جھوٹی ہوتی

ہیں، اس کا سچ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایسی خوبیاں جن کا سچ ہونا یقینی اور قطعی ہے اور اس میں جھوٹ کا ادنیٰ احتمال بھی نہیں وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبریں ہیں، یعنی وہ تمام خبریں جو اللہ کی طرف سے آئی ہوں یا اس کے رسول کی طرف سے آئی ہوں اور ثابت ہوں کہ اس کے رسول کی طرف سے ہی ہیں، ان کا سچ ہونا یقینی ہے، یا کوئی بدیہی بات ہو، یا ایک کائناتی حقیقت ہو، جیسے: "السّماءُ فوقَنا" (آسمان ہمارے اوپر ہے) "الأرضُ تحتَنا" (زمین ہمارے نیچے ہے) "ماءُ البحرِ مالح" (سمندر کا پانی کھارا ہے) و "ماءُ النهرِ عَذْبٌ" (نہر کا پانی میٹھا ہے) وغیرہ۔

اسی طرح ایسی خبریں بہت سی ہوسکتی ہیں جن کا جھوٹ ہونا یقینی ہو اور ان میں سچ کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، مثلاً کوئی بات بدیہیات یعنی بالکل واضح اور ظاہر باتوں کے بالکل خلاف کہی جائے۔ جیسے: "الجزءُ أكبرُ مِنَ الكُلِّ" (جز کل سے بڑا ہوتا ہے) یا "الأُسبوعُ خمسةُ أيامٍ" (ہفتہ پانچ دن کا ہے) یا ایسی خبریں جن میں حقائق کو ان کے بالکل برعکس بیان کیا گیا ہو، جیسے: "الأمانةُ رذِيلَةٌ، والخِيانَةُ فَضِيلَةٌ" (امانت بری عادت ہے اور خیانت اچھی عادت ہے)۔ لیکن یہ خبریں جن کا سچی یا جھوٹی ہونا بالکل یقینی ہے اگر ہم ان کو خبروں کی حیثیت سے دیکھیں، قائل یا پس منظر کو نہ دیکھیں تو دوسری خبروں کی طرح ان میں بھی سچ اور جھوٹ کا احتمال پیدا ہوجائے گا، مثلاً آسمان ہمارے اوپر ہے، اگر ایک کائناتی حقیقت کے طور پر ہمیں نہ معلوم ہوتا تو اس میں بھی دونوں باتوں کا احتمال موجود ہوتا؛ چونکہ خبر اپنے جملہ ہونے کے اعتبار سے ایسی چیز ہوتی ہے جس کی طرف جھوٹ یا سچ کی نسبت کی جاسکتی ہے۔ یا یہ کہہ لیجیے کہ بلاغت کے ماہرین نے خبر کے بارے میں یہ کہا کہ جس کے سچ اور جھوٹ کا احتمال ہو؛ لیکن اللہ تعالی کے قول کا سچ ہونا یقینی ہے اور مثلاً مسیلمہ کذاب کے قول کا جھوٹ ہونا یقینی ہے، صرف احتمال نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قائل کے اعتبار سے نہیں طے کیا جائے گا؛ بلکہ یہ دیکھا جائے کہ فی نفسہ اس جملہ کو سچ یا جھوٹ کے دائرہ میں لایا جاسکتا ہے یا نہیں۔

9.4.3 صدق خبر اور کذب خبر میں اختلاف

☆ **جمہور کا مذہب**

جمہور کے نزدیک صدق خبر سے مراد یہ ہے کہ وہ خبر واقعہ کے مطابق ہو اور کذب خبر سے مراد یہ ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق نہ ہو، جیسے الولدُ قائمٌ (لڑکا کھڑا ہے)، اگر واقع میں لڑکا کھڑا ہے تو یہ صدق خبر ہے اور اگر واقع میں ایسا نہیں ہے تو یہ کذب خبر ہے۔

☆ **نظام معتزلی کا مذہب**

نظّام معتزلی کے نزدیک خبر اگر مخبر کے اعتقاد کے مطابق ہے تو اگر چہ مخبر کا اعتقاد غلط ہی کیوں نہ ہو یہ صدق خبر ہے اور اگر خبر مخبر کے اعتقاد کے مطابق نہ ہو تو یہ کذب خبر ہے، جیسے اگر کسی نے کہا: "السماءُ تحتنا" اور وہ آسمان کے نیچے ہونے کا اعتقاد بھی رکھتا ہے تو یہ صدق خبر کہلائے گا، اگر چہ اس کا اعتقاد غلط اور واقع کے خلاف ہے؛ لیکن جمہور کے نزدیک یہ خبر کاذب ہے؛ کیونکہ واقعے کے خلاف ہے۔

☆ **جاحظ کا مذہب**

جاحظ کے نزدیک خبر اگر واقعہ کے مطابق ہو اور مخبر اس بات کا اعتقاد بھی رکھتا ہو کہ یہ خبر واقعے کے مطابق ہے تو یہ صدق خبر ہے اور اگر خبر واقعے کے مطابق نہ ہو اور ساتھ ہی مخبر کا اعتقاد بھی ہو کہ یہ خبر واقعے کے مطابق نہیں ہے تو یہ کذب خبر ہے۔

9.5 جملہ کے دوارکان

9.5.1 محکوم علیہ اور محکوم بہ

خبر کے ہر جملہ میں دو رکن ہوتے ہیں:

(1) محکوم علیہ اور اسے ''مسندالیہ'' بھی کہتے ہیں۔

(2) محکوم بہ، جسے ''مسند'' بھی کہتے ہیں۔

چنانچہ جب ہم کہتے ہیں: ''سافرَ صِدِّيقٌ'' (صدیق نے سفر کیا) اور ''الناجحُ مَسْرُوْرٌ'' (کامیاب ہونے والا خوش ہے) تو پہلے جملے میں جس کی طرف سفر کی نسبت کی گئی ہے وہ صدیق ہے اور صدیق کے بارے میں جو حکم لگایا گیا ہے یا اس کی طرف جس بات کی نسبت کی گئی ہے وہ سفر کرنے کا عمل ہے، تو صدیق ''محکوم علیہ'' یا ''مسندالیہ'' کہلائے گا اور سافر ''محکوم بہ یا مسند''۔ اسی طرح دوسرے جملہ یعنی ''الناجح مسرور'' کا حال ہے، کہ اس کے دو رکن ہیں: ''الناجح'' اور ''مسرور'' جس پر خوش ہونے کا حکم لگایا گیا ہے یا جس کی طرف خوش ہونے کی نسبت کی گئی ہے وہ ناجح (کامیاب) ہے اور ناجح کے لیے جو حکم لگایا گیا ہے یا اس کی طرف جس چیز کی نسبت کی گئی ہے وہ سرور یعنی خوش ہونے کا عمل ہے، اس طرح ناجح ''محکوم علیہ'' یا ''مسندالیہ'' ہے، اور مسرورٌ ''محکوم بہ'' یا ''مسند'' ہے۔

عام طور سے ''مسندالیہ'' فاعل یا نائب فاعل ہوتا ہے، یا ایسا مبتدا ہوتا ہے جس کی خبر ہو، یا ایسا کلمہ ہوتا ہے جس کی اصل مبتدا ہوتی ہے، جیسے کان اور اس کے اخوات کا اسم اور ''مسند'' فعل تام ہوتا ہے، یا ایسا مبتدا جو اپنے مرفوع پر اکتفا کرنے والا ہو، یا مبتدا کی خبر، یا ایسا کلمہ جس کی اصل مبتدا کی خبر ہو، جیسے کان اور اس کے اخوات کی خبر وغیرہ۔

9.5.2 جملہ اسمیہ

گذشتہ دونوں جملوں سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ خبر یا تو جملہ اسمیہ کی شکل میں ہوگی یا جملہ فعلیہ کی شکل میں، جملہ اسمیہ اپنی اصل وضع کے اعتبار سے کسی چیز کے لیے کسی دوسری چیز کے ثابت ہونے کا فائدہ دیتا ہے، تو مثلاً ''الناجح مسرور'' کا جملہ صرف یہ فائدہ دے رہا ہے کہ ناجح کو خوشی حاصل ہو رہی ہے، یا اس کے لیے خوشی ثابت ہو رہی ہے، اس میں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ یہ عارضی عمل ہے یا اس میں دوام ہے۔

لیکن جملہ اسمیہ میں کبھی کبھی ایسے قرائن اور دلالتیں ہوتی ہیں جو اس کو اس کی اصل وضع سے نکال کر اس کے اندر دوام اور استمرار کے معنی پیدا کر دیتی ہیں، خاص طور سے اس وقت جب کلام معرض مدح یا معرض ذم میں ہو، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: {إِنَّ الأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ} (الانفطار: 14-13) (اس میں کوئی شک نہیں کہ نیک لوگ ضرور نعمتوں میں ہوں گے اور اس میں بھی شک نہیں کہ بدکار لوگ ضرور دوزخ میں ہوں گے) تو پہلا جملہ تعریف کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور دوسرا جملہ مذمت کرنے کے لیے اور مدح و ذم دونوں قرائن ہیں؛ چنانچہ یہ دونوں جملے اپنی اصل وضع یعنی ثبوت کا معنی دینے کے ساتھ دوام اور استمرار کے معنی دے رہے ہیں، یعنی نیکوکار لوگ ابدی نعمتوں میں رہیں گے اور بدکار لوگ دائمی اور ابدی طور پر جہنم میں رہیں گے۔

اس سلسلے میں ایک ضروری بات اور یاد رکھیں کہ جملہ اسمیہ اپنی اصل وضع کے اعتبار سے ثبوت کے یا قرائن کی بنیاد پر دوام اور استمرار کے

معنی اسی وقت دیتا ہے جب اس کی خبر مفرد یا جملہ اسمیہ ہو، اگر اس کی خبر جملہ فعلیہ کی شکل میں ہو تو وہ تجدد کا فائدہ دیتا ہے، جیسے آپ کہیں: "الدولةُ تكرّم العاملين" (حکومت کام کرنے والوں کو اکرامیہ دیتی ہے) تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حکومت کا یہ اکرام ایک ضابطہ کے تحت بار بار ہوتا رہتا ہے اور اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

9.5.3 جملہ فعلیہ

جہاں تک جملہ فعلیہ کا تعلق ہے تو وہ اصلاً اس مقصد سے وضع کیا گیا ہے کہ کسی خاص متعین زمانہ میں کسی کام کے وجود میں آنے کی خبر دی جائے، مثلاً آپ کہتے ہیں: "عادَ الغريبُ إلى وطنِه" (اجنبی اپنے وطن لوٹ آیا) یا "يعُوْدُ الغريب إلى وطنه" (اجنبی اپنے وطن لوٹ آئے گا) یا "سَيَعُوْدُ الغريبُ إلى وطنه" (اجنبی عنقریب اپنے وطن لوٹ آئے گا) پہلے جملہ سے سننے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ کام زمانۂ ماضی میں ہوا ہے اور دوسرے جملہ سے یہ کہ ابھی حال میں یا زمانۂ مستقبل میں ہونے والا ہے اور تیسرے جملہ سے یہ کہ یہ کام مستقبل قریب میں ہونے والا ہے۔

کبھی قرائن کی بنیاد پر جملہ فعلیہ استمرار اور تجدد کو بتاتا ہے کہ یہ کام بار بار ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہتا ہے، جیسے متنبی سیف الدولہ کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

عَلى قَدْرِ أَهْلِ الْعَزْمِ تَأْتِيْ الْعَزَائِمُ　　　وتَأْتِيْ عَلَى قَدْرِ الكِرَامِ المكارِمُ

(عزم والوں کی ہمت کے بقدر بڑے بڑے کام وجود میں آتے ہیں اور اہل کرم کی سخاوت کے بقدر کارنامے وجود میں آتے ہیں)

یہاں تعریف کے سیاق میں اس بات کا ذکر یہ بتا رہا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ ہمت کے بقدر کام وجود میں آتے ہیں اور آتے رہیں گے۔

9.5.4 جملہ کی قیود

ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ خبر یہ جملہ کے دو رکن ہوتے ہیں: مسند الیہ اور مسند، ان کے علاوہ جو بھی مضاف الیہ اور موصول کے صلہ کے علاوہ ہوگا وہ جملہ کی قیود میں شمار کیا جائے گا، جملہ کی قیود یہ ہیں:

(1) ادوات شرط۔ (2) ادوات نفی۔ (3) مفاعیل خمسہ۔ (4) حال۔ (5) تمیز۔

(6) افعال ناسخہ۔ 7) چار توابع: صفت، عطف، تاکید اور بدل۔

اسی لیے علمائے معانی جملہ کی دو قسمیں کرتے ہیں: مرکزی جملہ، غیر مرکزی جملہ، پہلا جملہ مستقل ہوتا ہے جو کسی دوسرے جملہ کی قید کے لیے نہیں آتا اور دوسرا جملہ مستقل بالذات نہیں ہوتا؛ بلکہ کسی دوسرے جملہ کی قید کے لیے آتا ہے۔

9.6 خبر کے مقاصد

9.6.1 خبر کے بنیادی مقاصد

یعنی اصل میں خبر کے دو مقاصد ہوتے ہیں:

1۔ مخاطب کو اس حکم سے واقف کرانا جو جملہ یا عبارت میں پوشیدہ ہے اور اس حکم کو "فائدة الخبر" (خبر کا فائدہ) کہتے ہیں۔

2۔ مخاطب کو اس بات سے واقف کرانا کہ متکلم حکم سے واقف ہے اور اس کو "لازم الفائدة" (فائدہ کا لازمی جز) کہتے ہیں۔

پہلا مقصد جسے اہل بلاغت ''فائدة الخبر'' کہتے ہیں ان خبروں کی شکل میں حاصل ہوتا ہے جن کے ذریعہ متکلم یہ چاہتا ہے کہ اپنے مخاطب کو کسی ایسی بات یا باتوں سے واقف کرائے جو وہ نہیں جانتا، یا ان خبروں کی شکل میں یہ مقصد حاصل ہوتا ہے جو حقائق سے متعلق ہوتی ہیں اور یہ حقائق مختلف علوم وفنون کی کتابوں میں بیان کیے جاتے ہیں، یا وہ علمی اور سائنسی حقائق جو طلبہ کے سامنے بیان کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تاریخی واقعہ کے بطور ہم بیان کرتے ہیں، ''ابوالفداء'' کہتے ہیں:

''أسلَمَ معاويةُ بنُ أبي سفيان مع أَبِيهِ عامَ الفتح، واستَكْتَبَهُ النبيﷺ، واستَعْمَلَه عُمرُ على الشامِ أربعَ سنينَ مِنْ خِلافتِهِ، وأقرّه عثمانُ مدةَ خلافتِهِ نحْوَ اثنتَيْ عَشْرَةَ سنة، وتغلّب على الشام، فكان أميراً ومَلِكاً على الشامِ نحوَ أربعينَ سنةً، وكان حليماً حازماً، داهيةً عالماً بسياسة المُلْكِ، وكانَ حِلْمُهُ قاهِراً لغضبه، وجُوْدُه غالباً على مَنْعِه، يَصِلُ ولا يَقْطَعُ''

(كتاب المختصر في أخبار البشر لأبي الفداء، ج:2، ص 103)

(معاویہ بن سفیان اپنے والد کے ساتھ فتح مکہ کے سال اسلام لائے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو کاتب وحی بنایا، حضرت عمرؓ نے ان کو اپنی خلافت کے چار سال شام کا عامل (گورنر) بنائے رکھا، حضرت عثمانؓ نے ان کو اپنی پوری مدت خلافت میں یعنی تقریباً بارہ سال اسی عہدہ پر برقرار رکھا، انھوں نے شام پر غلبہ حاصل کیا اور تقریباً چالیس سال شام کے امیر اور بادشاہ بنے رہے، بردبار اور دانشمند تھے، صاحب بصیرت اور ملک کی سیاست کے واقف کار تھے، ان کی بردباری ان کے غضب پر اور سخاوت بخل پر غالب تھی، صلہ رحمی کرتے تھے، قطع رحمی نہیں کرتے تھے)۔

اس جیسی خبر کا مقصد مخاطب کو پہلے اموی خلیفہ کے سلسلہ میں کچھ تاریخی حقائق سے واقف کرانا ہے، یعنی اس خبر کا مقصد ''فائدة الخبر'' ہے۔

خبر کا دوسرا فائدہ جس کو اہل بلاغت ''لازم الفائدة'' کہتے ہیں، جس کا مطلب آپ جیسا کہ پہلے جان چکے ہیں کہ متکلم اس کے ذریعہ اپنے مخاطب کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ متکلم خبر کے حکم یعنی اس کے مضمون سے واقف ہے اور درج ذیل مثالوں سے اس کی مزید وضاحت ہو سکتی ہے:

1۔ ''إنک لتَكْظِمُ الغيظَ وتحلِم عندَ الغضبِ، وتعْفُو مع القدرة، وتصْفَحُ عَنِ الزَّلَّةِ، وتستجيبُ لِنِداءِ المستغيثِ بکَ'' (آپ غصہ پی جاتے ہیں، غصہ کے وقت بردباری سے کام لیتے ہیں، قدرت کے باوجود معاف کردیتے ہیں، لغزش سے درگذر کرتے ہیں اور مدد چاہنے والے کی دادرسی کرتے ہیں)۔ اس مثال میں جتنی باتیں متکلم نے کہی ہیں ان سے مخاطب کو کسی نئی بات سے واقف کرانا نہیں چاہتا، وہ ان سے پہلے سے واقف ہے، صرف وہ مخاطب کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں بھی ان باتوں سے واقف ہوں۔

2۔ ''إنک لَتَغْضِبُ سريعاً، ولا تُحْسِنُ إلَى الآخرين، ولا تملِکُ على نفسِک عنْدَ الغضبِ''۔

(تم بہت جلد ناراض ہوجاتے ہو، دوسروں کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتے اور غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو نہیں کرپاتے)۔

ان دونوں مثالوں سے معلوم ہوا کہ ان کا مقصد اس خبر سے واقفیت ہے جس کی نسبت مخاطب کی طرف کی جارہی ہے اور یہ بھی معلوم ہورہا ہے کہ اس طرح کے جملوں کا استعمال کسی کی تعریف کرنے یا اس کی خامیاں بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

9.6.2 خبر کے دیگر مقاصد

جیسا کہ آپ نے پڑھا کہ کبھی کسی خبر کا مقصد کوئی نئی بات بتانی ہوتی ہے جیسے یہ کہ ''اورنگ زیب ایک مغل بادشاہ تھا''، اور کبھی متکلم یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں اس سے واقف ہوں جیسے یہ کہنا کہ ''پہلے آپ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پڑھتے تھے''، اس کا مقصد مخاطب کو کسی نئی بات سے

واقف کرانا نہیں بلکہ قرینہ سے معلوم ہورہا ہے کہ متکلم مخاطب کو اپنی واقفیت کی خبر دے رہا ہے یعنی مجھے آپ کے بارے میں یہ معلومات ہیں۔

کلام اپنی اصل وضع کے اعتبار سے انہیں دو مقاصد کے لیے ہوتا ہے یا تو مخاطب کو کسی نئی بات سے واقف کرانا یا اسے اپنی واقفیت کی اطلاع دینا لیکن ان کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک نئے معنی بھی مراد ہوتے ہیں جو سیاق سے سمجھے جاتے ہیں، غالب کا شعر ہے:

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

حالی نے لکھا ہے: ''اس شعر میں از راہِ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ مے کدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھوٹ گیا تو سب جگہ پی لینی برابر ہے، مسجد وغیرہ کی تخصیص از راہِ شوخی کی گئی ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا مقتضائے بلاغت ہے''۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہورہا ہے کہ اس شعر کی خوب صورتی ان چیزوں کے دم سے ہے جو شعر میں بیان نہیں ہوئیں، لیکن اس سے ظاہر ہوتی ہیں یا جن کی طرف شعر میں مبہم اشارے ملتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد دیکھیں کہ خبران دو مقاصد کے علاوہ جن دیگر مقاصد کے لیے لائی جاتی ہے ان میں سے چند مقاصد یہ ہیں:

1۔ الاسترحام (خبر کے ذریعہ اشارۃ رحم کی درخواست) جیسے: ''اِرْتَکَبتُ جرماً کبیراً وأرید عفوک'' (میں نے بڑا جرم کیا ہے اور میں آپ کی معافی چاہتا ہوں) اور جیسے موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے: {رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ} (القصص: 24) (اے میرے پروردگار! آپ مجھے جو بھی نعمت بھیج دیں میں اس کا محتاج ہوں)۔ اب اس مثال میں جو خبر ہے، وہ ''فائدة الخبر'' یا ''لازم الفائدة'' کے لیے نہیں ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالی سے یہ فرمارہے ہیں کہ آپ میرے پاس جو بھی اچھی چیز اتاریں گے میں اس کا محتاج ہوں، یہ خبر مہربانی طلب کرنے کے لیے ہے نہ کہ اللہ تعالی کو خبر دینے کے لیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہے۔

2۔ إظهار الضَّعف (کمزوری اور عاجزی کا اظہار) جیسے: {رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا} (مریم: 4) (اے میرے رب! میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور میرے سر کے بال سفید ہوگئے ہیں)۔ اب یہاں پر بھی حضرت زکریا علیہ السلام اپنی کمزوری کا اظہار کررہے ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ کو خبر دے رہے ہیں۔

3۔ إظهار التَّحسُّر (افسوس کا اظہار) جیسے: ''بَکَیْتُکَ یَا صَدِیْقِي بِدَمْعِ عَیْنِيْ'' (اے میرے دوست! میں تم پر آنسوؤں سے رویا)۔ اور جیسے حضرت عمران کی بیوی کا قول ہے: {رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ} (آل عمران: 36) (اے میرے پروردگار! مجھے تو لڑکی پیدا ہوئی اور جو کچھ اس نے جنا تھا، اللہ اس سے خوب واقف تھے)۔ کیونکہ ان کی بیوی یہ چاہتی تھیں کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو؛ لیکن ان کی آرزو کے خلاف ہوا، اس لیے انھوں نے یہ جملہ بول کر افسوس کا اظہار کیا ہے نہ کہ ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کو خبر دینا تھا۔

4۔ إظهار الفخر (فخر ومباہات کا اظہار کرنا) جیسے ابو فراس حمدانی کا یہ شعر:

وَمَكَارِمِيْ عَدَدُ النُّجُوْمِ وَمَنْزِلِيْ　　مَأْوَى الْكِرَامِ وَمَنْزِلُ الْأَضْيَافِ

(میرے کارنامے ستاروں کی تعداد کے برابر ہیں اور میرا گھر شرفا کا ٹھکانہ اور مہمانوں کا گھر ہے)۔

5۔ الحث على السعي والجِدّ (کوشش اور محنت پر آمادہ کرنا) جیسے:

وليسَ أَخُوْ الْحَاجَاتِ مَنْ بَاتَ نَائِماً　　　ولكنْ أَخُوْهَا مَنْ يَبِيتُ عَلَى وَجَلِ

(ضرورت مندوہ نہیں جوساری رات سوتا رہے،ضرورت مندوہ ہے کہ جس کی راتیں خوف وہراس میں کٹتی ہوں)

6۔ **إظهار الفرح بمُقبِل والشماتة بمُدبِر:** کبھی خبر ذکر کی جاتی ہے اچھی چیز کے مل جانے اور بری چیز کے چلے جانے پر، جیسے:{جاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ}(الإسراء:81) حق سے مراد اسلام اور باطل سے مراد کفر وشرک ہے،حق کے آنے سے مسلمانوں کوخوشی ہوئی اور باطل کے چلے جانے سے بھی مسلمانوں کوخوشی حاصل ہوئی۔

7۔ **إظهار السرور:** کبھی خبر خوشی کے اظہار کے لیے آتی ہے،جیسے:"أَخَذتُ جائزةَ التَقَدُّمِ"،اس مثال میں متکلم کا مخاطب کوخبر دینا مقصود نہیں بلکہ اول آنے پر انعام کے حصول کو ظاہر کرنے کے وقت جوخوشی حاصل ہوتی ہے اسے ظاہر کرنا ہے،اس شخص کے سامنے جواس کو جانتا ہو؛لیکن جب مخاطب اس بات کو نہ جانتا ہوتو پھر اس کوخبر دینا ہے۔

8۔ **التوبيخ:** کبھی خبر زجر وتوبیخ کے لیے بھی آتی ہے، جیسے کسی گرنے والے شخص کو کہنا:"الشمسُ طالعةٌ"اس مثال سے متکلم کا یہ مقصد نہیں کہ مخاطب کو پتہ نہیں کہ سورج نکلا ہوا ہے کہ نہیں؛ بلکہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ سورج نکلا ہوا ہے اوردن صاف روشن ہے پھر بھی تو گر گیا ہے۔

9۔ **التسلية:** مخاطب کوتسلی دینے کے لیے کبھی خبر لائی جاتی ہے جیسے:وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِن قَبْلِكَ۔(اوراگر یہ آپ کو جھٹلائیں توآپ سے پہلے کے تمام رسول بھی جھٹلائیں جا چکے ہیں۔)

9.7 خبر کی اقسام

خبر کا مقصد خواہ "فائدة الخبر" ہو یا"لازم الفائدة" ہو یا کچھ اور، وہ صرف ایک ہی شکل میں نہیں آتی ، بلکہ صاحب خبر کو چاہیے کہ وہ خبر دیتے وقت اپنے مخاطب کی رعایت کرے اوراس طرح اپنی خبر کو دوسروں تک پہنچائے جو موقع ومحل کے بالکل مطابق ہو،اس میں کوئی کمی یا زیادتی نہ ہو۔

خبر کے حکم یعنی مضمون کے اعتبار سے مخاطب کی تین قسمیں ہیں:

1۔ ایک تو یہ کہ مخاطب بالکل خالی الذہن ہواوراس صورت میں خبر سادہ انداز سے بغیر کسی تاکید کے دے دی جاتی ہے،خبر کی اس قسم کو "ابتدائی" کہتے ہیں۔

2۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مخاطب کوخبر کے حکم یعنی مضمون کے بارے میں شک ہواوراس سلسلہ میں وہ یقین کی کیفیت چاہتا ہے،اس وقت متکلم کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ وہ تاکید کے ساتھ اپنی بات کہے تاکہ مخاطب کو قائل کر سکے اوریقین شک کی جگہ لے سکے،خبر کی اس قسم کو"طلبی" کہتے ہیں۔

3۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مخاطب خبر کے حکم یا مضمون کا صاف انکار کرنے والا ہو،اس حالت میں متکلم کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مخاطب کو قائل کرنے کی کوشش کرے اورجس درجہ کا انکار ہوگا اسی درجہ تاکید بڑھتی جائے گی اورخبر کی اس قسم کو"انکاری" کہتے ہیں۔

خبرابتدائی میں کسی تاکیدی لفظ کی ضرورت نہیں، جیسے: "المطرُ نازلٌ"(بارش ہورہی ہے)۔

خبر طلبی میں ایک تاکید کافی ہے، جیسے: "إنَّ المطرَ نازِلٌ" (بے شک بارش ہو رہی ہے)۔

خبر انکاری میں دو یا تین تاکیدی الفاظ ہوتے ہیں یا ان کا ہونا ضروری ہے، جیسے:"إن المطرَ لنازِلٌ" (بے شک ضرور بارش ہو رہی ہے) یا "واللهِ إنَّ المطرَ لنازلٌ" (بخدا بلاشبہ ضرور بارش ہو رہی ہے)۔

خبر انکاری میں تاکید کے لیے ایک لفظ کافی نہیں، ایک سے زیادہ الفاظ ہونا ضروری ہے، تاکہ مخاطب یقین کر سکے۔

خلاصہ یہ کہ معانی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر مخاطب کو اس کے مطابق بات کہی جائے، اگر مخاطب کو صرف واقف کرانا ہے تو سادہ انداز میں خبر دیتے ہیں، جیسے: "أخوك حضر" (آپ کے بھائی حاضر ہو گئے ہیں)۔

مخاطب اپنے بھائی کی آمد سے واقف نہیں تھا، بس اس کو خبر دے دی گئی، اس میں کسی تاکید کی ضرورت نہیں، ہاں اگر اس کو تردد ہے تو بہتر ہے کہ تاکید کے ساتھ کہا جائے؛ لیکن ضروری نہیں کہ اس خبر کو تاکید کے ساتھ پیش کیا جائے، یعنی اس طرح کہہ سکتے ہیں: "إن أخاك حضر" (بے شک تمہارا بھائی آ گیا)۔ جب وہ ماننے کو تیار نہ ہو کہ وہ آیا ہے تو مزید تاکید کی ضرورت ہوتی ہے اور اس حالت میں آپ اگر تاکید نہیں کرتے تو معانی کے اعتبار سے آپ کا کلام بلاغت کے معیار پر پورا نہیں اترتا؛ چنانچہ تاکید در تاکید ضروری ہے، یعنی پھر اس طرح کہنا ضروری ہے: "والله إن أخاك حضر" (خدا کی قسم تمہارا بھائی آ گیا) اور جس قدر اس کا انکار بڑھتا جائے گا اسی قدر آپ کی تاکید میں اضافہ ہونا ضروری ہے۔

آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ اگر خبر میں کوئی تاکید نہ ہو تو وہ "خبر ابتدائی" ہے اور اگر ایک تاکید ہے تو وہ "خبر طلبی" ہے اور اگر ایک سے زیادہ تاکید ہو تو وہ "خبر انکاری" ہے۔

9.8 خبر کی مؤکدات

وہ ادوات جن سے خبر کو مؤکد کیا جاتا ہے بہت سے ہیں، ان میں سے مشہور اور زیادہ استعمال ہونے والے درج ذیل ہیں:

إنّ، لام ابتدا، أمّا الشرطية، سین، قد، ضمیر فصل، قسم، نون تاکید ثقیلہ، نون تاکید خفیفہ، حروف زائدہ، حروف تنبیہ، ہم آسانی کے لیے ان کو تین حصوں میں تقسیم کر کے بیان کرتے ہیں:

9.8.1 إنّ، لام ابتدا، أمّا الشرطية، سین (س)

1-"إنّ": ہمزہ پر کسرہ اور نون پر تشدید، یہ اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے، اس کا کام یا فائدہ جملہ یا خبر کے مضمون کو مؤید کرنا ہے، مثلاً اگر کوئی کہے کہ:"إن الحياة كِفاح" (زندگی ایک جہاد ہے) یہ دو مرتبہ جملہ کو دوہرانے کے قائم مقام ہے؛ لیکن "إن الحياة جهاد" دو مرتبہ "الحياة كفاح" "الحياة كفاح" کہنے کے مقابلہ میں مختصر ہے اور مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ تاکید کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے، اس پر اگر آپ لام داخل کر دیں اور کہیں:"إن الحياة لكفاح" (بے شک زندگی انتھک محنت کا نام ہے) تو تاکید کے معنی اور بڑھ گئے اور گویا "الحياة كفاح" کو تین مرتبہ دوہرانے کے برابر ہو گیا، جملہ مختصر بھی ہو گیا اور تاکید در تاکید کا فائدہ بھی حاصل ہو گیا، اس لیے یہ جملہ بلاغت کے معیار پر بھی پورا اترا؛ چونکہ بلاغت کی بنیاد اختصار ہے۔

قرآن کریم میں اس کی متعدد مثالیں ہیں:{إن الله غفور رحيم}(البقرة: 173) (بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے) اور

{إن المبذرين كانوا إخوان الشياطين}(الإسراء: 27) (بے شک فضول کرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں) وغیرہ۔

احادیث رسول میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں: "إن الدين يسرٌ" (بے شک دین آسان ہے) اور "إن في الجسد لمضغة" (بے شک جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے) وغیرہ۔

اشعار میں دیکھیں تو اس کی ایک مثال یہ ہوسکتی ہے:

إنَّ التِي زعمتُ فؤادَک ملَّها   خُلِقتْ هواکَ کما خُلقتَ هوی لها

(اب تک جس محبوب کا یہ دعوی ہے کہ تمہارا دل اس سے اکتا گیا ہے ایسا نہیں ہے؛ بلکہ اسے تمہارے لیے محبوب بنایا گیا ہے، جیسے تم اس کے لیے محبوب بنائے گئے ہو، یعنی وہ تم سے محبت کرتی ہے جیسے تم اس سے محبت کرتے ہو)۔

2- "لام ابتدا": اس کو "لام مُزَحْلَقَه" بھی کہتے ہیں، اس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ مضمون کی تاکید کرتا ہے، مبتدا پر داخل ہوتا ہے، جیسے: "لأنتَ خيرمن عرفتُ" (جن لوگوں سے میں واقف ہوا ان میں تم سب سے بہتر ہو) اور خبر پر بھی داخل ہوتا ہے، جیسے: {إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ}(ابراهيم: 39) (بے شک میرا رب ضرور دعائیں سننے والا ہے)، یا جیسے: {وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ}(المؤمنون: 90) (بے شک وہ بالکل جھوٹے ہیں)، اسی طرح اس مضارع پر بھی جو إنّ کی خبر کے طور پر واقع ہو؛ چونکہ اس صورت میں اسم کے مشابہ ہوتا ہے، جیسے: {وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ}(النحل: 124) (بے شک تمہارا رب ضرور ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا) حرف پر بھی یہ لام تاکید داخل ہوتا ہے، جیسے: {وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ}(القلم: 4) (اور بے شک آپ بہت بلند اخلاق پر فائز ہیں)۔

3- "أمّا الشرطية": (ہمزہ پر فتحہ اور میم پر تشدید کے ساتھ)، یہ حرف تفصیل اور حرف تاکید مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے، جیسے: {إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا}(البقرة: 26) (یقینا اللہ کو اس سے عار نہیں کہ مچھر یا اس سے بھی گئی گذری چیز کی مثال دے، جو لوگ صاحب ایمان ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ مثال بالکل برمحل ہے اور جو لوگ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کا کیا مقصود ہے)، اسی طرح شاعر کا یہ قول:

ولم أر كالمعروف، أمّا مذاقُه   فحلو، وأمّا وجهُه فجميلُ

(میں نے معروف یعنی کار خیر کی طرح کوئی چیز نہیں دیکھی، جہاں تک اس کے ذائقہ کا تعلق ہے تو وہ شیریں ہوتا ہے، یعنی اس کے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں اور اس کا چہرہ خوب صورت ہوتا ہے، یعنی ظاہر میں بھی وہ ایک بہت اچھی چیز ہے)۔

کلام میں "أمّا" کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے مضمون کو مزید تقویت بخشتا ہے، مثلاً ایک جملہ جس کو آپ سادہ انداز سے اس طرح کہتے ہیں: "زيدٌ ذاهبٌ" (زید جانے والا ہے)، لیکن اسی کو جب تاکید کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ جا ہی رہا ہے اور جانا طے ہے تو اس طرح کہتے ہیں: "أمّا زيدٌ فذاهبٌ" (جہاں تک زید کا تعلق ہے تو وہ جانے ہی والا ہے)۔

4- "سین": یہ حرف مضارع کے ساتھ خاص ہے اور جب یہ مضارع پر آتا ہے تو اس کو مستقبل کے لیے خاص کر دیتا ہے اور سین جب کسی مضارع پر داخل ہوتا ہے تو یہ فائدہ دیتا ہے کہ یقینی طور پر وہ کام ضرور ہوگا، جیسے: {أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ}(التوبة: 71) (یہی وہ لوگ ہیں جن پر عنقریب اللہ تعالی ضرور رحم فرمائیں گے) اور {سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ}(المسد: 3) (وہ عنقریب شعلہ والی آگ میں داخل ہوگا)۔

9.8.2 قد، إنّما، ضمیر فصل، قسم، نون تاکید ثقیلہ وخفیفہ، نفی کی تکرار

1-"قد": "قد" تحقیق کے لیے آتا ہے، جیسے: {قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (1) الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (2)}(المؤمنون: 1-2) (بے شک وہ اہل ایمان کامیاب ہو گئے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں)"قد" یہاں اس جملہ میں اپنے مضمون کی تاکید کر رہا ہے، یعنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے اہل ایمان کی کامیابی لامحالہ ہوگی۔

2-"إنّما": "إنّما" بھی تاکید کے لیے آتا ہے، جیسے: "إنما البخل الشقاء، إنما السعادة الرضا"۔ (بلا شبہ بخل بدبختی اور سخاوت سعادت کی بات ہے)۔

3-"ضمیر فصل": یہ عام طور سے ضمیر مرفوع منفصل ہوتی ہے اور یہ ضمیر خبر اور صفت کے درمیان فرق کرنے کے لیے لائی جاتی ہے، جیسے: "محمد هو النبي" اس لیے کہ اگر یہاں اس جملہ میں ضمیر نہ لاتے اور "محمد النبي" کہتے تو "النبي" کو محمد کی صفت قرار دیا جاتا ہے، جب ہم ضمیر منفصل لے آئے تو یہ بات طے ہوگئی کہ "النبي" محمد کی خبر ہے، صفت نہیں اور ساتھ ہی تاکید کا فائدہ بھی حاصل ہو رہا ہے، اس لیے اس کو ادوات تاکید میں شمار کرتے ہیں۔

4-"قسم": قسم کے حروف یہ ہیں: باء، واؤ اور تاء۔ باء قسم میں اصل حرف ہے، جو اسم ظاہر اور ضمیر دونوں پر داخل ہوتا ہے، جیسے: أقسم بالله، وأقسم بک۔ واؤ صرف اسم ظاہر پر داخل ہوتا ہے، ضمیر پر نہیں، جیسے: أقسم والله، اور تاء صرف اللہ تعالیٰ کے نام پر داخل ہوتی ہے، جیسے: {وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُم} (الأنبياء: 57) (خدا کی قسم جب تم چلے جاؤ گے تو تمہارے بتوں کے ساتھ ضرور ایک تدبیر کروں گا)

وہ حروف جو مقسم علیہ (جواب قسم یعنی وہ چیز جس کے لیے قسم کھائی جا رہی ہے) پر داخل ہوتے ہیں چار ہیں: لام، إنّ، ما اور لا۔

اگر مقسم علیہ جسے جواب قسم بھی کہتے ہیں، مثبت ہو تو وہ حروف جو اس جواب قسم پر داخل ہوتے ہیں وہ ہیں: "لام" اور "إنَّ، جیسے: "والله لَموتٌ شريفٌ خيرٌ من حياةٍ ذليلةٍ" (بخدا شریفانہ موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے) اور جیسے: {وَالْعَصْرِ (1) إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ (2)} (العصر: 1-2)۔

اگر مقسم علیہ یا جواب قسم منفی ہو تو اس پر جو حروف داخل ہوتے ہیں وہ ہیں: "ما" اور "لام" جیسے: "والله ما العمل اليدوي مَهانةٌ" (بخدا محنت مزدوری کا کام ذلت کا کام نہیں) اور جیسے: "والله لا قصرتُ في القيام بواجبي" (بخدا میں نے اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی)۔

قسم ان تمام شکلوں میں تاکید کی ہی ایک صورت ہے، اس لیے اہل بلاغت نے اس کو خبر کے مؤکدات میں شمار کیا ہے۔

5-"نون تاکید ثقیلہ" اور "نون تاکید خفیفہ": یہ دونوں مضارع پر بعض شرطوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور امر پر بھی ان کو لانا درست ہے، قرآن کی اس آیت میں دونوں نون جمع ہو گئے ہیں: {وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِّنَ الصَّاغِرِينَ (32)}(یوسف: 32) (اور میں جس بات کا حکم دے رہی ہوں اگر اس نے وہ کام نہیں کیا تو یقینا قید میں ڈالا جائے گا اور بے عزت ہو کر رہے گا)۔

6-نفی کی تکرار: نفی کو مکرر استعمال کرنا جیسے: "لا، لا أرضى بالذل" (نہیں، میں ذلت پر راضی نہیں ہوں گا)۔

اور جیسا کہ شاعر نے کہا:

لا، لا أبوح بحب بثنة إنها أخذت عليّ مواثقاً وعهوداً

(نہیں، میں بثینہ کی محبت کا راز فاش نہیں کر سکتا، اس نے مجھ سے عہد و پیمان لے رکھا ہے)۔

9.8.3 حروف زائدہ و حروف تنبیہ

1-''حروف زائدہ'': حروف زائدہ یہ ہیں: إنْ (ہمزہ پر کسرہ اور نون کے جزم کے ساتھ) اور أنْ (ہمزہ پر فتحہ اور نون کے جزم کے ساتھ) ما، لا، باء اور مِن، اور ان حروف کو بڑھانے کے یہ معنی نہیں کہ یہ بے معنی ہیں، بلکہ ان کا اضافہ ایک طرح کی تاکید کے لیے ہی ہوتا ہے۔

''إنْ'': جیسے: ''ما إنْ قبلتُ ظُلْماً'' (میں نے بالکل بھی ظلم برداشت نہیں کیا) یعنی: ''ما قبلت ظُلْماً'' إن داخل کر کے اس سے پہلے والے حرف نفی ''ما'' کی تاکید میں اضافہ کر دیا گیا۔

''أنْ'': أن کو بھی کلام کی تاکید کے لیے بڑھایا جاتا ہے اور یہ ''لمّا'' پر داخل ہوتا ہے، جیسے: {فَلَمَّا أَن جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا} (یوسف:96) (پھر جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا اور اس نے (یوسف کا کرتا) ان کے چہرے پر ڈال دیا تو فوراً ہی آنکھوں کی روشنی واپس آ گئی) مراد ہے: ''فلمّا جاء البشير''۔

''ما'': کلام میں صرف تاکید کے لیے بڑھایا جاتا ہے، قرآن مجید میں بھی اس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے اور عربوں کے شعر و نثر میں بھی اس کا استعمال موجود ہے، قرآن مجید میں ہے: {وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا} (البقرة:282) (اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب بلائے جایا کریں)، اس میں ''ما'' زائدہ ہے، اسی طرح {فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ} (الأنفال:57) (تو اگر لڑائی میں آپ ان پر قابو پائیں) اس آیت میں بھی ''إن'' تو حرف شرط ہے جو اس جملہ کو آگے آنے والے جملہ سے مربوط کرتا ہے؛ لیکن ''ما'' زائدہ ہے اور اس کا مقصد اس ربط میں مزید تاکید پیدا کرنا ہے، ایسی جگہوں پر ''ما'' کے معنی ''نہیں''، یا ''جو''، یا ''جس'' وغیرہ میں سے کچھ نہیں ہوتے، بلکہ اس کا کوئی ترجمہ نہیں ہوتا۔

عام لوگوں کے کلام سے اس کی مثال یہ ہو سکتی ہے: ''غضبتَ من غير ما جرم'' (تم بغیر کسی جرم کے ناراض ہو گئے) یا مثلاً ''جئتَ لأمر مّا'' (تم کسی کام سے ہی آئے ہو)، ''ما'' کو ان مثالوں میں صرف اور صرف تاکید کے لیے لایا گیا ہے اور یہی جملہ کی بلاغت ہے۔

''لا'': لاء بھی کبھی کبھی کلام میں صرف تاکید کے لیے بڑھایا جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {لِّئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّن فَضْلِ اللَّهِ} (الحديد:29) (تاکہ اہل کتاب کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کو اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں)، اسی طرح دوسری مثال میں ہے: {لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ} (القيامة:1) (میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں)، ان دونوں مثالوں میں ''لا'' زائدہ ہے، کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

''باء'': باء بھی کلام میں تاکید کے لیے آتا ہے اور اکثر خبر میں ''ليس'' اور ''ما'' کے بعد آتا ہے، جب یہ نفی کے لیے ہوں اور اس وقت اس کا اضافہ مابعد کی نفی کو اور مؤکد کرنے کے لیے ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ} (البقرة:74)، اسی طرح {فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ} (الغاشية:21) تو ''باء'' کا اضافہ ان تمام مثالوں میں نفی کے معنی کو مؤکد کرنے کے لیے ہوا ہے۔

''مِن'': من بھی کبھی کبھی کلام میں صرف تاکید کے لیے داخل کیا جاتا ہے، جیسے: ''ما جاءنا من أحد'' (ہمارے پاس کوئی بھی نہیں آیا)، یہ جملہ ''ماجاءنا أحد'' بھی ہو سکتا تھا؛ لیکن تاکید اس درجہ کی نہیں ہوتی جس طرح ''من'' داخل کرنے سے ہوئی اور ''من'' زائدہ اسی وقت

ہوتا ہے جب کہ اس سے پہلے مندرجہ ذیل میں سے کسی اداۃ کا استعمال ہوا ہو:

(1) نفی: جیسے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: {وَمَا تَسۡقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعۡلَمُهَا}(الأنعام:59) (کوئی پتہ بھی نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے)، اسی طرح {مَّا تَرَىٰ فِي خَلۡقِ الرَّحۡمَٰنِ مِن تَفَٰوُتٍ}(الملک:3) (تم خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھو گے)۔

(2) نہی: جیسے: "**لا تهمل من غذاء عقلك**" (اپنی عقل کو غذا دینے میں غفلت مت کرو)۔

(3) "هل" کے ذریعہ استفہام: جیسے: {هَلۡ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ}(الملک:3) (کیا تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے؟)، یا "**هل من عالم بينكم؟**" (تمہارے درمیان کوئی عالم بھی ہے؟)۔

ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ "من" جو اپنے مابعد کے عموم کی تاکید کے لیے آتا ہے خواہ وہ نفی ہو یا نہی ہو یا استفہام، اس کے بعد آنے والا اسم یا تو فاعل ہوگا یا مفعول یا مبتدا، جیسا کہ آپ نے ان مثالوں میں دیکھا۔

2- حروف تنبیہہ: "ألا" اور "أما" بھی جو اصلا تنبیہ کرنے کے لیے یعنی مخاطب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے آتے ہیں ان سے بھی جملوں میں تاکید پیدا ہوتی ہے، جیسے: {أَلَآ إِنَّ أَوۡلِيَآءَ اللَّهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ}(یونس:62) (یاد رکھو! جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ انہیں کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے) اور "أما" اکثر قسم سے پہلے آتا ہے: جیسے: "**أما واللہ لقد نجح الكسول بعد تقصيره**" (سن لو کہ بخدا کاہل اپنی کوتاہی کے بعد بھی کامیاب ہو گیا)۔

9.9 مخاطب کی حالت کے برعکس گفتگو

آپ نے پڑھا ہے کہ خالی الذہن آدمی کے لیے خبر تاکید کے بغیر پیش کی جاتی ہے اور جس کو شک ہو اس کو تاکید کے ساتھ بتانا بہتر ہوتا ہے اور جو انکار کرنے والا ہو اس کو تاکید کے ساتھ بتانا ضروری ہے۔

لیکن کبھی خبر بظاہر ان تقاضوں کے برخلاف آتی ہے اور اس کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں جو متکلم کے ذہن میں ہوتی ہیں، اسی کو علم المعانی میں "**خروج الخبر عن مقتضى الظاهر**" کہتے ہیں، ان میں چند درج ذیل ہیں:

(الف): یہ کہ خالی الذہن شخص کو ایک سوال کرنے والے اور غیر یقینی کیفیت سے دوچار شخص کے درجہ میں رکھا جائے اور یہ اس وقت ہوگا جب کہ اس سے پہلے کوئی ایسی بات آئی ہو جو خبر کے حکم کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔

(ب) جو شخص انکاری نہ ہو اس کو بھی منکر کے درجہ میں اس لیے رکھا گیا ہو چونکہ اس پر انکار کی کچھ علامتیں ظاہر ہو رہی ہوں۔

(ج) منکر کو غیر منکر کے حکم میں رکھ دیا جائے، اگر اس کے سامنے ایسے دلائل وشواہد واضح طور پر موجود ہوں کہ اگر وہ ان میں غور کرے تو اپنے انکار سے باز آجائے۔

یعنی اب تک جو تفصیلات آپ نے پڑھیں ان سے معلوم ہوا کہ مخاطب کے حسب حال کلام کیا جائے تو یہ موقع ومحل کے مطابق ہوگا؛ لیکن کبھی کبھی بظاہر ان طریقوں کے خلاف کلام کیا جاتا ہے، تاہم یہ بھی حقیقت میں موقع ومحل کے مطابق ہی ہوتا ہے، مثلاً: مخاطب ابتدائی حالت میں ہے اور خبر سے بالکل ناآشنا ہے، تو طریقہ یہ ہے کہ بغیر تاکید کے کلام کیا جائے؛ لیکن اس کے سامنے کوئی ایسی بات آئی ہو جس سے اصل خبر کی طرف

اشارہ ہوتا ہو،تو وہ زبان سے تو اس خبر کے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہا ہے؛مگر اس کی حالت بتارہی ہے کہ وہ تردد میں ہے اور اسے معلوم کرنا چاہتا ہے،تو اس وقت بہتر ہے کہ زور دے کر کلام کیا جائے،جیسے قرآن پاک میں ہے:{وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ}(هود:37) (اور جولوگ ظالم ہیں ان کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا،کیونکہ وہ ضرور غرق کردیے جائیں گے)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کو پہلے کشتی بنانے کا حکم دیا گیا اور پھر ظالمین(کافرین)کے بارے میں شفاعت کرنے سے منع کردیا گیا،تو حضرت نوح زبان قال سے تو ان کے انجام کے بارے میں کچھ نہیں پوچھ رہے ہیں؛مگر انہیں تردد ہے اور زبان حال سے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اللہ پاک نے ان سب کو غرق کردینے کا فیصلہ کرلیا ہے؟لہٰذا تاکید کے ساتھ جواب دیا گیا:"إنهم مغرقون"۔

اسی طرح مخاطب کبھی زبان سے خبر کا انکار نہیں کرتا ہے،لہٰذا طریقہ یہ ہے کہ تاکید نہیں لانا چاہیے؛مگر اس کی حالت بتارہی ہے کہ گویا وہ انکار کررہا ہے،اس لیے تاکید لانا ضروری ہوا،جیسے:"بےشک والدین کی فرماں برداری ضروری ہے"۔اس شخص سے کہیں جو زبان سے تو اطاعت والدین کا انکار نہیں کرتا؛مگر عملاً ان کی نافرمانی کررہا ہے اور جیسے قرآن پاک میں ہے:{ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ}(المؤمنون:15)(پھر یقینا اس کے بعد تم مرجانے والے ہو)۔یعنی مخاطب زبان سے تو موت کا انکار نہیں کررہے ہیں مگر موت سے ان کی غفلت،انکار کی علامت ہے،اس لیے تاکید کے ساتھ کلام کیا گیا۔

کبھی مخاطب خبر کا انکار کرتا ہے،لہٰذا طریقہ یہ ہے کہ تاکید کے ساتھ کلام کیا جائے؛مگر چونکہ اس خبر سے متعلق ایسے دلائل موجود ہیں کہ اگر وہ ان میں غور کرے تو اپنے انکار سے پھر جائے اس لیے اس کے سامنے بغیر تاکید کے کلام کیا جائے گا،مثلاً:"علم حاصل کرنا مفید ہے"۔ایسے شخص سے کہیں جو اس کا انکار کرتا ہے،تو چونکہ اس کے ایسے کھلے دلائل موجود ہیں کہ وہ ان میں غور کرے تو اپنے انکار سے پھر جائے،اس لیے بغیر تاکید کے کہا گیا اور جیسے قرآن پاک میں ہے:{وإلهكم إله واحد}(البقرة:163)(اور تمہارا معبود واحد ہے)۔یعنی مخاطب معبود واحد کے منکر ہیں؛مگر چونکہ اس کے ایسے کھلے دلائل موجود ہیں کہ اگر ان میں غور کیا جائے تو انکار سے باز آیا جاسکتا ہے،اس لیے بغیر تاکید کے کلام کیا گیا۔

9.10 اکتسابی نتائج

ہر کلام یا تو خبر ہوگا یا انشاء۔خبر وہ کلام ہے جس کے کہنے والے کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہو کہ وہ اس کلام میں سچا ہے یا جھوٹا ہے،جیسے: **ذهب حامد** (حامد گیا) اور **خالد مسافر** (خالد سفر پر ہے)۔انشاء وہ کلام ہے جس کے کہنے والے کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہ ہو کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا،جیسے:"**سافِر یا خالد**"(اے خالد سفر کرو) یا "**اذهب یا حامد**"(اے حامد جاؤ)۔

خبر وہ ہے جس کے قائل کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہو کہ وہ اپنی خبر میں سچا ہے یا جھوٹا ہے،اگر کلام واقعہ کے مطابق ہو تو اس کے قائل کو سچا اور اگر واقعہ کے خلاف ہو تو اس کے قائل کو جھوٹا کہا جائے گا جیسے: **الأرض تدور حول الشمس** (زمین سورج کے اردگرد گردش کرتی ہے)،جمہور کے نزدیک صدق خبر سے مراد یہ ہے کہ وہ خبر واقعہ کے مطابق ہو اور کذب خبر سے مراد یہ ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق نہ ہو،جیسے **الولد قائم** (لڑکا کھڑا ہے)،اگر واقع میں لڑکا کھڑا ہے تو یہ صدق خبر ہے اور اگر واقع میں ایسا نہیں ہے تو یہ کذب خبر ہے۔نظّام اور جاحظ کی رائیں اس کے برعکس ہیں۔

خبر کے ہر جملہ میں دو رکن ہوتے ہیں:(1) محکوم علیہ،اور اسے"مسند الیہ" بھی کہتے ہیں۔(2) محکوم بہ،جسے"مسند" بھی کہتے

ہیں۔ چنانچہ جب ہم کہتے ہیں: "سافر صدیق" (صدیق نے سفر کیا) اور "الناجح مسرور" (کامیاب ہونے والا خوش ہے) تو پہلے جملہ میں جس کی طرف سفر کی نسبت کی گئی ہے وہ صدیق ہے اور صدیق کے بارے میں جو حکم لگایا گیا ہے یا اس کی طرف جس بات کی نسبت کی گئی ہے وہ سفر کرنے کا عمل ہے، تو صدیق ''محکوم علیہ'' یا ''مسند الیہ'' کہلائے گا، اور سافر ''محکوم بہ یا مسند'' ہوگا۔

بنیادی طور پر خبر کے دو مقاصد ہوتے ہیں:

1- مخاطب کو اس حکم سے واقف کرانا جو جملہ یا عبارت میں پوشیدہ ہے اور اس حکم کو "فائدة الخبر" (خبر کا فائدہ) کہتے ہیں۔

2- مخاطب کو اس بات سے واقف کرانا کہ متکلم حکم سے واقف ہے، اور اس کو "لازم الفائدة" (فائدہ کا لازمی جزو) کہتے ہیں۔

بسا اوقات خبر ان دو مقاصد کے علاوہ دیگر مقاصد کے لیے بھی لائی جاتی ہے اور یہ بات سیاق وسباق سے معلوم ہوتی ہے، ان میں سے چند مقاصد یہ ہیں: 1-الاسترحام (خبر کے ذریعہ اشارۃً رحم کی درخواست) 2-إظهار الضعف (کمزوری اور عاجزی کا اظہار) 3-إظهار التحسر (افسوس کا اظہار) 4-الفخر (فخر ومباہات) 5-الحث علی السعي و الجدّ (کوشش اور محنت پر آمادہ کرنا)۔

خبر کے حکم یعنی مضمون کے اعتبار سے مخاطب کی تین قسمیں ہیں: 1-ایک تو یہ کہ مخاطب بالکل خالی الذہن ہو اور اس صورت میں خبر سادہ انداز سے بغیر کسی تاکید کے دے دی جاتی ہے، خبر کی اس قسم کو ''ابتدائی'' کہتے ہیں۔ 2- دوسری صورت یہ ہے کہ مخاطب کو خبر کے حکم یعنی مضمون کے بارے میں شک ہو اور اس سلسلہ میں وہ یقین کی کیفیت چاہتا ہے، اس وقت متکلم کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ وہ تاکید کے ساتھ اپنی بات کہے تاکہ مخاطب کو قائل کر سکے اور یقین شک کی جگہ لے سکے، خبر کی اس قسم کو ''طلبی'' کہتے ہیں۔ 3- تیسری صورت یہ ہے کہ مخاطب خبر کے حکم یا مضمون کا صاف انکار کرنے والا ہو، اس حالت میں متکلم کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مخاطب کو قائل کرنے کی کوشش کرے اور جس درجہ کا انکار ہوگا اسی درجہ تاکید بڑھتی جائے گی اور خبر کی اس قسم کو ''انکاری'' کہتے ہیں۔

وہ ادوات جن سے خبر کو مؤکد کیا جاتا ہے بہت سے ہیں، ان میں سے مشہور اور زیادہ استعمال ہونے والے یہ ہیں: إن، لام ابتداء، أمّا الشرطية، سین، قد، إنّما، ضمیر فصل، قسم، نون تاکید ثقیلہ، نون تاکید خفیفہ، نفی کی تکرار، حروف زائدہ، حروف تنبیہ۔

کبھی خبر بظاہر ان تقاضوں کے برخلاف آتی ہے جن کا مقاصد کی بحث میں ذکر آیا اور اس کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں جو متکلم کے ذہن میں ہوتی ہیں، اسی کو علم المعانی میں "خروج الخبر عن مقتضى الظاهر" کہتے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: (الف) خالی الذہن شخص کو ایک سوال کرنے والے اور غیر یقینی کیفیت سے دوچار شخص کے درجہ میں رکھا جائے اور یہ اس وقت ہوگا جب کہ اس سے پہلے کوئی ایسی بات آئی ہو جو خبر کے حکم کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ (ب) جو شخص انکاری نہ ہو اس کو بھی منکر کے درجہ میں اس لیے رکھا گیا ہو چونکہ اس پر انکار کی کچھ علامتیں ظاہر ہو رہی ہوں۔ (ج) منکر کو غیر منکر کے حکم میں رکھ دیا جائے اگر اس کے سامنے ایسے دلائل وشواہد واضح طور پر موجود ہوں کہ اگر وہ ان میں غور کرے تو اپنے انکار سے باز آجائے۔

9.11 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ حسب ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے:

1- خبر کے بنیادی مقاصد کیا ہیں؟ جائزہ لیجیے۔

2- جملہ کے کتنے ارکان ہوتے ہیں؟ اوران میں جملہ اسمیہ اور فعلیہ کے اعتبار سے کیا قسمیں ہوتی ہیں؟ روشنی ڈالیے۔

3- "خروج الخبر عن مقتضی الظاهر" کا کیا مطلب ہے؟ بحث کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالات کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے:

1- خبر اور انشاء میں فرق بیان کرتے ہوئے خبر کی تعریف پیش کریں، نیز صدق خبر اور کذب خبر کے سلسلہ میں جو تفصیلات ہیں وہ ذکر کریں۔

2- مؤکدات خبر یا ادوات خبر پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیں۔

3- خبر کی اقسام پر مفصل گفتگو کریں۔

9.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1-	مختصر المعاني	سعدالدین تفتازانی
2-	علم المعاني	عبدالعزیز عتیق
3-	البلاغة فنونها وأفنانها (علم المعاني)	فضل حسن عباس
4-	دروس البلاغة	مشترکہ تصنیف: حفنی ناصف، محمد دیاب، سلطان محمد، مصطفیٰ طمّوم
5-	البلاغة الواضحة	مشترکہ تصنیف: علی الجارم ومصطفیٰ امین

اکائی 10 انشاءاوراس کی اقسام

اکائی کے اجزا

10.1 تمہید
10.2 مقصد
10.3 انشاء کی تعریف اوراس کی اقسام
10.3.1 انشاء کی تعریف
10.3.2 انشاء کی اقسام
10.4 امر
10.4.1 امر کی تعریف اوراس کا مخصوص معنی
10.4.2 امر کے صیغے
10.4.3 صیغہائے امر کے دیگر معانی
10.5 نہی
10.5.1 نہی کی تعریف اوراس کا مخصوص معنی
10.5.2 صیغۂ نہی کے دیگر معانی
10.6 استفہام
10.6.1 استفہام کی تعریف اوراس کا مخصوص معنی
10.6.2 استفہام کے مخصوص ادوات همزه اور هل
10.6.3 دیگر ادوات استفہام
10.6.4 استفہام کے دیگر معانی
10.7 تمنی
10.7.1 تمنی کی تعریف
10.7.2 تمنی کے الفاظ

10.7.3 ترجی کی تعریف اوراس کے الفاظ

10.8 ندا

10.8.1 ندا کی تعریف اوراس کا مخصوص معنی

10.8.2 ادوات نداا وران کے اصل مواقع استعمال

10.8.3 ادوات نداا وران کے ثانوی مواقع استعمال

10.8.4 ندا کے دیگر معانی

10.9 اکتسابی نتائج

10.10 امتحانی سوالات کے نمونے

10.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

10.1 تمہید

انشاء کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: انشائے طلبی اور انشائے غیر طلبی۔ انشائے غیر طلبی علم المعانی کی بحث سے خارج ہے، اس لیے اس کی قسموں کا ذکر اختصار سے کیا جائے گا اور انشائے طلبی چونکہ معانی کی اہم بحث ہے اس لیے اس کی تمام اقسام: امر، نہی، استفہام، تمنی اور ندا کو مختلف مثالوں سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا، جن میں قرآن وحدیث کی مثالیں بھی ہوں گی، ادبا کی تخلیقات سے بھی اور عام انسانی کلام سے بھی مثالیں پیش کی جائیں گی، آپ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد عربی شعر وادب میں بلاغت کے ان نمونوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے جن میں انشاء کا کوئی نہ کوئی پہلو آتا ہو اور اس کی نمائندگی کرتا ہو۔

10.2 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ علم المعانی میں زیر بحث آنے والی اصطلاح ''انشاء'' کو سمجھ سکیں گے، نیز یہ بھی جان سکیں گے کہ اس کی کتنی قسمیں ہیں، پھر ان قسموں کی کتنی اقسام ہیں اور ہر ایک کے استعمال کرنے کے مواقع کیا ہیں، جس کی وجہ سے کلام میں بلاغت پیدا ہوتی ہے اور قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ عربی شعر ونثر میں جہاں ان میں سے کسی کا استعمال ہوتا ہے اس سے کیا معنویت پیدا ہوتی ہے اور وہ کلام اپنے اندر کیا امتیاز رکھتا ہے۔

10.3 انشاء کی تعریف اور اس کی اقسام

10.3.1 انشاء کی تعریف

انشاء وہ کلام ہے جس کے کہنے والے کو سچا یا جھوٹا نہ کہا جا سکے۔ مثلاً: استاذ نے کہا: ''دل لگا کر پڑھو''، ''کھیل کود مت کرو''، تو اس کو سچا یا جھوٹا نہ کہا جائے گا؛ کیونکہ سچ یا جھوٹ کا احتمال وہاں ہوتا ہے، جہاں کسی چیز کے ہونے؛ یا نہ ہونے کی خبر دی جائے اور یہاں ایسا نہیں ہے؛ لہذا یہ انشاء ہے، یہ بات ذہنوں میں تازہ کر لیں کہ خبر کی طرح انشاء میں بھی جملہ کے دو ارکان ہوتے ہیں: محکوم علیہ یا مسند الیہ اور محکوم بہ یا مسند۔

10.3.2 انشاء کی اقسام

انشاء کی دو قسمیں ہیں: (1) غیر طلبی۔ (2) طلبی۔

(1) غیر طلبی: انشاء غیر طلبی وہ انشاء ہے جس میں طلب کے معنی نہ ہوں: یعنی اس کے ذریعہ کسی چیز کو طلب نہ کیا جائے، اس کے مشہور صیغے اس طرح ہیں:

1- ''تعجب'': جیسے تعجب سے کہا جائے: ''یہ پھول کتنا خوب صورت ہے!'' عربی میں اس کے دو صیغے ہوتے ہیں:

(الف) **ما أفعله** جیسے: ''ما أحسنَ عليًا'' (علی کتنا خوب صورت ہے!)۔

(ب) **أفعِل به** جیسے: ''أكرِمْ بخالدٍ'' (خالد کتنا سخی ہے!) یا قرآن مجید کی یہ مثال: {أَسۡمِعۡ بِهِمۡ وَأَبۡصِرۡ} (مریم: 38) (کیا ہی سننے والے اور کیا ہی دیکھنے والے ہوں گے)۔

2-''مدح وذم'': یعنی تعریف یا مذمت کی جائے، جیسے: ''آپ کے والد کیسے شریف انسان ہیں اور آپ کیسے نامعقول آدمی ہیں!''، عربی میں اس کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں: مثلاً مدح کے لیے: "نِعمَ" اور "حبّذا"، مذمت کے لیے: "ساء" اور "بئس" جیسے: "نعم الرجلُ حامدٌ" (حامد کیا ہی اچھا آدمی ہے!!) اور "بئست المرأة هند" (ہند کتنی بری عورت ہے!!)۔

3-''قسم'': یعنی قسم کھائی جائے، جیسے ''بخدا! میں تیرے پاس گیا تھا''، عربی میں اس کے لیے بہت سے حروف ہیں جن کا ذکر خبر کی بحث میں آپ پڑھ چکے ہیں مثلاً: واو: جیسے: "واللهِ أذهبُ" (بخدا میں جاؤں گا)۔

4-''رجاء'': یعنی امید کے ساتھ کوئی بات کہی جائے جیسے: ''شاید کہ وہ آجائے!'' یا جیسے قرآن میں ہے: {عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَاتِيَ بِالْفَتْحِ} (المائدہ: 52) (امید ہے کہ اللہ تعالی فتح سے نواز دیں)۔

5-عقود کے صیغے: یعنی جب کوئی عقد اور معاملہ کیا جائے اور اسے تعبیر کرنا ہو جیسے: ''میں نے بیچا تو نے خریدا''، فعل ماضی کے ذریعہ ہو جیسے: "بعت" (میں نے بیچا)، یا "وهبت" (میں نے ہدیہ کیا) یا امر کے ذریعہ جیسے: "امرأتي طالق" (میری بیوی کو طلاق)۔

ان مثالوں میں طلب کے معنی نہیں ہیں۔

انشاء کی یہ دوسری قسم (غیر طلبی) علم معانی کی بحث سے خارج ہے، اس لیے انہی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(2) طلبی: انشائے طلبی وہ انشاء ہے جس میں طلب کے معنی ہوں: یعنی اس کے ذریعہ کسی ایسی چیز کو طلب کیا جائے، جو اس وقت حاصل نہیں؛ جیسے ''انشاء کی تعریف بتاؤ''، ''بلاغت کس کو کہتے ہیں؟''، ''کاش میں بھی شاعر ہوتا!'' ان مثالوں میں طلب کے معنی موجود ہیں اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {وَأَقِيمُوْا الصَّلوٰةَ وَاٰتُوا الزَّكوٰةَ} (البقرة: 110) (اور نماز ادا کرتے رہو اور زکاۃ دیتے رہو)۔

انشائے طلبی کی پانچ صورتیں ہیں:

(1)''امر'': جیسے: "أحِبَّ لغيرِكَ ماتُحِبّ لنفسِكَ" (دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو)۔

(2)''نہی'': جیسے: "لا تَطْلُبْ مِنَ الجَزَاءِ إلا بِقَدْرِ ما صَنَعْتَ" (اجرت طلب نہ کرو مگر اسی کے بقدر جتنا تم نے کام کیا)۔

(3)''استفہام'': جیسے: "هلْ يَعْقِلُ الحيوانُ؟" (کیا جانور سمجھ سکتا ہے؟)۔

(4)''تمنی'': جیسے: "ليتَ الشبابَ يعودُ يَوْماً" (کاش جوانی لوٹ کر آتی)۔

(5)''ندا'': جیسے: "يا شُجاعُ أقْدِمْ" (اے بہادر! اقدام کر)۔

یہاں سے ان پانچوں کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔

10.4 امر

10.4.1 امر کی تعریف اور اس کا مخصوص معنی

ماہرین بلاغت امر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: "الأمرُ طلبُ الفعلِ على وجهِ الاستعلاء" (خود کو بلند سمجھ کر کسی سے کوئی کام طلب کرنا ''امر'' کہلاتا ہے) جیسے: ''ایک گلاس پانی لاؤ''، ''یہ کتاب احمد کو دے دو'' وغیرہ اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {يا يَحْيىٰ خُذِ الكتابَ بِقُوَّةٍ}

(مریم:12) اے یحییٰ ہماری کتاب کو زور سے پکڑے رہو۔

10.4.2 امر کے صیغے

فن بلاغت کے مطابق:

"للأمرِ أربعُ صِيَغٍ: فعلُ الأمرِ، والمضارعُ المقرونُ بلامِ الأمرِ، واسمُ فِعْلِ الأَمْرِ، والمَصْدَرُ النائبُ عن فِعلِ الأمرِ"

امر کے چار صیغے ہیں:

1- فعل امر: جیسے اللہ تعالی کا فرمان: {أَقِمِ الصَّلاَةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ} (الإسراء:78) (سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نمازیں پڑھا کیجیے) یا {وأقيموا الصلوة} (البقرة:43)۔

2- فعل مضارع مقرون بہ لام امر: جیسے قرآن میں ہے: { لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عليهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللهُ} (الطلاق: 7) (وسعت والے کو چاہیے کہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کرے اور جس کی کم آمدنی ہو تو اللہ نے جو دیا ہے اسی کے مطابق خرچ کرے)۔

3- اسم فعل امر: جیسے: {يَا أَيُّهَا الذِيْنَ آمَنُوْا عليكُمْ أَنْفُسَكُمْ لايَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ} (المائدة:105) (اے ایمان والو! تم پر تمہاری ذمہ داری ہے، اگر تم راہ راست پر ہو تو، تو جو گمراہ ہو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا)۔ اس مثال میں عليكُمْ أَنْفُسَكُمْ اسم فعل امر ہے۔

4- مصدر جو فعلِ امر کا قائم مقام ہو: جیسے: {وبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا} (الإسراء:23)۔ (والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو) اس مثال میں إِحْسَانًا مصدر میمی ہے جو فعل امر کے قائم مقام ہے۔

10.4.3 صیغہائے امر کے دیگر معانی

اہل بلاغت کا بیان ہے:

"قَدْ تَخْرُجُ صِيَغُ الأَمْرِ عَنْ مَعناهَا الأَصْلِيِّ إلى معانٍ أخرى تُسْتَفَادُ مِنْ سَيَاقِ الْكَلَامِ، كالإرْشَادِ، والدعاءِ، والالتماسِ، والتمنّيْ، والإباحةِ، والتخْيِيْرِ، والتَسْوِيَةِ، والتعجيزِ، والتهديدِ، والإهانةِ، والامتنانِ، والإكرامِ"۔

یعنی کبھی کبھی امر سے اس کے اصل معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ حسب حال دوسرے معانی مراد لیے جاتے ہیں۔ مثلاً: ارشاد، دعاء، التماس، تمنا، اباحت، تخییر، تسویہ، تعجیز، تہدید، اہانت، امتنان، اکرام، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

1-"الإرشاد": اس کا مطلب نصیحت اور خیر خواہی ہے؛ جیسے "امتحان کا وقت ہے، محنت سے پڑھو" اور جیسے قرآن میں ہے: {خُذِ الْعَفْوَ وأْمُرْ بِالْعُرْفِ وأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ} (الأعراف:199) (اے محمد ﷺ! عفو اختیار کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور جاہلوں سے کنارہ کرلیں۔ آیت کریمہ میں امر "ارشاد" کے لیے ہے۔

2-"الدعاء": جیسے قرآن میں ہے: {ربِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ} (طٰهٰ:25) (میرے پروردگار! میرا سینہ کھول دے اور میرا کام آسان کردے) یا کسی اور بڑے سے کوئی درخواست ہو تو وہ بھی اسی زمرہ میں آتی ہے جیسے: "أخا الجودِ أَعْطِ النَّاسَ مَا أَنْتَ مَالِكُ" (اے فیاض وداتا! اپنے مال میں سے لوگوں کو دیتے جاؤ)۔

3-"الالتماس": یعنی مرتبہ میں ہم پلہ آدمی سے بلاتواضع و بلندی کے نرمی کے ساتھ کسی چیز کا سوال کرنا یا یوں کہہ لیجیے: اپنے برابر والے سے کچھ طلب کرنا۔ جیسے: {وَقَالَ مُوسَى لأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ} (الأعراف: 142) (اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: میری عدم موجودگی میں میری قوم کا انتظام سنبھالنا، اصلاح کرتے رہنا)، یا جیسے: ''ذرا اپنی کتاب دیجیے''، یا امرؤالقیس کا یہ مشہور شعر:

قِفَا نَبْکِ مِنْ ذِکْرَى حَبِيبٍ ومنزلِ　　　بِسِقْطِ اللِّوَى بَيْنَ الدَّخُوْلِ فَحَوْمَلِ

(اے میرے دونوں ساتھیو! ذرا ٹھہرو کہ محبوب کی جدائی اور اس گھر کے چھوٹنے پر کچھ آنسو بہالیں جو سقط لوی میں دخول وحومل کے درمیان واقع ہے)۔

4-"التمني": غیر مقدور یا غیر ممکن الحصول یا غیر متوقع کسی چیز کو طلب کرنا۔ جیسے: {رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ} (المؤمنون: 107) (ہمارے پروردگار! ہمیں یہاں سے نکال دیجیے، اگر ہم پھر ایسا کریں گے تو ہم ضرور ظلم کرنے والے ہوں گے)۔

یا کسی ناممکن چیز کی آرزو اور خواہش کرنا، جیسے:

أَلا أيها الليلُ الطويلُ ألا انْجَلِيْ　　　بِصُبْحٍ وَمَا الإِصْبَاحُ مِنْکَ بِأَمْثَلِ

(کاش اے رات تری تاریکیاں چھٹ جاتیں کہ میں صبح کی سپیدی دیکھ پاتا، پھر پلٹ کر کہتا ہے کہ کیا فائدہ! میری صبح تجھ سے بہتر نہیں کہ پھر دن میں انہیں غموں کے ساتھ بسر کرنا ہے جو ساری رات تڑپاتے ہیں)۔ یا شاعر کا یہ شعر:

يا دارَ عبلةَ بالجواءِ تَکَلّمِيْ　　　وعِمِيْ صَبَاحاً دَارَ عَبْلَةَ واسْلِمِيْ

(اے مقام جواء میں عبلہ کے گھر! ذرا اپنے مکیں کا کچھ تو حال سناؤ یعنی کاش یہ گھر سنا پاتا، اے دیار عبلہ اللہ تمہیں ہمیشہ اچھا رکھے اور مصیبتوں سے محفوظ)۔

5-"الإباحة": یعنی اجازت دینا۔ جیسے: ''یہ میرا قلم لے لو'' اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {وَكُلُواْ وَاشْرَبُواْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ} (البقرة: 187) (اور کھاؤ اور پیو! یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے)۔ ظاہر ہے کہ آیت پاک میں کھانے اور پینے کا امر ''اباحت'' واجازت'' کے لیے ہے۔

6-"التخيير": اس کا مطلب دو چیزوں میں سے کسی ایک کا اختیار دینا ہے۔ جیسے شاعر کہتا ہے:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيَبْخَلْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَجُدْ　　　کَفَانِيْ نَدَاکُمْ عَنْ جَمِيْعِ المَطَالِبِ

(جس کا جی چاہے بخل کرے، جس کا جی چاہے فیاضی کرے، آپ کی سخاوت میری تمام ضروریات کے لیے کافی ہے)۔ یا جیسے کہا جائے کہ: ''یا معاف کر دو یا بدلہ لے لو''۔

7-"التسوية": یعنی دو چیزوں کے درمیان برابری اور مساوات ظاہر کرنا، جیسے قرآن پاک میں ہے: {وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ} (الملک: 13) (اور تم بات پوشیدہ کہو یا ظاہر، وہ دل کے بھیدوں تک سے واقف ہے)۔ آیت کریمہ میں {وأسرّوا قولكم أو اجهروا به} کا امر ''تسویہ'' کے لیے ہے، یعنی اللہ پاک کے نزدیک دونوں باتیں برابر ہیں، یا جیسے کہا جاتا ہے: ''اصبروا أو لا تصبروا'' (صبر کرو یا نہ کرو) یعنی دونوں برابر ہے۔

8-"التعجیز": اس سے مراد کسی کام کے کرنے سے مخاطب کی عاجزی اور درماندگی ظاہر کرنا ہے۔ جیسے ''اگر تم سچے ہو تو گواہ پیش کرو''، ''ہمت ہے تو میدان میں آؤ''، ''گواہ پیش کرو''، ''میدان میں آؤ'' یہ امر ''تعجیز'' کے لیے ہیں: یعنی تم ایسا نہیں کر سکتے اور جیسے قرآن میں ہے: {فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ} (البقرة:23) (تو اس طرح کی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ) یعنی تم نہیں لا سکتے۔ یہاں "فأتوا" کا امر ''تعجیز'' کے لیے ہے۔

9-"التهدید": مامور بہ (جس کو حکم دیا گیا ہو) سے ناراضگی کے موقع پر اس کو ڈرانا اور دھمکانا۔ جیسے: {وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ أَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَإِنَّ مَصِيْرَكُمْ إِلَى النَّارِ} (إبراهيم:30) (اور ان لوگوں نے اللہ کے لیے شریک ٹھہرا لیے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دیں، آپ کہہ دیجیے: کچھ دن عیش کر لو، پھر تمہارا آخری ٹھکانہ دوزخ ہی ہے) اس میں مخاطب کو ایک بات سے ڈرایا گیا اور دھمکی دی گئی، اسی طرح یہ مثال: ''جو تمہارے جی میں آئے سو کرو'' اور جیسے قرآن سے ہی دوسری مثال: {اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ إِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ} (حم السجدة:40) (جو چاہو سو کر لو، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کو دیکھ رہا ہے)۔ یہاں ''اعملوا'' کا امر ''تہدید'' کے لیے ہے۔

10-"الإهانة": اس سے مراد ذلت و حقارت کا اظہار ہے۔ جیسے ''غیرت ہے تو چلو بھر پانی میں ڈوب مر''، ''ڈوب مر'' کا امر ''توہین و تذلیل'' کے لیے ہے اور جیسے قرآن میں ہے: {كُوْنُوْا حجارةً أو حديدًا} (بني إسرائيل:50) (خواہ تم پتھر ہو جاؤ، یا لوہا)۔ آیت پاک میں ''کونوا'' کا امر ''اہانت'' کے لیے ہے۔

11-"الامتنان": یعنی احسان جتانا۔ جیسے قرآن میں ہے: {فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ} (النحل:114) (پس خدا نے جو تم کو رزق دیا ہے اس سے کھاؤ)۔ ظاہر ہے کہ یہاں ''فکلوا'' کا امر ''امتنان اور احسان جتانے'' کے لیے ہے۔

12-"الإکرام": یعنی تعظیم کرنا۔ جیسے: ''تفضل'' (جناب تشریف لائیں) اور جیسے قرآن میں ہے: {ادْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ آمِنِيْنَ} (الحجر:46) (سلامتی کے ساتھ بہ اطمینان جنت میں داخل ہو جاؤ)۔ یہاں ''ادخلوا'' کا امر ''اکرام'' کے لیے ہے۔

10.5 نہی

10.5.1 نہی کی تعریف اور اس کا مخصوص معنی

اہل بلاغت کہتے ہیں: ''النهي طلب الكف عن الفعل على وجه الاستعلاء''۔ (خود کو بڑا جان کر کسی کو کسی کام سے منع کرنا ''نہی'' کہلاتا ہے) جیسے ''بازار مت جا''، ''نجیب کے ساتھ مت رہ'' وغیرہ اور جیسے قرآن مجید میں ہے: {وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضاً} (الحجرات:12) (اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرو)۔

نہی کا صرف ایک ہی صیغہ ہوتا ہے اور وہ ہے لائے نہی کے ساتھ فعل مضارع: ''لا تفعل''۔

10.5.2 صیغۂ نہی کے دیگر معانی

امر کی طرح کبھی نہی سے بھی حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ بہ اعتبار قرینہ دوسرے معانی مراد لیے جاتے ہیں؛ مثلاً دعا، التماس، تمنا، ارشاد، توبیخ، تیئیس، تہدید، تحقیر۔ ماہرین بلاغت کہتے ہیں:

"قد تخرُجُ صيغةُ النهي عنْ معناهَا الْحَقِيْقِيِّ إلى معانٍ أخرَى تُسْتَفَادُ مِنَ السِّيَاقِ وقَرَائِنِ الأَحْوَالِ، كالدعاء، والالتماس، والتمني، والإرشاد، والتوبيخ، والتَّيئيس، والتهديد، والتحقير"۔

اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

1-"الدعاء": جیسے "خدایا! مجھے اپنی رحمت سے نہ نکال"۔ اور جیسے قرآن میں ہے: {رَبَّنَا لاَ تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا} (البقرة: 286) (اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کیجیے)۔

ظاہر ہے کہ آیت کریمہ میں "لاتؤاخذنا" کی نہی "دعا" کے لیے ہے۔

2-"الالتماس": دو ہم عمر یا ہم رتبہ افراد میں سے ایک کا دوسرے کو بغیر تعلّی کے نرمی کے ساتھ روکنا جیسے: {قَالَ يَا ابْنَ أُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي} (طه:94) (ہارون نے کہا: اے میرے ماں شریک بھائی! میری داڑھی اور سر کے بال نہ پکڑو)۔

3-"التمني": کسی ایسی چیز کو جس کا واقع ہونا یقینی ہو اس سے رکنے کا مطالبہ کرنا۔ جیسے: "أعَيْنَيَّ جُوْدَا ولا تجمُدا" (اے میری دونوں آنکھیں پوری سخاوت سے آنسو بہاؤ اور اسے رکنے نہ دو)۔

4-"الإرشاد": مخلصانہ رائے دینا اور ہمدردی کے ساتھ ایسی رہنمائی کرنا جس میں مخاطب کا فائدہ ہو۔ جیسے قرآن میں ہے: {يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَسْأَلُواْ عَنْ أَشْيَاءِ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ} (المائدة:110) (اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں مت سوال کرو کہ اگر ان کی حقیقتیں تم پر ظاہر کر دیے جائیں، تو تمھیں بری لگیں۔ آیت کریمہ میں "لاتسئلوا" کی نہی "نصیحت وارشاد" کے لیے ہے۔

5-"التوبيخ": اس کا مطلب مخاطب کو زجر وتوبیخ کرنا اور اظہار ناراضگی ہے۔ جیسے "مجھے مت کہو! جب تو خود نہیں کرتا"۔ جیسے قرآن میں ہے: {وَلاَ تَلْبِسُواْ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُواْ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ} (البقرة:42) (اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچی بات کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ)۔ ظاہر ہے کہ {ولا تلبسوا وتکتموا الحق} کی نہی "توبیخ" کے لیے ہے، یا شاعر کا یہ شعر:

لا تنهَ عنْ خُلُقٍ وتأتيَ مثْلَه عارٌ عليك إذا فعلتَ عظيم

(ایسی باتوں سے منع مت کرو جس کو تم خود کرتے ہو، اگر تم ایسا کرتے ہو تو تمہارے لیے بڑے شرم کی بات ہے)۔

6-"التيئيس": یعنی کسی چیز سے بالکل مایوس کر دینا۔ جیسے قرآن میں ہے: {لاَ تَعْتَذِرُواْ قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيْمَانِكُمْ} (التوبة:66) (بہانے نہ کرو، حقیقت یہ ہے کہ تم (بہ ظاہر) ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف چلے گئے)۔

7-"التهديد": جیسے: "لا تنته عن غيك" (اپنی گمراہی سے باز نہ آنا) یا "لا تمتثل أمري" (میری بات نہ ماننا) یا یہ کہ: 'میری بات مت سنو! مزہ چکھ لوگے' اور جیسے: "آوارہ گردی سے باز نہ آنا" وغیرہ۔ ان مثالوں میں تھدید (دھمکی) کا معنی پایا جاتا ہے۔

8-"التحقير": خوب ذلیل اور بے عزت کرنے کے لیے۔ جیسے: {قَالَ اخْسَؤُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ} (المؤمنون:108) (اللہ فرمائیں گے: اسی میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو)، یا یہ آیت: {فَلاَ يَقْرَبُواْ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـذَا} (التوبة:28) (اس لیے وہ اس سال کے بعد سے مسجد حرام کے قریب بھی نہ آئیں)، یا جیسے کہا جاتا ہے: "اس سے گفتگو نہ کریں! یہ گفتگو کے لائق نہیں" اور جیسے "اس نامعقول آدمی کے بارے میں کچھ مت پوچھ!"۔ ان مثالوں میں تحقیر (ذلت، بے عزتی) کا معنی پایا جاتا ہے۔

10.6 استفہام

10.6.1 استفہام کی تعریف اوراس کا مخصوص معنی

کسی چیز کے بارے میں جو پہلے سے معلوم نہ ہوسوال کرنا یا کسی ایسی چیز کے علم کو طلب کرنا جو پہلے سے حاصل نہ تھا ''استفہام'' کہلاتا ہے۔

10.6.2 استفہام کے مخصوص ادوات: همزه اور هل

استفہام کے لیے اردو میں یہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں'' کیا،کون، کب، کیسا، کہاں، کتنا، کدھر، کیوں''، عربی میں بھی ان کے لیے مخصوص الفاظ ہیں، لیکن ان میں'' همزه'' اور'' هل '' کے کچھ مخصوص مواقع استعمال ہیں اس لیے ان کو علیحدہ بیان کیا جاتا ہے، پھر دیگر ادوات استفہام کا ذکر آئے گا۔

استفہام کے بہت سے ادوات اورالفاظ ہیں، جن میں سے ''همزه''اور''هل''بھی ہیں۔

(1) ''همزه'' سے بنیادی طور پر دو میں سے کوئی ایک چیز طلب کی جاتی ہے:

(الف) ''تصور'': یعنی دو میں سے ایک کی تعیین کے بارے میں سوال، گویا سوال کرنے والا یہ جانتا ہے کہ یہ کام ہوا ہے لیکن اسے یہ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ کس نے کیا ہے، اسی کو کہتے ہیں کہ وہ ''نسبت'' کے بارے میں نہیں بلکہ ''فرد'' کے بارے میں سوال کررہا ہے۔ جیسے سوال کرنے والا کسی سے سوال کرے: ''أأنت المسافرُ أمْ أخوك؟'' (آپ مسافر ہیں یا آپ کے بھائی؟) تو اس سوال سے ظاہر ہے کہ سوال کرنے والے کو یہ معلوم ہے کہ سفر یقینی طور پر ہوا ہے اور اس کا تعلق مخاطب یا اس کے بھائی میں سے کسی ایک سے ہے، اس لیے وہ نسبت یعنی سفر کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں سوال نہیں کررہا ہے بلکہ وہ فرد کا سوال کررہا ہے کہ آپ دونوں میں سے کس نے سفر کیا ہے اور ایسی صورت میں متکلم اپنے مخاطب سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس ''مفرد'' کی تعیین کردے جس نے سفر کیا ہے، اسی لیے اس کا جواب تعیین کے ساتھ ہوتا ہے، مثلاً: ''أخي'' یعنی میرا بھائی مسافر ہے اور اس شکل میں وہ مفرد جس کے بارے میں سوال کیا جارہا ہے وہ ہمزہ کے فوراً بعد آتا ہے، خواہ وہ (1) مسندالیہ ہو جیسے مذکورہ مثال میں، یا (2) مسند ہو جیسے: ''أمشترٍ أنتَ أم بائع؟'' (کیا آپ خریدنے والے ہیں یا بیچنے والے؟) یا (3) مفعول بہ ہو جیسے: ''أشعيراً زرعت أم قمحاً؟'' (آپ نے جو کی کاشت کی یا گیہوں کی؟'' یا (4) حال ہو جیسے: ''أراكباً جئت أم ماشياً؟'' (آپ سوار ہو کر آئے یا پیدل؟) یا (5) ظرف ہو جیسے: ''أيومَ الجمعةِ يستريح العمّالُ أم يومَ الأحد؟'' (کیا مزدور جمعہ کو آرام کرتے ہیں یا اتوار کو؟)

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ اس مفرد کے مقابلہ میں بھی کسی کا ذکر آتا ہے جو لفظ ''أم'' کے بعد آتا ہے اور اسے ''معادل'' کہتے ہیں، کبھی یہ ''معادل''، یعنی مقابل میں آنے والا لفظ حذف بھی کردیا جاتا ہے۔ جیسے: ''أأنت المسافر؟'' یا ''أمشتر أنت؟' جو بالترتیب اصل میں ''أأنت المسافر أم أخوك؟'' یا ''أمشتر أنت أم بائع؟'' تھے۔

(ب) ''تصدیق'': دوسرا کام ہمزہ کا تصدیق کو طلب کرنا ہے یعنی نسبت کے بارے میں سوال کرنا کہ کام ہوا یا نہیں یا ایسا ہوتا ہے یا نہیں اور اس

شکل میں اس کے بالمقابل کوئی اور لفظ نہیں ذکر کیا جائے گا، جیسے: ''أیصدأ الذھب؟'' یا ''أیسیر الغمام؟'' یا ''أتتحرک الأرض؟''، پہلی مثال میں وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کیا سونا بھی لوہے کی طرح زنگ آلود ہوتا ہے؟ دوسری مثال میں یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ کیا بادل چلتا ہے، تیسری میں یہ کیا زمین گھومتی ہے؟ اس کا جواب اگر اثبات میں ہو تو جواب ''نعم'' سے ہوگا، اور اگر نفی میں ہو تو ''لا'' سے۔

(2) ''ھل'' سے صرف تصدیق کو طلب کیا جاتا اور اس کے ساتھ بالمقابل کوئی لفظ لانا منع ہے۔ جیسے: ''ھل یعقل الحیوان؟'' (کیا جانور سمجھتا ہے؟)، یا ''ھل یحسّ النبات؟'' (کیا نباتات میں احساس ہوتا ہے)، یا ''ھل ینمو الجماد؟'' (کیا جمادات میں نشوونما ہوتی ہے؟)۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ ہمزہ کے دو استعمال ہیں:

طلب تصور اور طلبِ تصدیق، یعنی کسی ایسی چیز (جزوِ جملہ یا نسبتِ جملہ) کے متعلق جانکاری طلب کرنا جس کی واقفیت نہ ہو؛ پھر اگر دو چیزوں کے درمیان وقوع یا عدم وقوع کے بارے میں سوال ہے تو اسے ''طلب تصدیق'' کہتے ہیں؛ لیکن اگر نسبت کا یقین ہو اور سوال کسی جزوِ جملہ یا فرد کے بارے میں ہو تو اسے ''طلبِ تصور'' کہتے ہیں، مفرد کا جاننا ''تصور'' اور نسبت کا جاننا ''تصدیق'' کہلاتا ہے۔

اسی طرح ''ھل'' میں بھی مفرد کو جاننا مقصود نہیں ہوتا بلکہ نسبت کو جاننے کے لیے سوال کیا جاتا ہے، اس لیے اس کا جواب اگر اثبات میں ہو تو جواب ''نعم'' سے ہوگا اور اگر نفی میں ہو تو ''لا'' سے دیا جائے گا، ''ھل'' کی مثالوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف طلب ''تصدیق'' کے لیے آتا ہے اور اس کے بعد جو لفظ استعمال ہو اس کے بالمقابل معادل یعنی کوئی اور لفظ ذکر نہیں کیا جاتا۔

''ھمزہ'' اور ''ھل'' کی جو تفصیلات بیان کی گئیں ان سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس موقع پر ان میں سے کس کا استعمال کریں گے۔

10.6.3 دیگر ادوات استفہام

استفہام کے لیے ''ھمزہ'' اور ''ھل'' کے علاوہ بھی کچھ ادوات یا الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

1- ''مَن'' (کون): اس کے ذریعہ عام طور پر ذوی العقول کی تعیین کے بارے میں سوال ہوتا ہے۔ جیسے: ''من اختطّ القاھرۃ؟'' (قاہرہ کا منصوبہ کس نے بنایا؟)، ''من بنی التاج؟'' (تاج محل کس نے بنایا؟)، ''من جاء'' (کون آیا؟)، ''من ذھب؟'' (کون گیا؟) وغیرہ۔

2- ''ما'' (کیا): اس کے ذریعہ عام طور پر غیر عاقل چیزوں کی تعیین کے بارے میں سوال ہوتا ہے، کبھی اس سے کسی اسم کی تشریح معلوم کی جاتی ہے۔ جیسے: ''ما الکری؟'' تو جواب دیا جائے گا، ''ھو نوم'' اور کبھی اس سے مسمی کی حقیقت معلوم کی جاتی ہے۔ جیسے: ''ما الإسراف؟'' تو جواب دیا جائے گا: ''ھو تجاوز الحد في النفقة وغیرھا'' (اخراجات وغیرہ میں حدود سے تجاوز کرنا)۔

3- ''متی'' (کب): اس کے ذریعہ زمانہ ماضی یا مستقبل کی تعیین کا سوال ہوتا ہے۔ جیسے: ''متی تولی الخلافةَ عمرُ؟'' (حضرت عمر خلیفہ کب بنے؟)، متی یعودُ المسافرون؟'' (مسافرین کب لوٹیں گے؟)، ''متی قلت لک؟' (میں نے تم سے کب کہا تھا؟) اور ''متی تسافر؟'' (تم سفر پر کب جاؤ گے؟)

4- ''أیّان'' (کب): زمانہ مستقبل کی تعیین کے لیے آتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {یَسۡـَٔلُ أَیَّانَ یَوۡمُ ٱلۡقِیَـٰمَةِ} (القیامة: 6) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہوگا؟ آیت کریمہ میں ''أیان'' بمعنی ''کب'' سے زمانہ مستقبل کی تعیین کا سوال ہے۔

5- ''کیف'' (کیسے): اس کا استعمال حالت وکیفیت کے سوال کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے: ''کیف أنت؟'' (آپ کیسے ہیں؟) اور جیسے

قرآن میں ہے: {فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ} (النساء: 41) (بھلا وہ دن کیسا ہوگا؟ جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے)۔ یہاں "کیف" بمعنی "کیسا" حالت وکیفیت کے لیے ہے: یعنی اس دن کیا حال ہوگا، اور کیسی کیفیت رہے گی؟۔

6-"أين" (کہاں): اس کے ذریعہ مکان اور جگہ معلوم کی جاتی ہے۔ جیسے: "أين دجلة والفرات؟" (دجلہ وفرات کہاں ہیں؟) یا "أين بيتك؟" (تیرا گھر کہاں ہے؟) اور "أين أنت ذاهب؟" (تجھے کہاں جانا ہے؟)

7-"أنّى" (کیسے): یہ کئی معنوں کے لیے آتا ہے، کبھی "کیف" کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے: "أنّى تسودُ العشيرةُ وأبناؤُها متخاذِلون" (خاندان کہاں سیادت کرسکتا ہے جب کہ اس کے افراد آپس میں ہی بے یارومددگار ہوں؟) اور کبھی "مِن أين" کے معنی میں جیسے: "أنّى لهمُ هذا المالُ وقد كانوا فقراء" (ان کے پاس کہاں سے یہ مال آیا جب کہ وہ تنگ دست تھے؟)، کبھی "متی" کے معنی میں جیسے: "أنّى يحضر الغائبون؟" (غائب لوگ کب حاضر ہوں گے؟)۔

8-"کم" (کتنا): اس کا استعمال تعداد معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے "كم يوماً لبثت في بيتك؟" (تم کتنے دن اپنے گھر رہے؟) اور "كم روبية أعطتني؟" (مجھے کتنے روپے دیے تھے؟) اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {كم لبثتم} (الكهف: 19) (کتنی مدت رہے؟)۔

9-"أيّ": اس کے ذریعہ مشترکہ طور پر کسی کام میں دوشرکت کرنے والے اشخاص یا اشیا میں سے ایک کی تعیین کی جاتی ہے، اس کے ذریعہ زمان، مکان، حال، عدد، عاقل غیر عاقل سب کے بارے میں سوال کیا جاسکتا ہے، جیسے: {أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا} (مریم: 73) (دونوں فریقوں میں سے کس کا مقام بہتر ہے؟)۔

واضح رہے کہ مذکورہ تمام ادوات سے صرف تصور کو طلب کیا جاتا ہے، اسی لیے اس کا جواب صرف اس چیز کی تعیین کے ذریعہ مکمل ہوجاتا ہے جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہو۔

10.6.4 استفہام کے دیگر معانی

کبھی کبھی استفہام سے اس کے اصل معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ قرینہ سے دوسرے معانی سمجھے جاتے ہیں، مثلاً: نفی، انکار، اقرار، توبیخ، تعظیم، تحقیر، استبطا، تعجب، تسویہ، تمنی، تشویق، اثبات، امر، نہی اور استہزا۔ تفصیل درج ذیل ہے:

1-"النفي": انداز استفہامی ہو لیکن اس سے مراد نفی ہو۔ جیسے: "هل الدهر إلا ساعةً ثم تنقضي" (زمانہ نہیں ہے مگر ایک ساعت جو گذر جاتی ہے)، اس میں "هل" "ليس" کے معنی میں ہے۔

2-"الإنكار": جیسے اردو میں کہا جاتا ہے: "اب کون ہے جو یہ کام کرسکے؟" یعنی "کوئی نہیں" اور جیسے قرآن میں ہے: {أَفِي اللهِ شَكٌّ} (إبراهيم: 10) (کیا اللہ کے بارے میں کچھ شک ہے؟) یعنی "کچھ شک نہیں"۔

3-"التقرير": کسی بات کو اور مؤکد کرنے اور اس کو مضبوط کرنے کے لیے مخاطب کو ابھارنا کہ اقرار کرو کہ ایسا ہی ہوا ہے جیسا میں کہہ رہا ہوں، جیسے قرآن مجید میں ہے: {أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ} (الشرح: 1) (اے محمد ﷺ! کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟) یعنی اقرار کرو کہ کھول دیا، یا {قَالُوا أَأَنتَ فَعَلْتَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ} (الأنبياء: 62) (اے ابراہیم! کیا تم نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی

ہے؟) یعنی اقرار کرو کہ تم نے ہی کیا ہے۔

4-"التوبیخ": جیسے: ''کیا تم نے احسان کا یہی بدلہ دیا؟'' اور جیسے قرآن میں ہے: { أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِیْ هُوَ أَدْنَی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ } (البقرة: 61) (بھلا تم عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو؟)۔

5-"التعظیم": جیسے: ''وہ کون عظیم ہستی ہے جس کی شفاعت محشر میں قبول کی جائے گی؟'' اور جیسے قرآن میں ہے: {مَن ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلاَّ بِإِذْنِه} (البقرة: 255) (ایسا کون ہے؟ جو سفارش کرے اس کے پاس، مگر اس کی اجازت سے) یعنی اس کی اجازت سے سفارش کرنے والا عظیم ہے۔

6-"التحقیر": جیسے متنبی کافور کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے: "من أیة الطرق یأتي مثلک الکرمُ" (آخر کس راستہ سے تم جیسے لوگوں کی طرف فیاضی آئے گی؟) یا جیسے: ''کیا یہی وہ ہے جس کی تم نے بڑی تعریف کی تھی؟'' اور جیسے ''تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟''۔

7-"الاستبطاء": کسی چیز کے بارے میں یہ چاہنا کہ وہ سست ہوجائے یا جلد آجائے یا ختم ہوجائے۔ جیسے متنبی کا یہ مصرعہ: "حتّامَ نحن نساري النجمَ في الظلم؟ (آخر کب تک ہم ستاروں کے ساتھ اندھیرے میں چلتے رہیں گے؟) اس میں "حتام" "إلی ما" یا "إلی أيّ وقت" کے معنی میں ہے، یعنی کاش یہ سلسلہ جلد ختم ہوتا، یا "حتی متی وأنت في لهو وفي لعب" (کب تک تم لہو ولعب میں لگے رہو گے؟)، یا جیسے قرآن کی یہ آیت: {وَزُلْزِلُواْ حَتَّی یَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِیْنَ آمَنُواْ مَعَهُ مَتَی نَصْرُ اللّهِ} (البقرة: 214) (اور وہ ہلا ڈالے گئے یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے بول اٹھے کہ کب اللہ کی مدد آئے گی؟)۔

8-"التعجب": جیسے ''کیا خدا کا رسول بھی کھاتا پیتا ہے؟'' اور جیسے ''کیا تم اتنا جلد مجھے بھول گئے؟'' اور جیسے قرآن میں ہے: {مَا لِهَذَا الرَّسُولِ یَأْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِیْ الْأَسْوَاقِ} (الفرقان: 7) (یہ کیسا پیغمبر ہے؟ کہ کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟) یعنی یہ بات بڑی تعجب خیز ہے۔

9-"التسویة": جب کسی چیز کے دونوں پہلو برابر ہوں جیسے: {سَوَاء عَلَیْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَکُن مِّنَ الْوَاعِظِیْن} (الشعراء: 136) (انھوں نے کہا: تم نصیحت کرو یا نہ کرو دونوں ہمارے لیے برابر ہے)۔

10-"التمني": کسی چیز کی تمنا کرنا جیسے: {فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاء فَیَشْفَعُواْ لَنَا} (الأعراف: 53) (کیا ہمارے کچھ سفارشی ہیں جو ہماری سفارش کریں؟)۔

11-"التشویق": یعنی شوق دلانا۔ جیسے: ''کیا میں تجھے کامیابی کا راز نہ بتادوں؟'' اور جیسے ''کون یہ انعام حاصل کرے گا؟ اور جیسے قرآن میں ہے: { هَلْ أَدُلُّکُمْ عَلَی تِجَارَةٍ تُنجِیْکُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِیْمٍ} (الصف: 10) (کیا میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں؟ جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے؟)۔ ظاہر ہے کہ یہاں "هل أدلکم" ''تشویق'' کے لیے ہے۔

12-"الإثبات": جیسے ''کیا احسان کا بدلہ احسان نہیں ہے؟'' یعنی ''ہے'' اور جیسے ''کیا والدین خدمت کے لائق نہیں ہیں؟'' یعنی ''ہیں'' اور جیسے قرآن میں ہے: {هل جزاءُ الإحسانِ إلا الإحسانُ} (الرحمن: 60) (کیا نیکی کا بدلہ نیکی نہیں ہے؟) یعنی ''ہے''۔

13-"الأمر": جیسے ''کیا تم نے میری بات سنی؟'' یعنی ''سنو!'' اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {فهل أنتم منتهون} (المائدة: 91) (تو کیا تم ان کاموں سے باز آؤ گے؟) یعنی ''باز آجاؤ!''۔

14-"النهي": جیسے ''کیا غیروں کے آگے جھکتے ہو؟'' یعنی ''مت جھکو!'' اور جیسے ''کیا تم بے ہودہ لڑکوں کے ساتھ رہتے ہو؟'' یعنی ''ان کے

ساتھ مت رہو!'' اور جیسے قرآن میں ہے: {أتخشَوْنَهُمْ فاللهُ أحقُّ أنْ تَخشَوهُ}(التوبة:13) (کیا تم ایسے لوگوں سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ ڈرنے کے لائق خدا ہے) یعنی ''ایسے لوگوں سے مت ڈرو!''۔

15-"الاستهزاء": جیسے ''کیا جناب! آپ ہی کی عقل نے یہ فیصلہ کیا؟'' اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {أَهَذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ آلِهَتَكُم} (الأنبياء:36) (کیا یہی شخص ہے؟ جو تمہارے معبودوں کا ذکر کیا کرتا ہے)۔آیت کریمہ میں "أهذا" (استفہام) ''استہزا اور تحقیر'' کے لیے ہے۔

16-"التنبيه": جیسے: ''تم کس راستہ پر چل پڑے ہو؟''، یا ''کہاں بھٹکتے پھرتے ہو؟'' اور جیسے قرآن میں ہے: {فأين تذهبون} (التكوير:26) (پھر تم کدھر جا رہے ہو؟)۔

10.7 تمنی

10.7.1 تمنی کی تعریف

تمنی کہتے ہیں کسی ایسی مرغوب اور پسندیدہ چیز کی تمنا کرنا، جس کے غیر ممکن یا مشکل ہونے کی وجہ سے حاصل ہونے کی امید نہ ہو۔

10.7.2 تمنی کے الفاظ

اس کے لیے عام طور پر عربی میں "لیت" کا استعمال ہوتا ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے: {يَا لَيتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوْتِيَ قارون} (القصص: 70) (جیسا مال ومتاع قارون کو ملا ہے، کاش! ایسا ہی ہمیں بھی ملے) ظاہر ہے کہ ایسا ہونا مشکل ہے، لہذا یہ تمنی ہے، اردو میں لفظ ''کاش'' کا استعمال ہوتا ہے۔جیسے ''کاش! جوانی لوٹ آتی'' اور ''کاش! وہ وعدہ وفا کرتا''۔

کبھی بلاغت کے کسی خاص مقصد سے ان الفاظ کے ذریعہ بھی تمنا کی جاتی ہے:

1-"هل" (کیا): جیسے قرآن میں ہے: {فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاء فَيَشْفَعُوا لَنَا}(الأعراف:53) (تو کیا آج ہمارے کوئی سفارشی ہیں؟ کہ ہماری سفارش کریں) یعنی ''کاش! کہ کوئی سفارشی ہوتا''۔

2-"لو" (اگر): جیسے قرآن میں ہے: {فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ}(الشعراء:102) (سو اگر ہمارے لیے دنیا میں ایک بار پھر جانا ہو، تم ہم ایمان والوں میں ہو جائیں) یعنی ''کاش! کہ ایسا ہو جائے''۔

3-"لعلّ" (شاید): جیسے: "لعلّي إلى من قد هويتُ أطير" (کاش میں جسے چاہتا ہوں اس تک اڑ کر پہنچ جاتا)۔گویا جس چیز کی آرزو ہو اس کو پا لینے کی امید یقینی درجہ میں کرتے ہوئے ان الفاظ کا استعمال کرنا جو ترجی کے لیے ہوتے ہیں، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میری آرزو پائے تکمیل کو یقینا پہنچ جائے گی۔

10.7.3 ترجی کی تعریف اور اس کے الفاظ

اگر کوئی پسندیدہ چیز ایسی ہو جس کے حاصل ہونے کی امید ہو اس کو طلب کرنا یا اس کا انتظار کرنا اصطلاح میں "ترجّي" کہلاتا ہے اور اس کے لیے عربی میں "لعلّ" یا "عسى" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے: {فعسى اللهُ أَنْ يَأْتِيَ بالفتحِ} (المائدة: 52) (سو ممکن ہے کہ اللہ جلد فتح ظاہر فرما دے) اور: {لَعَلَّ اللهَ يُحْدِثُ بعدَ ذلك أمراً}(الطلاق:1) (شاید خدا اس کے بعد

کوئی سبیل پیدا کردے)۔

کبھی بلاغت کے کسی مخصوص مقصد کے پیش نظر "لیت" کا استعمال بھی ترجی کے لیے ہوتا ہے اور وہ اس وقت جب انسان اپنی امید کو خیال خام سمجھنے لگے، اور یہ ظاہر کرے کہ امید تو تھی لیکن ابھی اس چیز کو پانا بہت مشکل نظر آتا ہے اور گویا یہ محض ایک تمنا ہے اور اسی لیے تمنی کی تعبیر "لیت" کا استعمال کرتا ہے۔ جیسے متنبی کا یہ شعر:

فيا ليتَ ما بينِيْ وبينَ أحبّتِي مِنَ البُعْدِ ما بيني وبين مصائبي

(امید ہے کہ میرے اور میرے محبوب دوستوں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہوگا جتنا میرے اور میرے مصائب کے درمیان ہوتا ہے) یعنی امید ہے کہ وہ اتنے قریب آجائیں گے اور مجھے اسی طرح داغ مفارقت نہیں دیں گے جیسے میری زندگی کے غم مجھے چھوڑ کر نہیں جاتے۔

10.8 نداء

10.8.1 نداء کی تعریف اور اس کا مخصوص معنی

کسی کو متوجہ کرنے یا کسی کو متوجہ ہونے کے طلب کو ندا کہتے ہیں، جس کے لیے کوئی ایسا حرف استعمال ہو جو "أدعو" کے قائم مقام ہو، یعنی اس کا مفہوم ہو: "میں تمہیں بلا رہا ہوں یا پکار رہا ہوں"۔

10.8.2 ادوات نداء اور ان کے اصل مواقع استعمال

نداء کے لیے عربی میں آٹھ ادوات یا الفاظ استعمال ہوتے ہیں: همزه، أي، يا، آ، آي، أيا، هيا، وا۔

ان کے مواقع استعمال حسب ذیل ہیں:

(1) "همزه" اور "أي" کا استعمال کسی قریب میں موجود شخص کو پکارنے کے لیے ہوتا ہے:

"همزه" کا استعمال جیسے: "أبني! إن أباک کارب يومه" (اے میرے بیٹے! تمہارے باپ کی موت کا وقت قریب ہے)۔

"أي" کا استعمال جیسے: "أي بني! أعِد علي ما سمعت مني" (اے میرے بیٹے! تم نے جو مجھ سے سنا اسے مجھے پھر سے سناؤ) یا "أي بنيّتي! إنکِ ترکتِ العُشَّ الذي فيه درجت والبيت الذي فيه نشأت" (اے میری بیٹی تم نے وہ آشیانہ چھوڑ دیا جس میں پلی بڑھی اور اس گھر کو الوداع کہہ دیا جس میں نشونما پائی)۔

(2) بقیہ چھ یعنی یا، آ، آي، أيا، هيا اور وا کا استعمال دور کے کسی شخص کو بلانے کے لیے ہوتا ہے:

"يا" کا استعمال جیسے: {إني لأظنک يا موسیٰ مسحورا} (الإسراء: 101) (اے موسیٰ میرا خیال ہے کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے)۔

"أيا" کا استعمال جیسے: "أيا رجالَ العقيدةِ! هَبُّوا ولا تخشَوْا في الله أحداً" (اے عقیدہ پر قائم رہنے والو! اٹھو اور اللہ کے معاملہ میں کسی کا خوف نہ کھاؤ) یا "أيا صاعد الجبل" (اے پہاڑ پر چڑھنے والے) یا "أيا عاملاً في الحقل! اعمل جيّدا" (اے کھیت میں کرنے والے، اچھی طرح کام کرو)۔

"هيّا" کا استعمال جیسے: "هيا محمد! أقبل" (اے محمد! فوراً آؤ)، اور "هيا زاهد! تعال بسرعة" (اے زاہد! جلد آؤ)۔

''وا'' کا استعمال، کسی مرحوم کی تعریف کے لیے جیسے:

وا محسنا ملک النفوس ببرّہ   وجری إلی الخیرات سباق الخطا

(ہائے وہ کیسے محسن تھے جنھوں نے اپنی نیکیوں سے دلوں پر حکومت کی اور نیکیوں کی طرف تیز قدموں سے بڑھتے رہے)۔

یا نوحہ کے لیے: ''واعیناہ، واأسفاہ''۔ (ہائے میری آنکھیں، ہائے افسوس)۔

''آ'' اور ''آي'' قلیل الاستعمال ہیں۔

10.8.3 ادوات ندا اور ان کے ثانوی مواقع استعمال

کبھی بعید کو قریب کے درجہ میں رکھا جاتا ہے تو ''ھمزہ'' اور ''أي'' سے پکارا جاتا ہے اور اشارہ ہوتا ہے کہ وہ دل سے قریب ہے اور ذہن و دماغ میں رچ بس گیا ہے اور اس کے برعکس کبھی قریب کو بعید کے درجہ میں رکھا جاتا ہے تو ''ھمزہ'' اور ''أي'' کو چھوڑ کر بقیہ حروف سے آواز دی جاتی ہے اور اس میں اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ یا تو اس کا مرتبہ بلند ہے، یا اس کا رتبہ گھٹ گیا ہے، یا اس کی غفلت اور بے توجہی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ منادیٰ دور ہے، مگر اس سے غایتِ تعلق کی بنا پر وہ ذہن میں حاضر اور دل سے قریب ہے، لہٰذا اس کے لیے قریب والے الفاظ ندا استعمال کر لیتے ہیں، جیسا کہ عاشق اپنے محبوب کے لیے استعمال کرتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ منادیٰ تو قریب ہے، مگر وہ اپنی رفعت شان کی وجہ سے بلند اور دور نظر آتا ہے، اسی طرح اپنے پست درجے کی وجہ سے الگ اور بعید نظر آتا ہے، ایسے ہی اپنی غفلت اور عدم توجہی کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ وہ یہاں نہیں، تو ایسی صورت میں اس کے لیے بعید والے الفاظ ندا استعمال کرتے ہیں۔

10.8.4 نداء کے دیگر معانی

کبھی نداء سے اس کے اصل معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ قرینہ سے دوسرے معانی سمجھے جاتے ہیں، ان میں مشہور معانی یہ ہیں: ''اشتعال و ترغیب، زجر، استغاثہ، اظہار حسرت و غم، اظہار حیرت و بے چینی''۔

1-اشتعال و ترغیب: اس کا مطلب کسی بات پر بھڑکانا اور مزید بیان کرنے کی رغبت دلانا ہے، جیسے: **''یا مظلوم تکلم''** (اے مظلوم! کہہ) اس سے کہا جائے، جو کسی کا ظلم و زیادتی بیان کر رہا ہو، تو چونکہ وہ پہلے سے متوجہ ہے، اس لیے یہاں ندا، اپنے اصل معنی کے لیے نہیں ہے، بلکہ مخاطب کے جذبات ابھار کر، اسے اپنی مظلومیت کو خوب ظاہر کرنے اور ظالم کی خوب شکایت کرنے پر آمادہ کرنا اور رغبت دلانا ہے۔

2-زجر: اس کا مطلب مخاطب کو ڈانٹنا اور ملامت کرنا ہے، جیسے: **''یا قلب! ویحک ماسمعت لناصح''** (اے دل! تیرا برا ہو، تو نے ناصح کی ایک نہ سنی) یا جیسے کہتے ہیں: ''اے دل! بڑھاپا آچکا، اور تو عشق و مستی میں ڈوبا ہے'' اس میں ندا متوجہ کرنے کے لیے نہیں ہے؛ بلکہ اسے اس طرز عمل پر جھڑکنے اور ملامت کرنے کے لیے ہے۔

3-استغاثہ: اس سے مراد فریاد کرنا اور مدد چاہنا ہے، جیسے ''یا اللہ!'' یعنی ''اے اللہ ہماری فریاد سن لے اور مدد کر'' اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُوْنَ} (الشعراء: 117) (پروردگار! میری قوم نے تو مجھے جھٹلا دیا)۔ یہاں ''رب'' اصل میں ''یا رب'' ہے اور یہ

ندا، استغاثہ کے لیے ہے۔

4-اظہارحسرت وغم: جیسے قرآن میں ہے:{يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَاباً}(النبأ:40) (اے کاش! میں مٹی ہوتا)۔ یہاں بھی "يا ليتني "کی ندا، اپنے اصل معنی میں نہیں؛ بلکہ اظہارحسرت وغم کے لیے ہے۔

5-اظہارحیرت: جیسے: "أيا قبرَ معن كيف واريتَ جُوْدَه" (اے معن کی قبر! آخر کیسے تم نے اس کی فیاضی پرمٹی ڈال کر اسے چھپایا؟) یہاں بھی قبر کوخطاب حیرت کے لیے ہے،کوئی اسے واقعی پکارنا مقصودنہیں چونکہ قبرمیں سننے کی صلاحیت نہیں۔

10.9 اکتسابی نتائج

انشاءوہ کلام ہےجس کے کہنے والےکوسچا یا جھوٹانہ کہا جاسکے،مثلاً: استاذ نے کہا: ''دل لگا کر پڑھو''، ''کھیل کودمت کرو'' تو اس کوسچا یا جھوٹا نہ کہا جائے گا؛ کیونکہ سچ یا جھوٹ کا احتمال وہاں ہوتا ہے، جہاں کسی چیز کے ہونے؛ یا نہ ہونے کی خبر دی جائے اور یہاں ایسا نہیں ہے؛لہذا یہ انشاء ہے، یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ خبر کی طرح انشاء میں بھی جملہ کے دوارکان ہوتے ہیں:محکوم علیہ یا مسند الیہ اورمحکوم بہ یا مسند۔

انشاء کی دوقسمیں ہیں: (۱) غیر طلبی (۲) طلبی۔

انشائے غیر طلبی وہ انشاء ہے جس میں طلب کے معنی نہ ہوں: یعنی اس کے ذریعہ کسی چیز کوطلب نہ کیا جائے۔ انشاء کی یہ قسم (غیر طلبی) علم معانی کی بحث سے خارج ہے اورانشائے طلبی وہ انشاء ہے جس میں طلب کے معنی ہوں: یعنی اس کے ذریعہ کسی ایسی چیز کوطلب کیا جائے، جو اس وقت حاصل نہیں؛ جیسے''انشاء کی تعریف بتاؤ''، ''بلاغت کس کو کہتے ہیں؟''۔

انشائے طلبی کی پانچ صورتیں ہیں: (1) امر جیسے: "أَحِبَّ لغيرِكَ ما تُحِب لنفسك" (2) نہی جیسے: "لا تطلب من الجزاء إلا بقدر ما صنعت" (3) استفہام جیسے: "هل يعقل الحيوان؟" (4) تمنی جیسے: "ليت الشباب يعود يوماً" (5) ندا جیسے: "يا شجاع أقدِم" (اے بہادر! اقدام کر)۔

خود کو بلند سمجھ کر کسی سے کوئی کام طلب کرنا''امر'' کہلاتا ہے، جیسے: ''ایک گلاس پانی لاؤ''، ''یہ کتاب احمد کو دے دو'' وغیرہ۔ امر کے چار صیغے ہیں: 1- فعل امر: جیسے اللہ تعالی کا فرمان: {أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ} (الإسراء:78) (سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نمازیں پڑھا کیجیے) 2- فعل مضارع مقرون بہ لام امر: جیسے قرآن میں ہے: {لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ، وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ} (الطلاق: 7) (وسعت والے کو چاہیے کہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کرے اور جس کی کم آمدنی ہوتو اللہ نے جو دیا ہے اسی کے مطابق خرچ کرے)۔ 3- اسم فعل امر: جیسے: {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ، لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ} (المائدة:105) (اے ایمان والو! تم پر تمہاری ذمہ داری ہے، اگر تم راہ راست پر ہوتو، تو جو گمراہ ہو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا)۔ 4- مصدر جو فعلِ امر کا قائم مقام ہو: جیسے: {وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا} (الإسراء: 23)، کبھی کبھی امر سے اس کے اصل معنی مرادنہیں ہوتے، بلکہ حسب حال دوسرے معانی مراد لیے جاتے ہیں۔ مثلاً: ارشاد، دعا، التماس، تمنا، اباحت، تخییر، تسویہ، تعجیز، تہدید، اہانت، امتنان، اکرام۔

خودکو بڑا جان کر کسی کوکسی کام سے منع کرنا ''نہی'' کہلاتا ہے، جیسے ''باز ارمت جا''، ''خالد کے ساتھ مت رہ'' وغیرہ اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {وَ لَا تَجَسَّسُوا وَ لَا يَغْتَبْ بَعْضُكُم بَعْضًا} (الحجرات:12) (اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے)، نہی کا صرف ایک ہی صیغہ ہوتا ہے اور وہ ہے لائے نہی کے ساتھ فعل مضارع: ''لا تفعل''، لیکن امر کی طرح کبھی نہی سے بھی حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ بہ اعتبار قرینہ دوسرے معانی مراد لیے جاتے ہیں؛ مثلاً دعا، التماس، تمنا، ارشاد، توبیخ، تیئیس، تہدید، تحقیر۔

کسی چیز کے بارے میں جو پہلے سے معلوم نہ ہو سوال کرنا یا کسی ایسی چیز کے علم کو طلب کرنا جو پہلے سے حاصل نہ تھا ''استفہام'' کہلاتا ہے، عربی میں استفہام کے لیے مخصوص الفاظ ہیں، لیکن ان میں ''همزه'' اور ''هل'' کے کچھ مخصوص مواقع استعمال ہیں اور بقیہ ادوات کے دوسرے استعمالات ہیں، کبھی کبھی استفہام سے اس کے اصل معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ قرینہ سے دوسرے معانی سمجھے جاتے ہیں، مثلاً: نفی، انکار، اقرار، توبیخ، تعظیم، تحقیر، استبطا، تعجب، تسویہ، تمنی، تشویق، اثبات، امر، نہی اور استہزا وغیرہ۔

تمنی کہتے ہیں کسی ایسی مرغوب اور پسندیدہ چیز کی تمنا کرنا، جس کے غیر ممکن یا مشکل ہونے کی وجہ سے حاصل ہونے کی امید نہ ہو اور اگر کوئی پسندیدہ چیز ایسی ہو جس کے حاصل ہونے کی امید ہو اس کو طلب کرنا یا اس کا انتظار کرنا اصطلاح میں ترجی کہلاتا ہے۔

ندا کہتے ہیں کسی کو متوجہ کرنے کو یا کسی کے متوجہ ہونے کے طلب کو اور اس کے لیے کوئی ایسا حرف استعمال ہوتا ہے جو ''أدعو'' کے قائم مقام) ہو، ندا کے لیے عربی میں آٹھ ادوات یا الفاظ استعمال ہوتے ہیں: همزه، أي، يا، آ، آي، أيا، هيا، وا، کبھی ندا سے اس کے اصل معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ قرینہ سے دوسرے معانی سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً: اشتعال وترغیب، زجر، استغاثہ، اظہار حسرت وغم اور اظہار حیرت وغیرہ۔

10.10 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ حسب ذیل سوالات کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے:

1- امر، نہی، استفہام، تمنی اور ندا کی تعریف مثالوں کے ساتھ لکھیں۔

2- انشائے غیر طلبی اور انشائے طلبی کی تعریف لکھیں اور ان کی اقسام پر مثالوں کے ساتھ ایک نوٹ لکھیں۔

3- ادوات ندا آٹھ ہیں، ان میں قریب کے لیے کون اور بعید کے لیے کون سے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور کیا کبھی وہ اپنے مخصوص مواقع استعمال کے برعکس بھی استعمال ہوتے ہیں؟ مفصل لکھیں۔

ب۔ درج ذیل سوالات کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے:

1- امر کے صیغے اپنے مشہور معانی کے علاوہ اور کیا معنی دیتے ہیں؟ مثالوں کے ساتھ لکھیں۔

2- نہی کے صیغے اپنے مشہور معانی کے علاوہ اور کیا معنی دیتے ہیں؟ مثالوں کے ساتھ لکھیں۔

3- استفہام کے ادوات اپنے مشہور معانی کے علاوہ اور کیا معنی دیتے ہیں؟ مثالوں کے ساتھ لکھیں۔

10.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1-	مختصر المعاني	سعد الدین تفتازانی
2-	علم المعاني	عبد العزیز عتیق
3-	البلاغة فنونها وأفنانها (علم المعاني)	فضل حسن عباس
4-	دروس البلاغة	مشترکہ تصنیف: حفنی ناصف، محمد دیاب، سلطان محمد، مصطفی طمّوم
5-	البلاغة الواضحة	مشترکہ تصنیف: علی الجارم و مصطفی امین

اکائی 11 قصر، وصل، فصل

اکائی کے اجزا

11.1 تمہید
11.2 مقصد
11.3 قصر
11.3.1 لغوی معنی
11.3.2 اصطلاحی معنی
11.4 قصر کی اقسام
11.4.1 قصر حقیقی
11.4.2 قصر اضافی
11.5 قصر حقیقی کی اقسام
11.5.1 قصر موصوف بر صفت حقیقی
11.5.2 قصر صفت بر موصوف حقیقی
11.6 قصر اضافی کی اقسام
11.6.1 قصر موصوف بر صفت اضافی
11.6.2 قصر صفت بر موصوف اضافی
11.7 مخاطب کے اعتبار سے قصر اضافی کی تقسیم
11.7.1 قصر افراد
11.7.2 قصر قلب
11.7.3 قصر تعیین
11.8 قصر کے طریقے
11.8.1 قصر کے مختلف طریقے

11.8.2 نفی واستثناء

11.8.3 إنما (بلاشبہ)

11.8.4 عطف

11.8.5 مؤخر کومقدم کرنا

11.9 وصل وفصل

11.10 عطف، معطوف اور معطوف علیہ

11.10.1 عطف، معطوف اور معطوف علیہ

11.10.2 معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مناسبتیں

11.11 مواقع وصل

11.11.1 علمائے بلاغت کا بیان

11.11.2 اول

11.11.3 دوم

11.11.4 سوم

11.12 مواقع فصل

11.12.1 علمائے بلاغت کا بیان

11.12.2 اول

11.12.3 دوم

11.12.4 سوم

11.12.5 چہارم

11.12.6 پنجم

11.13 اکتسابی نتائج

11.14 امتحانی سوالات کے نمونے

11.15 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

11.1 تمہید

اس اکائی میں یہ بتایا جائے گا کہ علم المعانی میں قصر کسے کہتے ہیں؟ مختلف اعتبارات سے اس کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟ قصر کے مختلف طریقے کیا ہیں اور ان سے کلام کے مفہوم میں کیا تغیر واقع ہوتا ہے؟ نیز وصل وفصل کسے کہتے ہیں اور ان کے کیا مواقع ہیں؟ آپ ان کا مطالعہ کریں گے اور اسی ضمن میں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مناسبتوں کا بھی مطالعہ کریں گے۔

11.2 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ قصر کے لغوی واصطلاحی معنی کیا ہیں؟ قصر کی کتنی قسمیں ہیں اور قصر کے طریقے کیا ہیں؟ مزید برآں آپ وصل کی تعریف، اس کے مواقع اور فصل کی تعریف اور اس کے مواقع سے واقفیت حاصل کر سکیں گے اور اس طرح علم المعانی میں قصر اور وصل وفصل کی اہمیت سے بھی روشناس ہوں گے اور ان سے واقفیت کی بنا پر کلام عرب کو سمجھنے اور اس کا ادبی معیار متعین کرنے میں سہولت ہوگی اور بلاغت کی رعایت کے ساتھ عربی زبان لکھنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے گی۔

11.3 قصر

11.3.1 لغوی معنی

قصر کا لغوی معنی روکنا اور منحصر کرنا ہے، کہتے ہیں: "قَصْرُ الشيئِ علَى الأَمْرِ" (کسی شئے کو کسی معاملہ پر منحصر کرنا) یا "قصر الشيء علی کذا" (کسی شئے کو کسی چیز تک محدود کرنا)، کہا جاتا ہے: "قصرَ غلّةَ أرض کذا علی عیاله" (اس نے فلاں زمین کا غلہ اپنے اہل وعیال کے لیے مخصوص کر دیا)، اسی طرح کہتے ہیں: "قصر الشيء علی نفسه" (اس نے کسی چیز کو اپنے تک محدود کرلیا، یا اپنے لیے خاص کرلیا یا اپنے لیے محدود کرلیا)۔

11.3.2 اصطلاحی معنی

اہل بلاغت کہتے ہیں: "القَصْرُ تَخْصِیْصُ أمْرٍ بآخر بطریقٍ مخصوصٍ، لکلّ قصرٍ طَرَفَانِ: مقصورٌ ومقصورٌ علیه۔" یعنی اصطلاح میں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ مخصوص طور پر خاص کر دینے کو "قصر" کہتے ہیں، لہذا جس کو خاص کیا جائے اسے "مقصور" اور جس کے ساتھ خاص کیا جائے اسے "مقصور علیہ" کہتے ہیں اور یہ دونوں قصر کے ارکان، اجزا یا اطراف کہلاتے ہیں۔

11.4 قصر کی اقسام

بلاغت کے ماہرین لکھتے ہیں: "ینقسم القصر باعتبار الحقیقة والواقع إلی قسمین"۔ یعنی قصر کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

(1) قصر حقیقی۔ (2) قصر اضافی۔

11.4.1 قصر حقیقی

قصر حقیقی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: "حقیقيٌ وهو أن یختَصَّ المقصورُ بالمقصورِ علیه بحسب الحقیقة والواقع بأن لا

يتعدّاه إلى غيره أصلاً" (ایک چیز یعنی مقصور کو دوسری چیز یعنی مقصور علیہ کے ساتھ حقیقت کے اعتبار سے واقعۃً اس طرح خاص کر دینا کہ معلوم ہو کہ پہلی چیز اسی دوسری چیز میں منحصر ہے، کسی اور میں نہیں پائی جاسکتی یا نہیں پائی جاتی) جیسے: "إنما الرازق الله" (بلا شبہ اللہ ہی رزق دینے والا ہے)، یہاں "رزق دینے" کو حقیقت کے اعتبار سے اللہ ہی کے ساتھ خاص کر دیا گیا، کہ اس کے سوا کوئی اور رزق دینے والا نہیں۔

اور جیسے قرآن مجید میں ہے: {لله مَا فِي السمٰوات وما في الأرض} (یونس: ۵۵) (جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے)۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کی ملکیت حقیقت کے اعتبار سے اللہ ہی کے لیے خاص کی گئی کہ حقیقت میں اس کے سوا کوئی اور مالک نہیں۔

یا جیسے یہ مثال: "لا یُروِي مصرَ من الأنهار إلا النيلُ" (مصر کو صرف دریائے نیل ہی سیراب کرتی ہے)۔

11.4.2 قصر اضافی

قصر اضافی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: "إضافي وهو ما كان الاختصاص فيه بحسب الإضافةِ إلى شيءٍ معينٍ" (ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ کسی متعین شئے کی نسبت سے خاص کرنا) یعنی بالکل حقیقت کے اعتبار سے ہر شئے کی نسبت سے خاص نہ کرنا؛ جیسے: "لا جواد إلا عليٌ" (سخی تو علی ہے) اس جملہ سے متکلم کی مراد یہ ہے کہ فلاں متعین شخص مثلاً ساجد کے مقابلہ میں علی زیادہ سخی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ سخاوت کسی اور فرد بشر میں ہے ہی نہیں، یا "إنما حسنٌ شجاعٌ" (بلا شبہ حسن تو بہادر ہے) مطلب یہ ہے کہ حسن بزدل نہیں، یہ مطلب نہیں کہ بہادری کے علاوہ اس میں کوئی اور صفت ہی نہیں، چنانچہ یہاں ایک خاص صفت یعنی بزدلی کے اعتبار سے قصر ہے، تمام صفات کے اعتبار سے قصر نہیں؛ کیونکہ وہ بہادر کے علاوہ نیک، بد، عالم، جاہل، امیر اور غریب وغیرہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور جیسے قرآن میں ہے: {إن أنتم إلا تكذبون} (یس: 15) (تم محض جھوٹ بولتے ہو)۔

یہاں ایک خاص صفت: یعنی 'صدق' کے اعتبار سے قصر کیا گیا ہے، تمام صفات کے اعتبار سے نہیں۔

معلومات کی جانچ

1- قصر کا لغوی معنیٰ کیا ہے؟

2- قصر کا اصطلاحی معنیٰ کیا ہے؟

3- مقصور اور مقصور علیہ کسے کہتے ہیں؟

1- قصر حقیقی کسے کہتے ہیں؟

2- قصر اضافی کسے کہتے ہیں؟

11.5 قصر حقیقی کی اقسام

علمائے بلاغت لکھتے ہیں: "ينقسم القصرُ باعتبار طرفَيْهِ إلى قسمين: یعنی قصر حقیقی و اضافی میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں:

(1) قصر موصوف بر صفت۔

(2) قصر صفت بر موصوف۔

11.5.1 قصر موصوف بر صفت حقیقی

اس کا مطلب یہ ہے کہ بہ اعتبار حقیقت موصوف اسی صفت کے ساتھ خاص ہے: یعنی حقیقت کے اعتبار سے اس میں اس صفت کے علاوہ کوئی اور صفت نہ پائی جائے، البتہ وہ صفت کسی اور موصوف میں پائی جا سکتی ہو، جیسے: "إنما بکر فاضلٌ" "بکر تو صرف فاضل ہی ہے"۔ یہاں "بکر" (موصوف) کا قصر "فاضل" (صفت) پر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فاضل ہونے کے علاوہ بہ اعتبار حقیقت اس میں کوئی اور صفت نہیں؛ یا یہ مثال کہ: "إنما الحیاۃ تعبٌ" (زندگی ایک تھکن کا نام ہے) مگر یہ مثال محض فرضی ہے، اس لیے کہ ایسی کوئی مثال ملنا مشکل ہے جس میں موصوف با عتبار حقیقت صرف ایک ہی صفت کے ساتھ متصف ہو، اس میں کوئی دوسری صفت نہ پائی جاتی ہو، لیکن جو صفت کسی چیز میں غالب ہو جاتی ہے اسے اسی طرح بیان کرتے ہیں۔

11.5.2 قصر صفت بر موصوف حقیقی

اس کا مطلب یہ ہے کہ با عتبار حقیقت وہ صفت اسی موصوف کے ساتھ خاص ہے، یعنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صفت اس موصوف کے علاوہ کسی اور موصوف میں نہ پائی جائے، البتہ اس موصوف میں اس صفت کے علاوہ اور صفات بھی پائی جا سکتی ہوں، جیسے: "لا یفوز إلا المُجِدُّ" (محنت کرنے والا ہی کامیاب ہوتا ہے) یا جیسے "عالم الغیب تو بس اللہ ہی ہے"۔ یہاں بہ اعتبار حقیقت "عالم الغیب" (صفت) کا قصر "اللہ" (موصوف) پر کیا گیا ہے: یعنی اللہ کے سوا کوئی اور "عالم الغیب" (صفت) کے ساتھ موصوف نہیں اور جیسے قرآن میں ہے: {إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلاَةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلاَّ اللهَ} (التوبۃ: 18) (خدا کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے اور زکات دیتے اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ہیں)۔

یہاں با عتبار حقیقت مساجد کے آباد کرنے کو مذکورہ اوصاف کے ساتھ متصف لوگوں پر منحصر کیا گیا ہے، یعنی خدا کی مساجد درحقیقت ایسے ہی اولوالعزم مسلمانوں کے دم سے آباد رہ سکتی ہیں، کسی اور سے نہیں۔

معلومات کی جانچ

1- قصر موصوف بر صفت حقیقی کسے کہتے ہیں؟

2- قصر صفت بر موصوف حقیقی کسے کہتے ہیں؟

11.6 قصر اضافی کی اقسام

11.6.1 قصر موصوف بر صفت اضافی

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی موصوف کو ایک صفت کے ساتھ، بہ نسبت دوسری صفت کے خاص کر دیا جائے، خواہ اس موصوف میں اس دوسری صفت کے علاوہ اور صفات پائی جائیں یا نہ پائی جائیں؛ جیسے "دانش تو بس حافظ ہے" یعنی مخاطب "دانش" کو حافظ اور قاری دونوں خیال کر رہا تھا، حالاں کہ وہ صرف حافظ ہی ہے، قاری نہیں؛ خواہ اس میں حافظ کے علاوہ اور بہت سی صفات پائی جاتی ہوں؛ مگر ان سے کوئی سروکار نہیں اور جیسے قرآن میں ہے: {وَمَا مُحَمَّدٌ إِلاَّ رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ} (آل عمران: 14:4) (اور محمد ﷺ تو صرف خدا کے پیغمبر ہیں، ان سے

پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گذرے ہیں)۔

یہاں محمد ﷺ کا قصر "رسالت" کی صفت پر کیا گیا ہے یعنی عام لوگوں کا یہ خیال کہ محمد ﷺ ہمیشہ رہنے والے ہیں، انہیں موت نہیں آسکتی، یا وہ قتل نہیں ہو سکتے، غلط ہے؛ کیونکہ وہ تو گذشتہ رسولوں کی طرح بس ایک رسول ہیں، ان سب سے افضل اور برتر ہیں لیکن خدا نہیں، اس لیے زندگی اور موت کے مراحل ان کے ساتھ بھی ہیں۔

11.6.1 قصر صفت بر موصوف اضافی

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی صفت کو ایک موصوف کے ساتھ، بہ نسبت دوسرے موصوف کے خاص کر دیا جائے؛ خواہ اس دوسرے موصوف کے علاوہ دیگر موصوف میں وہ صفت پائی جائے یا نہ پائی جائے؛ جیسے "محنتی تو احمد ہی ہے" یعنی مخاطب احمد کے علاوہ خالد کو بھی محنتی خیال کر رہا تھا، حالاں کہ خالد محنتی نہیں؛ تو خالد کی بہ نسبت احمد کے ساتھ محنتی ہونے کو خاص کر دیا گیا کہ وہی محنتی ہے، خالد نہیں؛ خواہ خالد کے علاوہ اور بہت سے بچے بھی محنتی ہوں؛ مگر ان سے کوئی بحث نہیں اور جیسے قرآن میں ہے: {إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاء} (فاطر: 28) (خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں)۔

یہاں اللہ سے ڈرنے کو جہلا کی بہ نسبت علما کے ساتھ خاص کیا گیا ہے: یعنی اللہ سے وہی ڈرتے ہیں جو علم و عقل والے ہیں، جہل و حماقت والے تو بے خوف ہوتے ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- قصر موصوف بر صفت اضافی کسے کہتے ہیں؟

2- قصر صفت بر موصوف اضافی کسے کہتے ہیں؟

11.7 مخاطب کی حالت کے اعتبار سے قصر اضافی کی اقسام

مخاطب کی حالت کے اعتبار سے قصر اضافی کی تین قسمیں ہیں:

(1) قصر افراد۔ (2) قصر قلب۔ (3) قصر تعیین۔

11.7.1 قصر افراد

قصر افراد: یعنی مخاطب دو صفت کو ایک موصوف میں، یا دو موصوف کو ایک صفت میں شریک سمجھتا ہے، اور متکلم اس کی شرکت کے خیال کو رد کرتے ہوئے کسی ایک کے ساتھ قصر کر دے، جیسے: تثلیث کے عقیدہ رکھنے والوں پر رد کرتے ہوئے کہا جائے گا: "اللہ ایک ہے"، اور جیسے قرآن میں ہے: {إِنَّمَا اللهُ إِلَهٌ وَاحِدٌ} (النساء: 171) (خدا ہی معبود واحد ہے)۔

11.7.2 قصر قلب

قصر قلب: یعنی مخاطب، متکلم کے خیال کے برعکس گمان رکھتا ہو، تو متکلم اس کے گمان کو بدل کر قصر کر دے: جیسے "حسن ہی سفر پر گیا" اس مخاطب سے کہا جائے گا، جو یہ سمجھ رہا تھا کہ ندیم سفر پر گیا ہے، حسن نہیں۔ اسی طرح قرآن میں ہے: {قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلا بَشَرٌ مِثْلُنَا} (یس: 15) (وہ

بولے کہ تم اور کچھ نہیں، مگر ہماری ہی طرح کے آدمی ہو)۔

اہل انطاکیہ کی طرف جو رسول بھیجے گئے تھے، انھوں نے اپنی رسالت کا دعویٰ کیا، تو جھٹلانے والوں نے ان کے دعوی کی تردید کرتے ہوئے صفت رسالت کا انکار کیا اور انہیں اپنی طرح بشر ہونے کے ساتھ خاص کر دیا، تو چونکہ یہاں صفت رسالت کو بدل کر صفت بشریت ثابت کرتے ہوئے قصر کیا گیا ہے، اس لیے یہ قصر قلب ہے۔

11.7.3 قصر تعیین

قصر تعیین: یعنی مخاطب کو حکم میں تردد اور شک ہو، تو متکلم اسے متعین کر کے قصر کر دے؛ جیسے ''بلا شبہ زمین حرکت کرتی ہے'' اس شخص سے کہا جائے گا جسے تردد اور شک ہو کہ زمین حرکت کرتی ہے یا ٹھہری ہے؟۔ اسی طرح قرآن میں ہے: {قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ}(البقرة:11) (کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں)۔

یعنی منافقین کہتے تھے کہ ہمارے بارے میں شک مت کرو، ہم فسادی نہیں؛ بلکہ مصلح ہیں اور ہمارا مصلح ہونا بالکل ظاہر ہے، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں؛ تو چونکہ یہاں شک وتردد کو دور کرتے ہوئے مصلح ہونے کی تعیین کر کے قصر کیا گیا ہے، لہذا یہ قصر تعیین ہے۔

معلومات کی جانچ

1- قصر افراد کسے کہتے ہیں؟

2- قصر قلب کسے کہتے ہیں؟

3 - قصر تعیین کسے کہتے ہیں؟

11.7 قصر کے طریقے

11.7.1 قصر کے مختلف طریقے

علمائے بلاغت لکھتے ہیں: ''طرق القصرِ المشهورةُ أربع:

(أ) النفي والاستثناءُ، وهنا يكون المقصورُ عليه ما بعدَ أداة الاستثناء۔

(ب) إنما، ويكون المقصورُ عليه مؤخراً وُجوباً۔

(ج) العطف بلا، أو بل أو لكن، فإن كان العطف بلا كان المقصور عليه مقابِلاً لما بعدها، وإن كان العطف ببَل أو لكن كان المقصورُ عليه ما بعدَهما۔

(د) تقديم ما حقه التأخير۔ وهنا يكون المقصور عليه هو المقدَّم۔

یعنی زبان وادب میں قصر کے بہت سے طریقے رائج ہیں، جن میں چار طریقوں کا استعمال بیشتر ہوتا ہے۔

11.7.2 نفی اور استثناء

یعنی پہلے عام نفی کی جائے پھر کسی کا استثناء کر لیا جائے اور یہاں مقصور علیہ اداۃ استثناء کے بعد آئے گا، جیسے ''لا إله إلا الله'' (نہیں ہے

کوئی معبود سوائے اللہ کے) اور جیسے قرآن کریم میں ہے: {وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلا بِأَمْرِ رَبِّکَ} (مریم: 64) (اور ہم تمہارے پروردگار کے حکم کے سوا اتر نہیں سکتے)۔

11.7.3 لفظ "إنما"

لفظ "إنما" (بلا شبہ) کا لانا، یہاں مقصور علیہ کو مؤخر کرنا یعنی بعد میں لانا واجب ہے، جیسے: "إنما علیکَ البلاغ" (تمہارا کام صرف پہنچانا ہے) یا جیسے: "بلا شبہ میری سعی کامیاب ہوئی" اور جیسے قرآن میں ہے: {قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ} (الکھف: 109) (کہہ دو کہ بلا شبہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں، البتہ میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود وہی ایک معبود ہے)۔

11.7.4 عطف

"لا" یا "بل" یا "لکن" کے ذریعہ عطف کرنا، جیسے: "الأرض متحركة لا ثابتة" (زمین متحرک ہے ثابت نہیں) اور "ما الأرض ثابتة بل متحركة" (زمین ثابت نہیں بلکہ متحرک ہے) یا "ما الأرضُ ثابتة لكن متحركة" (زمین ثابت نہیں لیکن متحرک ہے) یا جیسے "زید کھڑا نہیں ہے، بلکہ بیٹھا ہے"۔

11.7.5 مؤخر کو مقدم کرنا

مؤخر کو مقدم کرنا، یہاں مقصور علیہ مقدم کیا جائے گا، جیسے: "إیاک نعبد" (تجھی کو ہم پوجتے ہیں) یہاں "تجھی" مفعول ہے، جسے مؤخر ہونا چاہئے تھا؛ مگر قصر کے لیے مقدم کر دیا گیا، یا جیسے: "على الرجالِ العاملينَ نُثني" (کام کرنے والوں کو ہم سراہتے ہیں) اور جیسے قرآن مجید میں ہے: {وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ} (البقرة: 57) (اور وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے، بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے)۔

آیت کریمہ میں "ولکن" کے ذریعہ عطف کرنے سے، نیز "أنفسهم" مفعول کو "یظلمون" فعل پر مقدم کرنے سے حصر کا مفہوم نکلتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1- قصر کے کتنے طریقے ہیں؟

2- نفی واستثناء کسے کہتے ہیں؟

3- عطف اور مؤخر کو مقدم کرنے کا کیا مطلب ہے؟

11.9 وصل وفصل

علمائے بلاغت لکھتے ہیں: "الوصلُ عطفُ جملةٍ على أخرى بالواو، والفصلُ تركُ هذا العطفِ، ولكلٍّ مِنَ الفصلِ والوصلِ مواضعُ خاصّةٌ" یعنی ایک مفرد، یا ایک جملہ کو دوسرے مفرد، یا دوسرے جملہ پر عطف کرنے کو "وصل" اور عطف نہ کرنے کو "فصل" کہتے ہیں اور فصل ووصل میں سے ہر ایک کا استعمال مخصوص مواقع پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے: {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللهَ وَكُونُواْ مَعَ الصَّادِقِينَ} (التوبة: 119) (اے اہل ایمان! خدا سے ڈرتے

رہو اور راست بازوں کے ساتھ رہو)۔

آیت کریمہ میں "وَكُونُواْ مَعَ الصَّادِقِينَ" کا عطف ما قبل پر کیا گیا ہے، لہذا یہ "وصل" ہے۔ اور جیسے {وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ} (حم السجدة:34) (اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی، تو سخت کلامی کا ایسے طریقہ سے جواب دو جو بہت اچھا ہو)۔ یہاں "ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَن" کا عطف ما قبل پر نہیں کیا گیا، لہذا یہ "فصل" ہے۔

معلومات کی جانچ

1- وصل کا مفہوم لکھیے؟

2- فصل کا مفہوم لکھیے؟

11.10 عطف، معطوف اور معطوف علیہ

11.10.1 عطف، مطوف اور معطوف علیہ

عطف کے لیے مختلف کلمات کا استعمال ہوتا ہے، کبھی "و" (اور) کے ذریعہ عطف کیا جاتا ہے؛ اور کبھی "ثم" (پھر) اور "ف" (پس یا تو) وغیرہ الفاظ کے ذریعہ؛ مگر چونکہ "و" صرف شرکت کا معنی دینے کے واسطے آتا ہے، اس لیے اس کے ذریعہ عطف کرنے کی شرط یہ ہے کہ معطوف ومعطوف علیہ کے درمیان کسی طرح کا تعلق اور مناسبت ضرور ہو اور چونکہ "ثم" اور "ف" وغیرہ کے الفاظ شرکت کے علاوہ ترتیب، تعقیب، تاخیر وغیرہ دوسرے معنی کا بھی فائدہ دیتے ہیں، اس لیے ان کے ذریعہ عطف کے لیے معطوف ومعطوف علیہ کے درمیان کسی مناسبت کی شرط ضروری نہیں۔

معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مناسبت مسند الیہ اور مسند کے اعتبار سے ہوتی ہے، کہ دونوں جملوں کا مسند الیہ اسی طرح مسند باہم مناسب ہوں، جیسے "احمد لکھتا ہے اور پڑھتا ہے" ظاہر ہے کہ دونوں جملوں کا مسند الیہ ایک ہے اور مسند (لکھتا ہے، پڑھتا ہے) اگرچہ مختلف ہے؛ مگر لکھنے اور پڑھنے میں مناسبت واضح ہے۔ اور جیسے قرآن میں ہے: {وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ} (آل عمران:15) (اور اللہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے(۔

یہاں "يميت" کا عطف "يحيي" پر کیا گیا ہے، کیونکہ دونوں کا مسند الیہ "اللہ" ہے اور "يُحْيِي وَيُمِيت" (مسند) اگرچہ مختلف ہیں؛ مگر زندہ کرنے اور مارنے میں مناسبت ظاہر ہے۔

اور اگر مسند الیہ ایک نہ ہو تب بھی مناسبت ضروری ہے، مثلاً: دونوں میں قرابت داری، یا دوستی، یا دشمنی کا تعلق ہو، جیسے "حسن شاعر ہے اور انس مضمون نگار ہے" یہاں دونوں جملوں کا مسند الیہ (حسن، انس) الگ الگ ہے، مگر دونوں میں قرابت داری، یا دوستی کے تعلق سے مناسبت واضح ہے، اسی طرح مسند (شاعر، مضمون نگار) بھی الگ ہے، مگر دونوں میں مناسبت ظاہر ہے۔ اور جیسے قرآن میں ہے: {إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ، وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ} (الانفطار:14-13) (بے شک نیکوکار نعمتوں میں ہوں گے اور بدکار دوزخ میں)۔

آیت کریمہ میں دونوں جملوں کا مسند الیہ اسی طرح مسند الگ الگ ہے، مگر "أبرار" اور "فجار" اسی طرح "نعيم" اور "جحيم" میں تضاد کی وجہ سے مناسبت واضح ہے۔

اور جہاں مناسبت نہ ہو وہاں عطف جائز نہیں، جیسے "میری گھڑی اور موبائل قیمتی ہیں" یہاں باوجود کہ مسند (قیمتی ہے) ایک ہے، مگر مسند

الیہ (گھڑی اور موبائل) میں کوئی مناسبت نہیں ؛اس لیے یہ عطف جائز نہیں اور جیسے ’’انس شاعر ہے اور بکر دراز قد ہے‘‘ ظاہر ہے کہ شاعر اور دراز قد میں کوئی مناسبت نہیں، اس لیے یہ عطف بھی جائز نہیں۔

11.10.2 معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مناسبتیں

1- ’’تماثل‘‘: یہ مناسبت کبھی دونوں جملوں کے مسند الیہ، اسی طرح مسند کے درمیان ’’تماثل‘‘ کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے، یعنی دونوں کی نوعیت ایک ہو، جیسے مثال مذکور میں ’’حسن شاعر ہے اور انس مضمون نگار ہے‘‘ یہاں دونوں جملوں کا مسند الیہ (حسن، انس) نوع انسانی سے ہے، اس لیے دونوں میں تماثل کی نسبت ہے ؛اسی طرح مسند (شاعر، مضمون نگار) میں بھی تماثل کی نسبت ہے ؛ کیونکہ شاعری اور مضمون نگاری دونوں زبان وادب کی نوع سے ہیں۔

2- ’’تجانس‘‘: اور کبھی مناسبت ’’تجانس‘‘ کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے: یعنی دونوں کی جنسیت ایک ہو، جیسے ’’گھوڑا ایسا ہے اور گدھا ایسا‘‘ ظاہر ہے کہ گھوڑا اور گدھا دونوں جنس حیوان سے ہیں، لہذا ان میں تجانس کی نسبت ہے۔

3- ’’تشابہ‘‘: اور کبھی مناسبت ’’تشابہ‘‘ کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے: یعنی دونوں صفت میں مشابہ ہوں، جیسے ’’ہاشم اور حاتم کی سخاوت قابل رشک ہے‘‘ یہاں ہاشم اور حاتم، صفت سخاوت میں متحد ہیں ؛لہذا دونوں میں تشابہ کی نسبت ہے۔

4- ’’تضایف‘‘: اور کبھی ’’تضایف‘‘ کی نسبت سے مناسبت پیدا ہوتی ہے: یعنی دونوں کے درمیان ایسا تعلق کہ ایک کا سمجھنا دوسرے پر موقوف ہو؛ جیسے ’’خالد بکر کا باپ ہے اور بکر خالد کا بیٹا ہے‘‘ ظاہر ہے کہ باپ ہونا اور بیٹا ہونا ایک دوسرے پر موقوف ہے۔

5- ’’تضاد‘‘: اور کبھی ’’تضاد‘‘ کی نسبت سے مناسبت پیدا ہوتی ہے: یعنی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوں، جیسے ’’نیک اور بد‘‘، ’’خوب صورت اور بدصورت‘‘۔

6- ’’علیت‘‘: اور کبھی ’’علیت‘‘ کی نسبت سے مناسبت پیدا ہوتی ہے: یعنی دونوں کے درمیان ایسا تعلق کہ ایک کا وجود دوسرے کے لیے علت اور دوسرے کا وجود پہلے کے لیے معلول ہو؛ جیسے ’’آفتاب کا طلوع اور دن کا وجود‘‘ کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے علت ومعلول ہیں۔

واضح رہے کہ جن دو جملوں میں عطف کرنا ہو، ان میں مذکورہ مناسبت تو ضروری ہے ہی ؛لیکن اگر وہ دونوں اسمیہ اور فعلیہ ہونے میں بھی باہم موافق ہوں ؛ بل کہ فعلیہ کی صورت میں ماضی اور مضارع ہونے میں بھی موافق ہوں تو ان کا عطف مزید پسندیدہ سمجھا جاتا ہے، جیسے ’’آم میٹھا ہے اور انگور کھٹا ہے‘‘۔ اور جیسے ’’خالد نے پکایا اور احمد نے کھایا‘‘۔ اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ} (التغابن: 1) (اسی کی سچی بادشاہی ہے اور اسی کی تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

ظاہر ہے کہ آیت کریمہ میں جملہ اسمیہ کا عطف جملہ اسمیہ پر کیا گیا ہے۔

اور جیسے: {وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيْرًا} (الفرقان: 35) (اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے بھائی ہارون کو مددگار بنا کر ان کے ساتھ کیا)۔

یہاں جملہ فعلیہ کا عطف جملہ فعلیہ پر کیا گیا ہے، اور دونوں میں فعل ماضی استعمال کیا گیا ہے۔

اور جیسے: {يَعْلَمُ مَا فِيْ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ}(التغابن:4) (جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ سب جانتا ہے؛ اور جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو کھلم کھلا کرتے ہو، اس سے بھی آگاہ ہے)۔

یہاں بھی جملہ فعلیہ کا عطف جملہ فعلیہ پر کیا گیا ہے، اور دونوں میں فعل مضارع استعمال کیا گیا ہے۔

علم معانی کی رو سے وصل اور فصل ہر دو کے لیے الگ الگ مناسب مواقع ہوتے ہیں؛ چنانچہ ہر ایک کو اپنے موقع پر ہی استعمال کیا جائے تو موزوں؛ ورنہ بے محل ہوتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1- تجانس اور تشابہ کی تعریف کریں۔

2- تضاد اور علیت کی تعریف کریں۔

3- تماثل اور تضایف کی تعریف کریں۔

11.11 مواقع وصل

11.11.1 علمائے بلاغت کا بیان

علمائے بلاغت کے مطابق وصل کے مواقع تین ہیں، یعنی تین مقامات پر دو جملوں کے درمیان جوڑ پیدا کرنا واجب ہے، جن کی تفصیل اس طرح ہے:

يجب الوصلُ بين الجملتين في ثلاثةِ مواضع:

(أ) إذا اتَّفَقَتَا خَبَرًا أو إنشاءً وكانت بينَهُمَا مناسبةٌ تامةٌ، ولم يكنْ هناك سببٌ يقتضي الفصلَ بينهما۔

(ب) إذا اختلفتا خبرًا أو إنشاء وأوهم الفصلُ خلافَ المقصود۔

(ج) إذا قُصِدَ إشراكُهما في الحُكم الإعرابي۔

11.11.2 اول

اول: وصل کا پہلا مقام یہ ہے کہ دونوں جملوں کے درمیان مکمل مناسبت ہو، نیز عطف سے کوئی چیز مانع بھی نہ ہو، جیسے: ''نیک لوگ قابل تکریم ہیں، اور برے لوگ قابل توہین'' یہاں دونوں جملے خبریہ ہیں اور دونوں کے مسند الیہ (نیک لوگ، برے لوگ) اسی طرح مسند (قابل تکریم، قابل توہین) میں نسبت تضاد کی وجہ سے پوری مناسبت ہے، اور عطف سے کوئی چیز مانع بھی نہیں؛ اس لیے عطف کر کے وصل کی صورت پیدا کی گئی۔ اور جیسے ''کم ہنسو اور زیادہ روؤ'' یہاں دونوں جملے انشائیہ ہیں اور دونوں کے مسند الیہ میں نسبت تماثل اور دونوں کے مسند میں نسبت تضاد کی وجہ سے مناسبت ظاہر ہے، اس لیے عطف کر دیا گیا۔

اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {مَا اتَّخَذَ اللهُ مِن وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ}(المؤمنون:91) (خدا نے نہ تو اپنا کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے)۔

آیت کریمہ میں دونوں جملے خبریہ ہیں اور معنی ومفہوم کے اعتبار سے دونوں میں مکمل مناسبت ہے، کہ نہ اسے بیٹے کی ضرورت ہے نہ مددگار کی، اس کی حکومت وفرمانروائی میں نہ کسی شریک کی شرکت ہے نہ ساجھے دار کی ساجھے داری، وہ تو زمین وآسمان اور ذرے ذرے کا تنہا مالک ومختار ہے، اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {وَاعْبُدُوْا اللہَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئاً}(النساء:36) (اور خدا ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ)۔

یہاں دونوں جملے انشائیہ ہیں اور دونوں میں مکمل مناسبت ہے؛ کیونکہ پہلے سے مطلوب اللہ تعالی کی عبادت ہے اور دوسرے سے شرک کی ممانعت اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں خالق کائنات کے لیے انسان کے ذمہ واجب ہیں۔

11.11.3 دوم

دوم: جب دونوں جملے خبر وانشاء کے اعتبار سے مختلف ہوں: یعنی ایک خبریہ اور ایک انشائیہ ہو اور عطف نہ کرنے سے خلاف مقصود کا وہم ہوتا ہو، جیسے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک بار ایک شخص کے پاس سے گذرے جس کے ہاتھ میں کپڑا تھا تو آپ نے پوچھا: ''کیا اسے بیچو گے؟'' تو اس شخص نے جواب دیا: ''نہیں، اور رحم کرے اللہ آپ پر'' دیکھیے یہاں دو جملے ہیں: ایک ''نہیں'': یعنی ''نہیں بیچوں گا'' یہ جملہ خبریہ ہے، اور دوسرا ''رحم کرے اللہ آپ پر'' یہ جملہ انشائیہ ہے، جس کا مقصد دعا ہے اور عطف نہ کرنے سے خلاف مقصد کا وہم ہوتا ہے؛ کیونکہ اس صورت میں جملہ اس طرح ہوگا: ''نہیں رحم کرے اللہ آپ پر'' اور یہ بددعا ہے، اسی لیے آپؓ نے تنبیہ فرمائی اور عطف کے ساتھ کہنے کا حکم فرمایا؛ تاکہ دعا سے بددعا کا وہم نہ ہو۔

2.11.4 سوم

جب پہلے جملہ کے لیے کوئی حکم اعرابی ہو: یعنی وہ ترکیب میں مبتدا، یا خبر، یا صفت، یا حال، یا مفعول، یا صلہ، یا شرط، یا جزا، وغیرہ واقع ہو؛ اور دوسرے جملہ کو اس حکم میں شریک کرنا مقصود ہو: یعنی پہلے کی طرح اسے بھی مبتدا، یا خبر، یا مفعول، یا حال وغیرہ بنانا ہو، اور کوئی مانع بھی نہ ہو تو دوسرے جملہ کا پہلے جملہ پر عطف کرکے وصل کی صورت پیدا کرتے ہیں؛ جیسے ''علی کہنے والا ہے اور کرنے والا ہے''۔

یہاں ''کہنے والا ہے'' (پہلا جملہ) ''علی'' مبتدا کی خبر ہے، جس پر ''کرنے والا ہے'' (دوسرا جملہ) کا عطف کیا گیا؛ تاکہ یہ بھی اس مبتدا کی خبر ہوجائے اور جیسے قرآن میں ہے: {إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيْلِ اللہِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يَغْفِرَ اللہُ لَهُمْ}(محمد:34) (جو لوگ کافر ہوئے اور خدا کے راستے سے روکتے رہے پھر کافر ہی مر گئے خدا ان کو ہرگز نہیں بخشے گا)۔

آیت کریمہ میں ''کفروا'' (پہلا جملہ) ''الذین'' موصول کا صلہ ہے، لہذا ''وصدوا عن سبیل اللہ'' اور ''ثم ماتوا'' (دوسرے جملہ) کا اس پر عطف کردیا گیا؛ تاکہ یہ بھی اس موصول کا صلہ ہوجائیں۔

اور جیسے: {وَإِن تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ}(محمد:36) (اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری کروگے، تو وہ تم کو تمہارا اجر دے گا اور تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا)۔

یہاں ''وإن تؤمنوا'' (پہلا جملہ) شرط ہے، جس پر ''وتتقوا'' (دوسرے جملہ) کا عطف کردیا گیا؛ تاکہ یہ بھی شرط ہوجائے اسی طرح

"یؤتکم أجورکم" (پہلا جملہ) جزا ہے، جس پر "ولا یسئلکم أموالکم" (دوسرے جملہ) کا عطف کر دیا گیا، تاکہ یہ بھی جزا ہو جائے۔

معلومات کی جانچ

1- وصل کے پہلے دو مواقع پر روشنی ڈالیے۔

2- وصل کے تیسرے مقام پر روشنی ڈالیے۔

11.12 مواقع فصل

11.12.1 علمائے بلاغت کا بیان

علمائے بلاغت کے مطابق فصل کے مواقع پانچ ہیں، یعنی پانچ مقامات پر دو جملوں کے درمیان فصل رکھنا واجب ہے، جن کی تفصیل اس طرح ہے: **یجب الفصل بین الجملتین في خمسة مواضع:**

(أ) **أن یکون بینهما اتحادٌ تامٌ، وذلک بأنْ تکونَ الجملةُ الثانیةُ توکیداً للأولی، أو بیاناً لها، أو بدلاً منها، ویقال حینئذٍ إنَّ بینَ الجملتین کمالَ الاتّصالِ۔**

(ب) **أَنْ یکون بینهما تباینٌ تامٌ، وذلک بأن تختَلِفا خبراً وإنشاء، أو بألاّ تکون بینهما مناسبةٌ مَا، ویقال حینئذ إن بین الجملتین کمالَ الانقطاع۔**

(ج) **أَنْ تکونَ الثانیةُ جواباً عن سؤال یفهم من الأولی، ویقال حینئذ إن بین الجملتین شِبهَ کمالِ الاتصال۔**

(د) **أن تَسبِق جملة بجملتین، یصح عطفها علی إحداهما، لوجود المناسبة، وفي عطفها علی الأخری فساد، فیترک العطف دفعا للوهم۔**

(ه) **أن یُقصد تشریک الجملتین في الحکم لقیامِ مانعٍ۔**

11.12.2 اول

اول: فصل کا پہلا مقام یہ ہے کہ جب دونوں جملوں میں کمال اتصال ہو، اس کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہو، جیسے قرآن پاک میں ہے: {فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْداً} (الطارق:17) (تو تم کافروں کو مہلت دو بس چند روز ہی مہلت دو)۔

آیت کریمہ میں دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید لفظی ہے، لہذا دونوں میں کمال اتصال ہے، اسی وجہ سے عطف نہیں کیا گیا۔ اور جیسے: {وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوىٰ، إِنْ هُوَ إِلاَّ وَحْيٌ يُوحىٰ} (النجم:4-3) (اور نہ اپنی نفسانی خواہش سے کوئی بات کرتے ہیں، یہ قرآن تو اللہ کا حکم ہے، جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے)۔

یہاں دوسرا جملہ، پہلے جملہ کی تاکید معنوی ہے؛ کیونکہ وحی ہونے کا اثبات خواہش نفس سے ہونے کی نفی کو مستلزم ہے، یعنی اگر وحی ہے تو لازمی ہے کہ خواہش نفس کی بات نہ ہو، لہذا دونوں میں کمال اتصال ہوا اور عطف نہیں کیا گیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ سے بدل ہو، جیسے قرآن پاک میں ہے:{**وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً ۝ يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ**}(الفرقان:69-68) (اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا، قیامت کے دن اس کو دوگنا عذاب ہوگا)۔

آیت کریمہ میں "یلق أثاماً" دوسرا جملہ "ومن یفعل ذلک" پہلے جملہ سے بدل کل ہے، جس کی وجہ سے دونوں میں کمال اتصال ہوا اور عطف نہیں کیا گیا۔

اور جیسے:{يُدَبِّرُ الأَمْرَ يُفَصِّلُ الآيَاتِ}(الرعد:2) (وہی دنیا کے کاموں کا انتظام کرتا ہے، وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے)۔

یہاں دوسرا جملہ، پہلے جملہ سے بدل بعض واقع ہے، اسی لیے عطف نہیں کیا گیا۔

اور جیسے:{وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً}(النمل:88) (اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ اپنی جگہ پر کھڑے ہیں)۔

یہاں دوسرا جملہ پہلے جملہ سے بدل اشتمال ہے، اسی لیے عطف نہیں کیا گیا۔

تیسری صورت یہ کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ کا بیان ہو، جیسے قرآن پاک میں ہے: {يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَائكُمْ}(البقرة:49) (وہ لوگ تم کو بڑا دکھ دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر ڈالتے تھے)۔

یہاں دوسرا جملہ، پہلے جملہ کا بیان ہے، جس کی وجہ سے دونوں میں کمال اتصال ہوا اور عطف نہیں کیا گیا۔

11.12.3 دوم

دوم: جب دونوں جملوں میں کمال انقطاع ہو، اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ کہ دونوں جملے خبر و انشاء کے اعتبار سے مختلف ہوں، یعنی ایک خبر اور ایک انشاء ہو۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:{قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ}(النور: 30) (مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں، یہ ان کے لیے بڑی پاکیزگی کی بات ہے)۔

آیت کریمہ میں "ذلک أزکیٰ لهم" جملہ خبریہ ہے اور ماقبل میں جملہ انشائیہ ہے، لہذا دونوں میں کمال انقطاع ہے، جس کی وجہ سے اس کا عطف ماقبل پر نہیں کیا گیا۔

دوسری صورت یہ کہ دونوں جملوں میں کسی طرح کی کوئی مناسبت نہ ہو، جیسے "دنیا گول ہے، چاول سفید ہے" ظاہر ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے کمال انقطاع ہے، اس لیے فصل کیا گیا۔

11.12.4 سوم

سوم: جب دونوں جملوں میں کمال اتصال کا شبہ ہو، جس کی صورت یہ ہے کہ دوسرا جملہ اس سوال کا جواب ہو جو پہلے جملہ سے پیدا ہو رہا ہو، اس صورت کو "استیناف" بھی کہتے ہیں؛ کیونکہ دوسرے جملہ کا پہلے جملہ سے لفظاً ربط نہیں ہوتا، بلکہ معنی ربط ہوتا ہے، کہ پہلا جملہ سوال کے درجہ میں ہوتا ہے اور دوسرا جملہ اس کا جواب ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ سوال و جواب میں گہرا تعلق اور اتصال ہے، لہذا یہ اس اعتبار سے کمال اتصال کے مشابہ ہے، غرض یہ کہ دونوں جملے سوال و جواب کی طرح ہوتے ہیں، اس لیے ان میں عطف نہ کر کے فصل کی صورت پیدا کی جاتی ہے۔ جیسے قرآن

میں ہے: {فَقَالُوْا سَلَاماً قَالَ سَلَامٌ}(الذاریات:25) (تو سلام کہا، انھوں نے بھی جواب میں سلام کہا)۔

پہلے جملہ سے سوال پیدا ہوا کہ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ سے سلام کہا تو انھوں نے کیا کہا؟ تو دوسرے جملہ سے اس کا جواب دیا گیا، کہ انھوں نے بھی سلام کہا، تو چونکہ دوسرا جملہ، پہلے جملہ سے پیدا ہونے والے سوال کا جواب ہے؛ لہذا دونوں میں کمال اتصال کا شبہ ہوا، جس کی وجہ سے عطف نہیں کیا گیا۔

11.12.5 چہارم

چہارم: جب دونوں جملوں میں کمال انقطاع کا شبہ ہو، جس کی صورت یہ ہے کہ کلام میں تین جملے ہوں، جن میں تیسرے جملے کا عطف پہلے دو میں سے ایک پر صحیح ہو، کیونکہ دونوں میں مناسبت پائی جاتی ہو؛ لیکن دوسرے پر عطف صحیح نہ ہو کیونکہ اس سے معنی فاسد ہو جاتا ہو؛ لہذا اس صورت میں صحیح عطف کو بھی چھوڑ دیتے ہیں، تاکہ فاسد عطف کا وہم نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں صحیح عطف سے رکاوٹ محض فاسد عطف کا وہم ہے، جو ایک خارجی چیز ہے، قرینہ سے زائل ہو سکتی ہے، اس لیے یہ صورت کمال انقطاع نہیں کہلائے گی، بلکہ اس میں کمال انقطاع کا شبہ ہوگا۔ جیسے:

وتظنُّ سلمى أنني أبغي بها بَدلا، أَرَاهَا فِي الضَّلالِ تَهِيمُ

یعنی سلمی سمجھتی ہے کہ میں اس کی جگہ کسی اور کو ڈھونڈتا ہوں، میں اسے ایک غلط خیال میں سرگرداں پاتا ہوں۔

یہاں اگر "وأراها" کہہ دیا جائے تو یا تو یہ احتمال ہوگا کہ یہ "تظنّ" پر عطف ہے یا "أبغي" پر اور دونوں صورتوں میں معنی فاسد ہو جائیں گے، اسی لیے عطف کو ختم کر کے "أراها في الضلال تهيم" کو مستقل جملہ کے طور پر لایا گیا۔

11.12.6 پنجم

پنجم: جب دونوں جملوں میں توسط بین الکمالین ہو: یعنی دونوں جملے کمال اتصال اور کمال انقطاع کے بین بین ہوں، جس کی صورت یہ ہے کہ دونوں جملوں کے درمیان ربط و مناسبت تو ہو؛ لیکن کسی مانع کی وجہ سے دونوں کو ایک حکم میں شریک کرنے کا قصد نہ کیا جائے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {وَإِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيَاطِيْنِهِمْ قَالُوْا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُوْنَ. اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ}(البقرۃ:15-14) (اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ہنسی کیا کرتے ہیں، ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے)۔

آیت کریمہ میں "اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِم" جملہ کا عطف ماقبل پر صحیح نہیں، کیونکہ ماقبل کا جملہ منافقین کا مقولہ ہے، اب اگر عطف کیا جائے تو یہ بھی منافقین کا مقولہ ہو جائے گا، جب کہ یہ اللہ پاک کا مقولہ ہے۔

معلومات کی جانچ

1- فصل کے پہلے دو مواقع پر روشنی ڈالیے۔

2- فصل کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں مواقع پر روشنی ڈالیے۔

11.13 اکتسابی نتائج

قصر کے لغوی معنی روکنے اور منحصر کرنے کے ہیں، اصطلاح میں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ مخصوص طور پر خاص کر دینے کو "قصر" کہتے

ہیں، لہذا جس کو خاص کیا جائے اسے ''مقصور'' اور جس کے ساتھ خاص کیا جائے اسے ''مقصور علیہ'' کہتے ہیں اور یہ دونوں قصر کے ارکان، اجزا یا اطراف کہلاتے ہیں، قصر کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: (1) قصر حقیقی ۔(2) قصر اضافی ۔قصر حقیقی یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ بہ اعتبار حقیقت، واقعی خاص کر دینا کہ پہلی چیز اسی دوسری چیز میں منحصر ہے، کسی اور میں نہیں پائی جاتی اور قصر اضافی یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ کسی متعین شئے کی بہ نسبت خاص کرنا، بہ اعتبار حقیقت ہر شئے کی بہ نسبت نہیں۔

پھر قصر حقیقی و اضافی میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں: 1۔قصر موصوف بر صفت حقیقی 2۔قصر صفت بر موصوف حقیقی، پہلے کا مطلب یہ ہے کہ بہ اعتبار حقیقت موصوف اسی صفت کے ساتھ خاص ہے، یعنی حقیقت کے اعتبار سے اس میں اس صفت کے علاوہ کوئی اور صفت نہ پائی جائے، البتہ وہ صفت کسی اور موصوف میں پائی جاسکتی ہو اور دوسرے کا مطلب یہ ہے کہ بہ اعتبار حقیقت وہ صفت اسی موصوف کے ساتھ خاص ہے، یعنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صفت اس موصوف کے علاوہ کسی اور موصوف میں نہ پائی جائے، البتہ اس موصوف میں اس صفت کے علاوہ اور صفات بھی پائی جاسکتی ہوں۔

(1) قصر موصوف بر صفت اضافی: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی موصوف کو ایک صفت کے ساتھ، بہ نسبت دوسری صفت کے خاص کر دیا جائے، خواہ اس موصوف میں اس دوسری صفت کے علاوہ اور صفات پائی جائیں یا نہ پائی جائیں (2) قصر صفت بر موصوف اضافی: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی صفت کو ایک موصوف کے ساتھ، بہ نسبت دوسرے موصوف کے خاص کر دیا جائے۔ خواہ اس دوسرے موصوف کے علاوہ دیگر موصوف میں وہ صفت پائی جائے یا نہ پائی جائے۔

مخاطب کی حالت کے اعتبار سے قصر اضافی کی تین قسمیں ہیں: (1) قصر افراد۔(2) قصر قلب۔(3) قصر تعیین

زبان و ادب میں قصر کے بہت سے طریقے رائج ہیں، جن میں چار طریقوں کا استعمال بیش تر ہوتا ہے، اول: نفی اور استثناء، جیسے ''لا إله إلا الله'' (نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے)۔ اور جیسے قرآن میں ہے: {وَمَا نَتَنَزَّلُ إلا بأمرِ ربِّک} (مریم: 64) اور ہم تمہارے پروردگار کے حکم کے سوا اترا نہیں سکتے۔ دوم: لفظ ''إنما'' (بلاشبہ) کا لانا، جیسے ''بلاشبہ میری سعی کامیاب ہوئی''۔ اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {قل إنما أنا بشر مثلکم یوحیٰ إلي أنما الٰهکم إله واحد} (الکھف: 109) (کہہ دو کہ بلاشبہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں، البتہ میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود وہی ایک معبود ہے)۔ سوم: عطف کرنا، جیسے ''زید کھڑا نہیں ہے، بل کہ بیٹھا ہے''۔ چہارم: مؤخر کو مقدم کرنا دینا، جیسے ''تجھی کو ہم پوجتے ہیں'' ''إِیَّاکَ نَعْبُد'' یہاں ''تجھی'' مفعول ہے، جسے مؤخر ہونا چاہیے تھا؛ مگر قصر کے لیے مقدم کر دیا گیا اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {وما ظلمونا ولکن کانوا أنفسهم یظلمون} (البقرۃ: 57) اور وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے، بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

جہاں تک وصل اور فصل کا تعلق ہے تو ایک مفرد، یا ایک جملہ کو دوسرے مفرد، یا دوسرے جملہ پر عطف کرنے کو ''وصل'' اور عطف نہ کرنے کو ''فصل'' کہتے ہیں، تین مقامات پر وصل ہوتا ہے: ۱۔ جب دونوں کے درمیان مکمل مناسبت ہو، نیز عطف سے کوئی چیز مانع بھی نہ ہو ۲۔ جب دونوں جملے خبر و انشاء کے اعتبار سے مختلف ہوں: یعنی ایک خبریہ اور ایک انشائیہ ہو اور عطف نہ کرنے سے خلاف مقصود کا وہم ہوتا ہو ۳۔ جب پہلے جملہ کے لیے کوئی حکم اعرابی ہو۔ فصل کے مواقع پانچ ہیں: ۱۔ جب دونوں جملوں میں کمال اتصال ہو ۲۔ جب دونوں جملوں میں کمال انقطاع ہو ۳۔ جب دونوں جملوں میں کمال اتصال کا شبہ ہو ۴۔ جب دونوں جملوں میں کمال انقطاع کا شبہ ہو ۵۔ جب دونوں جملوں میں توسط بین الکمالین ہو۔

11.14 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1- قصر کے لغوی واصطلاحی معنی بیان کریں نیز قصر حقیقی اور اضافی کی تعریف کریں۔

2- قصر موصوف بر صفت حقیقی اور قصر صفت بر موصوف حقیقی کی وضاحت کریں۔

3- قصر موصوف بر صفت اضافی اور قصر صفت بر موصوف اضافی کو سمجھائیں۔

4- وصل اور فصل کا مفہوم ذکر کریں نیز قصر افراد، قصر قلب اور قصر تعیین کی تعریف مثالوں کے ساتھ لکھیں؟

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1- معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان کیا مناسبت ہے؟ تفصیل سے لکھیں۔

2- وصل کے مواقع کیا ہیں؟ مثالوں کے ساتھ لکھیں۔

3- فصل کے مواقع کیا ہیں؟ مثالوں کے ساتھ تفصیل سے لکھیں۔

11.15 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1-	مختصر المعاني	سعد الدین تفتازانی
2-	علم المعاني	عبد العزیز عتیق
3-	البلاغة فنونها وأفنانها (علم المعاني)	فضل حسن عباس
4-	دروس البلاغة	حفنی ناصف، محمد دیاب، سلطان محمد، مصطفی طمّوم
5-	البلاغة الواضحة	علی الجارم و مصطفی امین
6-	مختصر المعاني	سعد الدین تفتازانی

اکائی 12 مساوات،ایجاز،اطناب

اکائی کے اجزا

12.1 تمہید

12.2 مقصد

12.3 مساوات

12.4 ایجاز

12.5 ایجاز کے محرکات اوراس کے مواقع

12.5.1 ایجاز کے محرکات

12.5.2 ایجاز کے مواقع

12.6 ایجاز کی اقسام

12.6.1 ایجازِ قِصَر

12.6.2 ایجازِ حذف

12.7 حذف کی اقسام

12.8 حذف کی علامتیں

12.9 اطناب اوراس کے مواقع

12.10 اطناب کی صورتیں

12.10.1 ابہام کے بعد ایضاح

12.10.2 عام کے بعد خاص کا ذکر

12.10.3 خاص کے بعد عام کا ذکر

12.10.4 اعتراض

12.10.5 ایغال

12.10.6 تکرار

12.10.7 تکمیل یا احتراس

12.10.8 توشیع

12.10.9 تتمیم

12.10.10 تذییل

12.11 اکتسابی نتائج

12.12 امتحانی سوالات کے نمونے

12.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

12.1 تمہید

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ آپ سمجھ سکیں کہ مافی الضمیر کی تعبیر کے لیے بلاغت میں تین طریقے رائج ہیں: ایجاز، اطناب اور مساوات، چنانچہ ہر شخص اپنی مراد سمجھانے کے لیے انہی طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کرتا ہے، لہذا موقع ومحل کا جو تقاضا ہو، وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ کبھی موقع ومحل کا تقاضا اختصار کا ہوتا ہے اور کبھی طویل کلام کرنے کا اور کبھی درمیانی کلام کا۔ تعبیر کے انہی طریقوں کو بلاغت کی اصطلاح میں ''ایجاز''، ''اطناب'' اور ''مساوات'' کہا جاتا ہے اور یہ بھی جان سکیں گے کہ ایجاز کے مواقع اور اس کی اقسام کیا ہیں؟ اسی طرح حذف کی قسمیں کیا ہیں، نیز اطناب کے مواقع اور اس کی صورتوں سے بھی واقف کرایا جائے گا، ساتھ ہی آپ مساوات کی تفصیلات بھی جان سکیں گے۔

12.2 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ علم المعانی کے چند اہم مباحث: ایجاز، اطناب اور مساوات کو سمجھ سکیں اور یہ بھی جان سکیں کہ ایجاز کے مواقع اور اس کی اقسام کیا ہیں؟ اسی طرح حذف کی قسمیں کیا ہیں؟ نیز اطناب کے مواقع اور اس کی صورتوں سے بھی واقف ہوں گے، ساتھ ہی آپ مساوات کی تفصیلات بھی جان سکیں گے۔

12.3 مساوات

علمائے بلاغت مساوات کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

کسی مفہوم کی ادائیگی مساوی الفاظ سے کرنا ''مساوات'' کہلاتا ہے کہ نہ الفاظ معانی سے زیادہ ہوں اور نہ معانی الفاظ سے زیادہ ہوں۔

دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مساوات کا مطلب ہے الفاظ کا بہ قدرِ معانی اور معانی کا بہ قدرِ الفاظ ہونا جس کے لیے معیار یہ ہے کہ کلام میں کچھ لفظ زیادہ کرنے یا کم کرنے کی گنجائش نہ ہو، کیونکہ اگر کوئی لفظ بڑھایا جائے تو وہ محض زائد ہوگا اور اگر کم کیا جائے تو معنی میں خلل واقع ہوگا، جیسے قرآن کی یہ آیت: {وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ} (فاطر: 43) (اور بری سازشوں کا وبال سازش کرنے والوں پر ہی ہوتا ہے)۔ اس آیت میں الفاظ بہ قدر معانی ہی استعمال کیے گئے ہیں، جن میں کچھ کمی یا زیادتی کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح طرفہ بن العبد کا یہ شعر ہے:

سَتُبدِي لکَ الأيّامُ ماكنتَ جاهلا   ويأتيک بالأخبار مَن لم تزوّدِ

(اگر تم زندہ رہے تو عنقریب زمانہ تمہیں وہ باتیں بھی بتادے گا جو تم نہیں جانتے تھے اور ایسا شخص بھی تمہیں خبریں پہنچائے گا جس کو تم نے خبریں لانے کے لیے بھیجا بھی نہ ہوگا اور اسے زادِ سفر بھی نہ دیا ہوگا)۔

ظاہر ہے کہ اس شعر میں بھی الفاظ بہ قدر معانی استعمال کیے گئے ہیں، کچھ کمی یا زیادتی نہیں، لہذا یہ مساوات ہے۔

اور جیسے قرآن مجید میں ہے: {وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللهِ} (البقرة: 110) (اور جو بھلائی اپنے لیے آگے بھیج رکھو گے، اس کو خدا کے یہاں پالو گے)۔

آیت کریمہ میں الفاظ کا استعمال بہ قدر معانی ہوا ہے، لہذا یہ مساوات ہے۔

واضح رہے کہ مساوات ایسا طریقۂ تعبیر ہے جو عام طور سے عوام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جو اگرچہ بلاغت کے مراتب کو نہیں پہنچتے، تاہم ایسا بھی نہیں کہ عقل وفہم سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو، مذکورہ آیت کریمہ میں بھی یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ وہاں عام ذہن کو پیش نظر رکھ کر کلام کیا گیا ہے، تا کہ اسے ہر کوئی سمجھ سکے؛ کیونکہ ایجاز واطناب کے طریقوں سے ہر شخص واقف نہیں ہوتا۔

معلومات کی جانچ

1- مساوات کسے کہتے ہیں؟

2- مثال کے طور پر مذکور آیت کریمہ اور شعر کی تشریح کریں۔

12.4 ایجاز

علمائے بلاغت ایجاز کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

کم لفظوں میں ایک وسیع معنی کو سمیٹ لینا کہ اپنی مراد کو سمجھانے کے لیے جتنے الفاظ ضروری تھے، ان سے کم ہی استعمال کیے جائیں؛ مگر یہ اتنے واضح اور جامع ہوں کہ ادائیگی مراد کے لیے کافی ہوجاتے ہوں، جیسے قرآن پاک میں ہے: {خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ} (الأعراف: 199) (اے محمد ﷺ! عفو اختیار کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کرلو)۔

آیت کریمہ الفاظ کے اعتبار سے بہت مختصر ہے، مگر اس میں ایک وسیع معنی کا احاطہ کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اخلاقی خوبیوں کی تمام باتیں سمودی گئی ہیں۔

اور اگر الفاظ اس طرح کم ہوں کہ مراد کے لیے ناکافی ہوتے ہوں اور کلام کا مطلب سمجھنے میں خلل واقع ہوتا ہو تو اسے "إخلال" یا "إیجازِ مُخِلّ" کہتے ہیں، جو قابل قبول نہیں۔

معلومات کی جانچ

1- ایجاز کسے کہتے ہیں؟

2- مثال میں مذکور آیت کریمہ کی تشریح کریں۔

12.5 ایجاز کے محرکات اور اس کے مواقع

12.5.1 ایجاز کے محرکات

ایجاز کے مختلف محرکات ہوتے ہیں، انہیں محرکات کی بنیاد پر اس کے استعمال سے کلام بلیغ ہوتا ہے؛ مثلاً: جہاں اختصار مطلوب ہو، یاد کرنے میں سہولت پیدا کرنا ہو، فہم کے قریب کرنا ہو، موقع تنگ ہو، غیر سامع سے اخفا مقصود ہو، سامع کو طویل گفتگو سے اکتاہٹ ہوتی ہو، تھوڑے لفظوں میں زیادہ معانی بیان کرنا ہو وغیرہ، علمائے بلاغت کہتے ہیں:

12.5.2 ایجاز کے مواقع

رحم کی درخواست، گلہ شکوہ، معذرت، تعزیت، سرزنش، زجر وتوبیخ، وعدہ ووعید اور اظہار تشکر وغیرہ کے وقت نیز شاہی فرامین میں ایجاز کا

طریقہ مستحسن ہوتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1- ایجاز کے محرکات کیا ہیں؟

2- ایجاز کے مواقع کیا ہیں؟

12.6 ایجاز کی اقسام

12.6.1 ایجاز قصر

ایجاز قصر کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: **"إيجازُ قِصَرٍ, ويكونُ بتَضْمِيْنِ العباراتِ القصيرةِ معاني كثيرةً مِنْ غَيْرِ حَذْفٍ"**۔

ایجاز قصر کو "ایجاز بلاغت" بھی کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں، اور کچھ محذوف بھی نہ ہو، جیسے قرآن مجید میں ہے: **{وَلَكُمْ فِيْ الْقِصَاصِ حَيَاةٌ}(البقرة:179)** (اور قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے)۔

آیت کریمہ میں الفاظ کم اور معنی زیادہ ہیں؛ کیونکہ مطلب یہ ہے کہ انسان جب یہ جان لے گا کہ قتل کا بدلہ قتل ہے، تو وہ قتل سے باز رہے گا اور ظاہر ہے کہ اس میں خود اس کی زندگی بھی محفوظ رہے گی اور جسے قتل کرتا اس کی زندگی بھی محفوظ رہے گی، جس سے نسل انسانی کا تحفظ ہوگا۔ پس یہ قصاص قتل سے باز رہنے کا سبب اور زندگی کا محافظ ہے، تو چونکہ آیت کریمہ میں الفاظ کم اور معنی زیادہ ہیں اور کچھ حذف بھی نہیں، لہذا یہ ایجاز قصر ہے۔

12.6.2 ایجاز حذف

ایجاز حذف کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: **"إِيْجَازُ حَذْفٍ, ويكونُ بِحذفِ كلمةٍ أو جملةٍ أو أكثرَ مع قرينةٍ تُعَيّن المحذوفَ"**۔

ایجازِ حذف کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں اختصار کچھ حذف کر کے کیا جائے اور محذوف کی تعیین پر کوئی قرینہ موجود ہو، تاکہ مراد کے سمجھنے میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

اس حذف کی مختلف صورتیں ہیں:

1- کبھی مضاف کو حذف کر کے کلام میں اختصار پیدا کیا جاتا ہے، جیسے قرآن میں ہے: **{وَجَاهِدُوا فِيْ اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ}(الحج:78)** (اور خدا (کی راہ) میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے)۔ یہاں "**في الله**" میں مضاف محذوف ہے، یعنی: "**في سبيل الله**"۔

2- کبھی مضاف الیہ کو حذف کیا جاتا ہے، جیسے: **{وَوَاعَدْنَا مُوسَى ثَلاثِيْنَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ}(الأعراف:142)** (اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی اور اسے دس راتوں کے اضافہ سے مکمل کیا)۔ یہاں "**بعشر**" کا مضاف الیہ محذوف ہے: یعنی "**بعشر ليال**"۔

3- کبھی موصوف کو حذف کیا جاتا ہے، جیسے قرآن میں ہے: **{وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً}(الفرقان:71)** (اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے)۔ یہاں "**صالحاً**" کا موصوف محذوف ہے: یعنی "**عملاً صالحاً**"۔

4- کبھی صفت کو حذف کیا جاتا ہے، جیسے قرآن میں ہے: **{فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَى رِجْسِهِمْ}(التوبة:125)** (ان کی گندگی میں اور گندگی

بڑھ گئی)۔ یہاں ”رجساً“ کی صفت محذوف ہے: یعنی ”رجساً مضافا إلی رجسھم“۔

5- کبھی شرط کو حذف کیا جاتا ہے، جیسے ”کچھ پانا چاہتے ہو تو محنت کرو!“ یعنی تو محنت کرو اگر کچھ پانا چاہتے ہو“ اور جیسے قرآن میں ہے: {اتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ} (آل عمران: 31) (میری پیروی کرو! خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا)۔ یہاں شرط محذوف ہے: یعنی ”فإن تتبعوني“۔

6- کبھی جوابِ شرط کو حذف کیا جاتا ہے، جیسے قرآن میں ہے: {وَلَوْ تَرىٰ إِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ} (الأنعام: 27) (اور اگر تم ان کو اس وقت دیکھو جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے)۔ یہاں ”ولو تری“ شرط کا جواب محذوف ہے: یعنی ”لرأیت أمراً فظیعاً“۔

7- کبھی مفعول اور متعلق کو حذف کیا جاتا ہے، جیسے: {وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِيْنَ} (النحل: 9) (اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے راستہ پر چلا دیتا)۔ یہاں ”شاء“ فعل کا مفعول محذوف ہے: یعنی ”ولو شاء ھدایتکم“۔ اور جیسے: {لا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ} (الأنبياء: 23) (وہ جو کام کرتا ہے اس کی پرسش نہیں ہوگی اور (جو یہ لوگ کرتے ہیں، اس کی) ان سے پرسش ہوگی)۔ یہاں ”یسئلون“ فعل کا متعلق محذوف ہے: یعنی ”یسئلون عما یفعلون“۔

8- کبھی مسند الیہ کو حذف کیا جاتا ہے، جیسے قرآن میں ہے: {بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ} (سبأ: 15) (رہنے کو یہ پاکیزہ شہر ہے اور بخشنے کو خدائے غفار)۔ یہاں ”بلدۃ طیبة“ سے پہلے ”أرض سبأ“ اور ”رب غفور“ سے پہلے ”اللہ“ مسند الیہ محذوف ہے: یعنی ”أرض سبأ بلدۃ طیبة واللہ رب غفور“۔

9- کبھی مسند کو حذف کیا جاتا ہے، جیسے قرآن میں ہے: {وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللهُ} (لقمان: 25) (اور اگر تم ان سے دریافت کرو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو بول اٹھیں گے کہ اللہ نے)۔ یہاں ”اللہ“ مسند الیہ کا مسند محذوف ہے: یعنی ”خلقھن اللہ“۔

10- کبھی ایک، یا ایک سے زائد جملہ کو حذف کیا جاتا ہے، جیسے قرآن میں ہے: {كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّيْنَ} (البقرة: 213) (پہلے تو سب لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا (لیکن وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے) تو خدا نے نبیوں کو بھیجا)۔ یہاں ”فبعث“ سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے: یعنی ”فاختلفوا فبعث اللہ النبیین“ اور جیسے: {أَنَا أُنَبِّئُكُم بِتَأْوِيْلِهِ فَأَرْسِلُوْنِ. يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيْقُ أَفْتِنَا} (یوسف: 46-45) (میں آپ کو اس کی تعبیر بتاتا ہوں، مجھے جیل خانہ جانے کی اجازت دیجیے (غرض وہ یوسف کے پاس آیا اور کہنے لگا) یوسف! اے بڑے سچے! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتایئے)۔ آیت کریمہ میں کئی جملے محذوف ہیں: یعنی ”فأرسلون إلی یوسف لأستعبرہ الرؤیا، فأرسلوہ فأتاہ، وقال له: یوسف أیھا الصدیق أفتنا“ مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کے ساقی نے بادشاہ اور اہل دربار سے کہا: کہ میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتاؤں گا، مجھے یوسفؑ کے پاس بھیجو کہ میں اس سے اس کی تعبیر معلوم کروں، تو انھوں نے اسے بھیجا، اب یہ حضرت یوسفؑ کے پاس آیا اور کہا، یوسف! اے بڑے سچے! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتایئے۔

معلومات کی جانچ

1- ایجازِ قِصَر اور ایجازِ حذف کسے کہتے ہیں؟

2- ایجازِ حذف کی کتنی صورتیں ہیں اور کیا کیا ہیں؟

12.7 حذف کی اقسام

حذف کی دو قسمیں ہیں:

اول: یہ کہ محذوف کے قائم مقام کوئی چیز نہ ہو، بلکہ کسی قرینہ سے وہ سمجھا جائے، جیسا کہ ایجازِ حذف کی مثالوں میں گذرا۔

دوم: یہ کہ کوئی چیز محذوف کے قائم مقام ہو، جیسے قرآن کریم میں ہے: {لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ}(الأنفال:8) (تا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کردے)۔ یہاں ایک جملہ محذوف ہے: یعنی "فعل الله ذلک" اور آیت کریمہ اس محذوف جملہ کے قائم مقام ہے۔اور جیسے {فَإِنَّمَا عَلَيْکَ الْبَلاَغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ}(الرعد:40) (تو تمہارا کام پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے)۔ یہاں شرط وجزا کا جملہ حذف کردیا گیا ہے اور آیت کریمہ کو اس کے قائم مقام کردیا گیا ہے: یعنی "إن لم يؤمنوا فلا تحزن فإنما عليک البلاغ وعلينا الحساب"۔

معلومات کی جانچ

1- حذف کی پہلی قسم کیا ہے؟

2- حذف کی دوسری قسم کیا ہے؟

12.8 حذف کی علامتیں

جب کلام میں کچھ حذف ہو،تو اس حذف کا پتہ لگانا ، نیز محذوف کو متعین کرنا ضروری ہوتا ہے،تا کہ کلام کی مراد پوری طرح واضح ہوسکے، چنانچہ کچھ حذف ہے، اس کا پتہ تو عقل سے چلتا ہے اور کیا حذف ہے؟ اس کی تعیین درجہ ذیل باتوں سے کی جاتی ہے:

1- کبھی مقصود کلام سے محذوف کی تعیین کی جاتی ہے، جیسے: ''کبوتر حلال ہے اور گدھ حرام ہے'' چونکہ اس کلام کا مقصد کھانے کی حلت وحرمت بیان کرنا ہے، لہذا ''کھانا'' محذوف مانا جائے گا اور مطلب ہوگا کہ ''کبوتر کا کھانا حلال ہے اور گدھ کا کھانا حرام ہے'' اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {حُرِّمَتْ عَلَيْکُمُ الْمَيْتَةُ}(المائدة:3) (تم پر مرا ہوا جانور حرام ہے)۔ چونکہ اس آیت کا مقصد مردار کے کھانے کی حرمت بیان کرنا ہے، لہذا عقل کا تقاضا ہوگا کہ "الميتة" سے پہلے لفظ "تناول" محذوف مانا جائے، تو عبارت یوں ہوگی: "حرمت عليکم تناول الميتة"۔

2- کبھی عرف عام سے محذوف کی تعیین کی جاتی ہے، جیسے: "اشتهر حاتم الطائي" (حاتم طائی بڑا مشہور ہوا): یعنی "في الجود والسخاء" (سخاوت وفیاضی میں) یہاں یہ محذوف اس لیے متعین کیا گیا کہ حاتم طائی عرف عام میں اسی اعتبار سے شہرت رکھتا ہے اور جیسے قرآن میں ہے: {فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ}(یوسف:32) (یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں)۔ یہاں "فيه" میں مضاف محذوف ہے: یعنی "في مراودته" (جس کے پھسلانے میں) اور یہ محذوف اس لیے متعین کیا گیا کہ عرف عام میں اس قسم کے واقعہ میں عورتوں کی ملامت اسی پھسلانے اور اپنی طرف مائل کرنے پر کی جاتی ہے۔

3- کبھی کسی کام کے شروع کرنے سے محذوف کی تعیین کی جاتی ہے، جیسے "بسم الله الرحمن الرحيم" یعنی جو کام بسم الله الرحمن الرحيم سے شروع کیا جائے وہی محذوف ہوگا، مثلا: بسم الله سے پڑھنا شروع کیا جائے تو مطلب ہوگا کہ "أقرأ بسم الله الرحمن الرحيم" (اللہ کے نام سے پڑھنا شروع کرتا ہوں) اور لکھنا شروع کیا جائے تو مطلب ہوگا کہ ''اللہ کے نام سے لکھنا شروع کرتا ہوں'' وغیرہ۔

4- کبھی اقتران واتصال سے محذوف کی تعیین کی جاتی ہے: یعنی کوئی کلمہ یا کلام کسی تقریب یا فعل سے متصل بولا جائے تو اس سے بھی محذوف کی تعیین ہو جاتی ہے، جیسے: "هنیئا لک" (تمہیں مبارک ہو) کہ اگر کسی تقریب یا شادی کے موقع پر بولا جائے تو مطلب ہوگا کہ ''تقریب مبارک ہو''، ''شادی مبارک ہو'' اور اگر کسی مہمان کی آمد پر کہا جائے تو مطلب ہوگا کہ ''آپ کا آنا مبارک ہو''۔اسی طرح عید کے موقع پر ''عید مبارک ہو'' وغیرہ۔

معلومات کی جانچ

1- مقصود کلام سے محذوف کی تعیین کا کیا مفہوم ہے؟

2- عرف عام سے محذوف کی تعیین کا کیا مفہوم ہے؟

3- اقتران واتصال سے محذوف کی تعیین کس طرح ہوتی ہے؟

12.9 اطناب اور اس کے مواقع

کسی فائدہ کے پیش نظر الفاظ کا معانی سے زائد ہونا ''اطناب'' کہلاتا ہے۔جیسے تاکید کے موقع پر یوں کہا جائے کہ ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا'' اور ''اپنے کانوں سے سنا'' اور ''اپنے ہاتھ سے لکھا''، ظاہر ہے کہ دیکھنا آنکھ ہی سے ہوتا ہے اور سننا کان ہی سے اور لکھنا ہاتھ ہی سے، لہذا ان جملوں میں آنکھ، کان اور ہاتھ کا ذکر زائد ہے؛ مگر چونکہ یہ اضافہ تاکید کے فائدہ کے لیے ہے، لہذا اسے اطناب کہا جائے گا اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {فَخَرَّ عَلَيۡهِمُ السَّقۡفُ مِن فَوۡقِهِمۡ} (النحل: ٢٦) (اور چھت ان پر ان کے اوپر سے گر پڑی)۔ظاہر ہے کہ چھت اوپر ہی سے گرتی ہے، لہذا ''من فوقهم'' کا ذکر زائد ہے اور یہ اضافہ تاکید کے لیے ہے اور جیسے: {رَبِّ إِنِّيۡ وَهَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّيۡ وَاشۡتَعَلَ الرَّأۡسُ شَيۡباً} (مریم: 4) (اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں بڑھاپے کے سبب کمزور ہو گئی ہیں اور سر کے بال سفید ہو گئے ہیں)۔کلام کی مراد یہ ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا، مگر تاکید کی غرض سے اسے طول دے دیا گیا ہے۔

اطناب کے مختلف مواقع ہوتے ہیں، مثلاً: مقصد کو سامع کے ذہن نشیں کرنا، مراد کو خوب واضح اور مؤکد کرنا، وہم اور غلط فہمی کو دور کرنا، حمیت اور غیرت کو بھڑکانا وغیرہ، چنانچہ صلح وصفائی، مدح وستائش، مذمت وہجو، وعظ وخطابت، ارشاد ونصیحت اور تہنیت ومبارک بادی وغیرہ کے موقع پر اطناب کا طریقہ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔

اور اگر الفاظ کی زیادتی بے فائدہ ہو اور وہ زیادتی متعین نہ ہو تو اسے ''تطویل'' کہا جاتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1- اطناب کسے کہتے ہیں اور اس کے مواقع کیا ہیں؟

2- تطویل کسے کہتے ہیں؟

12.10 اطناب کی صورتیں

12.10.1 ابہام کے بعد ایضاح

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے کسی بات کو مبہم ذکر کیا جائے اور پھر اس کی وضاحت کر دی جائے، تاکہ وہ بات سامع کے ذہن نشیں

ہو جائے، جیسے ''کیا ہی اچھا لڑکا ہے خالد'' یہاں پہلے اجمالاً کہا گیا کہ ''کیا ہی اچھا لڑکا ہے'' تو سامع کو شوق اور انتظار ہوا کہ وہ کون ہے؟ اب ''خالد'' سے اس کی وضاحت کر دی گئی کہ وہ خالد ہے، تو چونکہ یہ بات پہلے اجمال سے سامع کے شوق اور انتظار کے بعد حاصل ہوئی، لہذا یہ اس کے ذہن نشیں ہو جائے گی اور جیسے قرآن میں ہے: {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ، تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ}(الصف: 11-10) (اے ایمان والو! تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے، وہ یہ کہ خدا پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو)۔

آیت کے شروع میں ابہام ہے، کہ وہ کیسی تجارت ہے جو دردناک عذاب سے بچا لے گی؟ تو "تؤمنون بالله إلخ" سے اس ابہام کی وضاحت کی گئی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور اپنے جان و مال سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا ہے۔

12.10.2 عام کے بعد خاص کا ذکر

عام شیئ کو بیان کرنے کے بعد خاص شیئ کو ذکر کیا جائے، تا کہ اس خاص کی فضیلت اور اہمیت کا اظہار ہو سکے، جیسے قرآن میں ہے: ''شب قدر میں فرشتے اترتے ہیں اور جبرئیل امین بھی''۔ یہاں ''فرشتے'' عام ہے، اس کے بعد اظہار فضیلت کے لیے ''جبرئیل امین'' خاص کو ذکر کیا گیا اور جیسے قرآن سے ہی یہ دوسری مثال: {حَافِظُواْ عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَّلاَةِ الْوُسْطَى}(البقرة: 238) (مسلمانو! سب نمازیں خصوصاً بیچ کی نماز) یعنی نماز عصر پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔ آیت کریمہ میں "الصلوات" عام ہے، جس میں "الصلوٰۃ الوسطیٰ" (نماز عصر) داخل ہے، مگر اس کی فضیلت اور اہتمام کے پیش نظر عام کے بعد خاص کر اس کو ذکر کیا گیا۔

12.10.3 خاص کے بعد عام کا ذکر

خاص شیئ کو ذکر کرنے کے بعد، عام شیئ کو بیان کیا جائے تا کہ خاص کے اہتمام کے ساتھ بقیہ عام افراد کی شمولیت ہو سکے، جیسے: ''محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیائے کرامؑ، سب اللہ کے برگزیدہ بندے تھے''۔ یہاں ''محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم'' خاص ہے، جس کے بعد ''دیگر انبیائے کرامؑ'' عام کو ذکر کیا گیا ہے، جس میں وہ خاص بھی داخل ہے، پس خاص کے اہتمام کے پیش نظر اس کا دوبارہ ذکر ہوا اور حکم عام کے بقیہ افراد کو شامل ہوا اور جیسے قرآن میں ہے: {رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِناً وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ}(نوح: 28) (اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو ایمان لا کر میرے گھر میں آئے اس کو اور تمام ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو معاف فرما)۔ یہاں "المؤمنين والمؤمنات" عام ہے، جس میں وہ سب داخل ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے ہوا ہے۔

12.10.4 اعتراض

اس کا مطلب یہ ہے کہ اثنائے کلام یا آخر کلام میں ایک، یا ایک سے زائد جملہ معترضہ لایا جائے، جس کی غرض کبھی تنزیہہ و تقدیس ہوتی ہے، جیسے ''اللہ تبارک و تعالیٰ بڑا مہربان ہے''، یہاں ''تبارک و تعالیٰ'' جملہ معترضہ ہے، جو تنزیہہ و تقدیس کے لیے بڑھایا گیا ہے اور جیسے قرآن میں ہے: {وَيَجْعَلُونَ لِلهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ وَلَهُم مَّا يَشْتَهُونَ}(النحل: ۵۷) (اور یہ لوگ خدا کے لیے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں، وہ ان سے پاک ہے اور اپنے لیے بیٹے، جو انہیں مرغوب و دل پسند ہیں)۔ آیت کریمہ میں ''سبحانہ'' جملہ معترضہ ہے، جس کی غرض تنزیہہ و تقدیس ہے۔

کبھی غرض تعریف وتوصیف ہوتی ہے، جیسے قرآن میں ہے: {وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ}(آل عمران: 178) (اور کہنے لگے ہم کو خدا کافی ہے اور بہت اچھا کارساز ہے)۔ یہاں "ونعم الوکیل" جملہ معترضہ ہے، جس کی غرض تعریف وتوصیف ہے، اس جملہ کا ماقبل پر عطف نہیں۔

12.10.5 ایغال

اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کے آخر میں کسی نکتہ کے پیش نظر ایسے الفاظ لائے جائیں جن کے بغیر بھی کلام کا اصل مطلب حاصل ہو رہا ہو، جیسے قرآن میں ہے: {وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ}(البقرۃ:212) (اور خدا جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے)۔ اس مثال میں "بغیر حساب" کے بغیر بھی جملہ مکمل ہے۔

12.10.6 تکرار

یعنی کلام میں کوئی لفظ مکرر لایا جائے، جس کا مقصد کبھی تاکید ہوتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ، ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ} (التکاثر: 4-3) (دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، پھر دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا)۔ آیت پاک میں ہر ہر لفظ مکرر ہے، جس کا مقصد تاکید کے ساتھ قیامت کی ہولناکی سے ڈرانا ہے۔

کبھی تکرار کا مقصد سامع کو ذہن نشیں کرانا ہوتا ہے۔ جیسے "خوشی کے بعد غم اور غم کے بعد خوشی ہوتی ہے" اور جیسے قرآن میں ہے: {فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً}(الشرح: 6-5) (ہاں ہاں مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے اور بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے)۔ یہاں "عسر" اور "یسر" کی تکرار سامع کو ذہن نشیں کرانے کے لیے ہے۔

کبھی تکرار کا مقصد استیعاب کا ارادہ ہوتا ہے۔ جیسے "میں نے اس کتاب کو لفظ لفظ پڑھا اور حرف حرف سمجھا" یعنی پوری کتاب پڑھ لی اور سمجھ لی۔

کبھی تکرار کا مقصد قبول نصیحت کی رغبت دلانا ہوتا ہے۔ جیسے "میرے بیٹے! جھوٹ مت بولو، میرے بیٹے! میں تمہیں خیر خواہی کی نصیحت کر رہا ہوں" ظاہر ہے کہ "میرے بیٹے" کی تکرار سے نصیحت قبول کرنے کی رغبت ہوگی اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {وَقَالَ الَّذِیْ آمَنَ یَا قَوْمِ اتَّبِعُوْنِ أَهْدِکُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ، یَا قَوْمِ إِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیَاةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ}(غافر: 39-38) (اور وہ شخص جو مومن تھا، اس نے کہا کہ بھائیو! میرے پیچھے چلو، میں تمہیں بھلائی کا راستہ دکھاؤں، بھائیو! یہ دنیا کی زندگی چند روزہ فائدہ اٹھانے کی چیز ہے اور جو آخرت ہے وہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے)۔ آیت کریمہ میں "یاقوم" مکرر ہے، جس کا مقصد قبول نصیحت کی رغبت دلانا ہے۔

12.10.7 تکمیل یا احتراس

اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں خلاف مقصود کا شبہ ہو، جسے دور کرنے کے لیے کچھ زیادتی کر دی جائے، جیسے قرآن میں ہے: {وَأَدْخِلْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَاءَ مِنْ غَیْرِ سُوْءٍ}(النمل: 12) (اور اپنا ہاتھ اپنے گریباں میں ڈالو، سفید نکلے گا بغیر کسی مرض کے)۔ آیت کریمہ میں "بیضاء" سے مرض برص کی سفیدی کا شبہ تھا، لہذا "من غیر سوء" زائد کر کے اس شبہ کو دور کر دیا گیا۔

12.10.8 توشیع

اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں تثنیہ کا صیغہ لایا جائے اور پھر اس کی تفسیر دو مفرد کے ذریعہ بہ صورت عطف کردی جائے۔ جیسے "**العلمُ علمان: علمُ الأبدانِ وعلمُ الأديانِ**" (علم تو دو علم ہے: علم ابدان اور علم ادیان)، یہاں پہلے "**علمان**" تثنیہ لایا گیا اور پھر دو مفرد "**علم الأبدان وعلم الأديان**" سے بہ صورت عطف اس کی تفسیر کردی گئی۔

12.10.9 تتمیم

اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں خلاف مقصود کا شبہ نہ ہو اور محض کسی نکتہ کے پیش نظر الفاظ زائد کردیے جائیں، جیسے قرآن میں ہے: {**وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً**}(الإنسان: 8) (اور باوجودیکہ ان کو خود طعام کی خواہش ہے، فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلا دیتے ہیں)۔ آیت کریمہ میں خلاف مقصد کا کوئی وہم نہیں، لہذا "**علی حبه**" کی زیادتی محض سخاوت وایثار میں مبالغہ کرنے کے لیے ہے، کہ کھانے کی چاہت واشتہا کے باوجود اسے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

12.10.10 تذییل

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک جملہ کے بعد اس کے ہم معنی دوسرا جملہ تاکید کی غرض سے ذکر کیا جائے، جیسے قرآن میں ہے: {**وَقُلْ جَاء الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقاً**}(الإسراء: 81) (اور کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل نابود ہوگیا، بے شک باطل نابود ہونے والا ہے)۔ آیت کریمہ میں "**إن الباطل كان زهوقاً**"، "**وزهق الباطل**" کی تاکید ہے، کیونکہ دونوں ہم معنی ہیں۔

تذییل کی دو قسمیں ہیں:

اول یہ کہ دوسرا جملہ "ضرب المثل" کے طور پر ہو۔

دوم یہ کہ دوسرا جملہ "ضرب المثل کے طور پر نہ ہو۔ جیسے قرآن میں ہے: {**وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللّهِ أَلاَ بِذِكْرِ اللّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ**}(الرعد: 28) (اور جن کے دل یاد خدا سے آرام پاتے ہیں اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں)۔ آیت کریمہ میں دونوں جملے ہم معنی ہیں، لہذا دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ضرب المثل کے طور پر مستعمل نہیں۔

12.10.11 ایک وضاحت

واضح رہے کہ ایجاز واطناب کی مذکورہ صورتوں کے علاوہ کبھی کلام میں نسبتاً حروف کی قلت وکثرت کے اعتبار سے بھی ایجاز واطناب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے: یعنی دو کلام اصل مطلب کے ادا کرنے میں مساوی ہوں؛ مگر ایک میں بہ نسبت دوسرے کے حروف زیادہ ہوں، تو جس میں زیادہ حروف ہیں اس میں اطناب ہوگا اور جس میں کم حروف ہیں اس میں ایجاز ہوگا۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {**أَوْفُواْ الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلاَ تَبْخَسُواْ النَّاسَ أَشْيَاءهُمْ وَلاَ تَعْثَوْاْ فِي الأَرْضِ مُفْسِدِينَ**}(هود: 85) (ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں خرابی کرتے نہ پھرو)۔ {**فَأَوْفُواْ الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلاَ تَبْخَسُواْ النَّاسَ أَشْيَاءهُمْ وَلاَ تُفْسِدُواْ فِي الأَرْضِ بَعْدَ إِصْلاَحِهَا**}(الأعراف: 85) (تو تم ناپ اور تول پوری کیا کرو اور لوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ

کرو)۔ظاہر ہے کہ دونوں آیتیں ہم معنی ہیں،مگر پہلی آیت میں بہ نسبت دوسری کے حروف زائد ہیں،لہذا پہلی میں اطناب اور دوسری میں ایجاز ہوگا۔

معلومات کی جانچ

1- تذییل اور احتراس کا کیا مفہوم ہے؟

2- توشیع اور تتمیم کا کیا مفہوم ہے؟

3- ایغال اور تکرار کسے کہتے ہیں؟

12.11 اکتسابی نتائج

کسی مفہوم کی ادائیگی مساوی الفاظ سے کرنا ''مساوات'' کہلاتا ہے،کم لفظوں میں ایک وسیع جہانِ معنی کو سمیٹ لینا: یعنی ادائیگئ مراد کے لیے جتنے الفاظ ضروری تھے،ان سے کم ہی استعمال کیے جائیں؛مگر یہ اتنے واضح اور جامع ہوں کہ ادائیگئ مراد کے لیے کافی ہوجاتے ہوں تو اسے ''ایجاز'' کہتے ہیں،ایجاز کی دو قسمیں ہیں:(1)ایجاز قصر (2)ایجازِ حذف، پھر حذف کی دو قسمیں ہیں: اول: یہ کہ محذوف کے قائم مقام کوئی چیز نہ ہو، بلکہ کسی قرینہ سے وہ سمجھا جائے۔دوم: یہ کہ کوئی چیز محذوف کے قائم مقام ہو۔جب کلام میں کچھ حذف ہو،تو اس حذف کا پتہ لگانا، نیز محذوف کو متعین کرنا ضروری ہوتا ہے،تاکہ کلام کی مراد پوری طرح واضح ہوسکے، چنانچہ کچھ حذف ہے،اس کا پتہ تو عقل سے چلتا ہے اور کیا حذف ہے اس کا پتہ کبھی تو مقصود کلام سے ہوتا ہے،کبھی عرف عام سے،کبھی کسی کام کے شروع کرنے سے اور کبھی اقتران واتصال سے۔

کسی فائدہ کے پیش نظر الفاظ کا معانی سے زائد ہونا ''اطناب'' کہلاتا ہے،اطناب کے بھی مختلف مواقع ہوتے ہیں،مثلاً: مقصد کو سامع کے ذہن نشیں کرنا،مراد کو خوب واضح اور مؤکد کرنا،وہم اور غلط فہمی کو دور کرنا،حمیت اور غیرت کو بھڑکانا وغیرہ، چنانچہ صلح وصفائی،مدح وستائش،مذمت وہجو،وعظ وخطابت،ارشاد ونصیحت اور تہنیت ومبارک بادی وغیرہ کے موقع پر اطناب کا طریقہ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔

اطناب کی دس صورتیں ہیں: ابہام کے بعد ایضاح، عام کے بعد خاص کا ذکر،خاص کے بعد عام کا ذکر،اعتراض،ایغال،تکرار،تکمیل یا احتراس،توشیع،تتمیم اور تذییل۔

12.12 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں ۔

1- مساوات،ایجاز اور اطناب کی تعریف کریں۔

2- حذف کی علامتوں پر مفصل نوٹ لکھیے۔

3- ایجاز کے محرکات اور اس کے مواقع کیا ہیں؟ وضاحت کریں۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1- ایجاز کی اقسام کو تفصیل سے لکھیں۔

2- اطناب کی صورتوں میں سے شروع کی پانچ صورتوں کی وضاحت کریں۔

3- اطناب کی صورتوں میں سے اخیر کی پانچ صورتوں کی وضاحت کریں۔

12.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1-	**مختصر المعاني**	سعدالدین تفتازانی
2-	**علم المعاني**	عبدالعزیز عتیق
3-	**البلاغة فنونها وأفنانها (علم المعاني)**	فضل حسن عباس
4-	**دروس البلاغة**	مشترکہ تصنیف: حفنی ناصف، محمد دیاب، سلطان محمد، مصطفی طمّوم
5-	**البلاغة الواضحة**	مشترکہ تصنیف: علی الجارم و مصطفی امین

اکائی 13 علم البدیع کا ارتقا

اکائی کے اجزا

13.1 تمہید
13.2 مقصد
13.3 علم البدیع کی تعریف
13.3.1 علم البدیع کی لغوی تعریف
13.3.2 علم البدیع کی اصطلاحی تعریف
13.4 علم البدیع کا آغاز
13.5 علم البدیع کے اہم مؤلفین اوران کی کاوشیں
13.5.1 ابن المعتز
13.5.2 قدامة بن جعفر
13.5.3 أبو هلال العسكري
13.5.4 ابن رشيق القيرواني
13.5.5 الجرجاني والزمخشري
13.5.6 أسامة بن منقذ
13.5.7 الرازي
13.5.8 السكاكي
13.5.9 ابن الأثير
13.5.10 أحمد التيفاشي وزكي الدين المصري
13.5.11 ابن مالك الأندلسي
13.5.12 يحي بن حمزه
13.5.13 محمد التنوخي

13.6 بدیعیات کے اہم شعرا اور ان کی کاوشیں

13.6.1 **علي الإربلي**

13.6.2 **صفي الدين الحِلّي**

13.6.3 **ابن جابر الأندلسي**

13.6.4 **دیگر اصحاب بدیعیات**

13.7 اکتسابی نتائج

13.8 امتحانی سوالات کے نمونے

13.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

13.1 تمہید

علم البدیع علم بلاغت کی اہم شاخ ہے، اس اکائی میں اسی پر گفتگو کی جائے گی اور یہ بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ کلام کو مختلف لفظی یا معنوی خوبیوں سے آراستہ کرنے کو علم بدیع یا بدائع اور صنائع کہتے ہیں۔ اس علم سے کلام کو مزین کرنے اور خوش نما بنانے کا سلیقہ آتا ہے، یعنی اس علم کی بدولت سجع، تجنیس، ترصیع، توریہ اور اسی قبیل کے دوسرے محاسنِ کلام کے ذریعہ کلام کو آراستہ کیا جاتا ہے، یہ وہ علم ہے جس کی بدولت یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام یا تحریر میں شستگی اور شگفتگی کس طرح پیدا ہوتی ہے، اس مقصد کے لیے اپنائے گئے تمام طریقوں کو صنائع یا محسنات کہا جاتا ہے اور یہ طریقے صرف حسن کلام کے لیے اپنائے جاتے ہیں یعنی ان کے استعمال نہ کرنے سے کلام کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر انہیں استعمال کیا جائے تو کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور یہ کہ اس علم میں دو چیزیں موضوع بحث ہوتی ہیں: (1) محسّنات لفظیہ (صنائع لفظی) (2) محسّنات معنویہ (صنائع معنوی)، محسنات لفظیہ یعنی وہ طریقے جن سے لفظی خوب صورتی پیدا کی جائے اور محسنات معنویہ یعنی وہ طریقے جن سے معنوی خوب صورتی پیدا کی جائے، نیز اس علم کی تعریف،، اس کے آغاز، نشو ونما اور اس کے اہم مؤلفین اور ان کی علمی کاوشوں سے واقف ہو سکیں گے۔

13.2 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ یہ جان سکیں گے کہ علم البدیع کیا ہے؟ لفظی یا معنوی اعتبار سے جملوں اور عبارتوں میں کیا محاسن ہوتے ہیں؟ کلام میں لفظی اور معنوی خوبیاں پیدا کرنے کے لیے علمائے بلاغت نے کیا طریقے بتائے ہیں؟ محسنات لفظیہ اور محسنات معنویہ کسے کہتے ہیں؟ علم البدیع کا آغاز کیونکر ہوا؟ اس کی نشو ونما کس طرح ہوئی؟ نیز اس موضوع پر اہم کتابوں کے مختصر تعارف اور ان کے مؤلفین کے مختصر حالات سے بھی واقف کرایا جائے گا، اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ بلاغت کے اس تیسرے اہم شعبہ کی اہمیت اور اس کے ماہرین کی خدمات کی نوعیت، خصوصیات اور ان میں سے بعض پر اہل علم کی تنقیدی آرا سے واقف ہو سکیں گے۔

13.3 علم البدیع کی تعریف

13.3.1 علم البدیع کی لغوی تعریف

عربی لغت میں بدیع کا لفظ ''بدع الشيء يبدعه بَدعا'' سے بنا ہے، جو باب ''فتح'' سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو ایجاد کرنا، اس کو شروع کرنا، بلا نمونہ نئی چیز بنانا، اسی سے ہے: ''ابتدعه'' یا ''أبدعه'' یعنی کوئی نئی چیز جاری کرنا، نئی بات پیدا کرنا، ایجاد کرنا، ''بدع'' اگر دال کے پیش کے ساتھ باب ''کرم'' سے ہو تو اس سے مصدر آتا ہے ''بداعة اور بدوعا'' یعنی انوکھا ہونا یا بے مثال ہونا، اس سے فعیل کے وزن پر صفت کا صیغہ بنایا جائے تو معنی ہوتے ہیں: نیا، نادر، انوکھا اور بے مثال، باب ''فتح'' سے اسی وزن پر ہو تو اس کے معنی موجد یعنی نئی چیز بنانے والا، یہاں فعیل اسم فاعل کے معنی میں ہے، اگر اس کو اسم مفعول کے معنی میں لیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے نئی چیز، ایجاد کردہ شئے، اس کی جمع بدائع آتی ہے، کہتے ہیں: ''هذا من البدائع'' (یہ انتہائی عجیب ہے)۔

بِدع اور بدعةً بھی اسی سے بنا ہے، اول الذکر کے معنی انوکھا، نیا، پہلے پہل کیا جانے والا کام، قرآن مجید میں ہے: ''قل ما كنتُ بِدعاً من الرسل'' (الاحقاف: ۹) (آپ کہہ دیجیے میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں یعنی مجھ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے گئے ہیں میں پہلی بار نہیں بھیجا

گیا) اور ثانی الذکر کے معنی بدعت یا کسی نمونہ کے بغیر بنی ہوئی چیز، جیسا کہ ذکر ہوا بدیع مُبدِع کے معنی میں بھی ہوتا ہے یعنی موجد، ''البدیع'' اسمائے حسنی میں سے بھی ایک ہے؛ چونکہ وہی ذات ہے جو ہر چیز کو بغیر کسی نمونہ کے پیدا کرنے پر قادر ہے، قرآن مجید میں ہے: ''**بدیع السموات والأرض**'' (البقرۃ: ۱۱۷) (وہ آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والا ہے یعنی وہی ان کا خالق اور بغیر کسی نمونہ کے پیدا کرنے والا ہے) یعنی بدع کا مادہ عربی زبان میں نئے، انوکھے، عجیب اور بے مثال جیسے معنی کو بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

13.3.2 علم البدیع کی اصطلاحی تعریف

جہاں تک بدیع کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے جو اہل بلاغت کے یہاں رائج ہے تو وہ اس کے لغوی معنی سے قریب تر ہے، ابتدا میں تو یہ لفظ شاعری کے اس خاص اسلوب بیان کے لیے بولا جاتا تھا جو کلاسیکی دور کے بعد سے تعلق رکھنے والے متأخرین شعرا جیسے مسلم بن ولید (وفات: 208ھ)، بشار بن برد (وفات: 168ھ) اور ابوتمام (وفات: 231ھ) وغیرہ نے اختیار کیا تھا، جن میں سے ہر ایک کو ''شاعر مُوَلَّد'' کہتے ہیں، اور اس پوری جماعت کو ''**المولّدون من الشعراء**'' کہا جاتا ہے، پھر کلام کے محاسن اور ادب کی ممتاز خصوصیات کے لیے اس کا استعمال کیا جانے لگا، جو چیز بھی کلام میں کوئی حسن، چاشنی اور شگفتگی پیدا کردے اس کو بدیع کہا جانے لگا، لیکن متأخرین علمائے بلاغت نے ان ضوابط کی تحدید کردی جو کلام کو خوب صورت بناتے ہیں یا اس کو مزین کردیتے ہیں اور اس طرح علم بدیع کی یہ تعریف کردی: ''**علم یعرف به وجوہ تحسین الکلام بعد مطابقته لمقتضی الحال مع وضوح دلالته علی المراد لفظا و معنی**۔'' (وہ علم جس سے تحسین کلام کے ضوابط معلوم ہوں جب کہ اس میں مقتضائے حال کی رعایت بھی کی گئی ہو اور اپنی مراد پر لفظی ومعنوی دونوں اعتبار سے اس کی دلالت واضح ہو)، اس سے معلوم ہوا کہ علم بدیع کا تعلق پیشکش کی خوب صورتی سے ہوتا ہے اور معانی وبیان کا تعلق جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں حسن ذاتی سے ہوتا ہے۔

یہ وہ تعریف ہے جو متأخرین علمائے بلاغت نے اختیار کی ہے جب کہ سراج الدین سکاکی (وفات: 626ھ) کے ذریعہ اس علم نے اپنی آخری شکل اختیار کرلی اور اس کا ایک مخصوص قالب تیار ہوگیا، لغوی اور اصطلاحی معنی کی روشنی میں درج ذیل باتیں واضح ہوجاتی ہیں:

1- اس مادہ کے لغوی معنی میں فنون وآداب میں جدت وندرت پیدا کرنے اور نقالی سے محفوظ رہنے کی کوشش شامل ہے، دوسرے لفظوں میں یہ لفظ پامال راستوں پر چلنے کی بجائے علم وتحقیق میں نئی راہیں نکالنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

2- قدیم شعر وادب میں بھی ہمیں یہ لفظ ایک مخصوص اسلوب بیان کے لیے مستعمل نظر آتا ہے۔

3- بدیع کے لغوی معنی اور محسنات بدیعیہ پر اس کے استعمال میں ایک واضح مناسبت اور ہم آہنگی موجود ہے؛ اس لیے کہ کوئی بھی تروتازہ اور انوکھی شئے خوب صورتی اور کشش سے خالی نہیں ہوتی، اسی طرح کلام کی وہ قسمیں جن کے لیے بعد کے علمائے بلاغت نے بدیع کی تعبیر اختیار کی ظاہری ومعنوی خوب صورتی اور کشش سے خالی نہیں ہوتی ہیں۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ وہ علم ہے جس کی بدولت یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام، گفتگو یا تحریر میں خوب صورتی کیسے پیدا کی جاسکتی ہے؟ کلام کی آرائش وزیبائش کن طریقوں سے ہوتی ہے؟ یہ وہ علم ہے جو کلام کے حسن وجمال، زیب وزینت اور اس کی خوبیوں سے بحث کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اپنائے گئے تمام طریقوں کو صنائع یا محسنات کہا جاتا ہے اور یہ صرف حسن کلام کے لیے استعمال کی جاتی ہیں یعنی ان کے

استعمال نہ کرنے سے کلام کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر انہیں استعمال کیا جائے تو کلام کا حسن دوبالا ہو جائے۔

یہ صنائع یا صنعتیں بنیادی طور پر دو طرح کی ہوتی ہیں:

الف - صنائع لفظی   ب - صنائع معنوی

علم بدیع اگرچہ لفظی و معنی خوبیاں پیدا کرتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ کلام میں صنائع بدائع کا استعمال ایک حد تک ہو اور ان کے بے جا استعمال سے گریز کیا جائے، کلام میں انواعِ بدیع کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کھانے میں نمک یا حسین کے گال پر تل، جب تک معتدل رہے تو بہتر ثابت ہو، جب حد سے بڑھ جائے تو برا ثابت ہو اور اس کی کثرت سے طبیعتیں اکتا جاتی ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- بدیع کی لغوی تعریف کیا ہے؟

2- بدیع کی اصطلاحی تعریف کیا ہے؟

3- ان دونوں تعریفات سے ہمیں کیا اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں؟

13.4 علم البدیع کا آغاز

بدیع کی بحث کے آغاز میں ہم اس علم کے پس منظر کو دیکھتے ہیں، جس سے اس کے معرض وجود میں آنے کے اسباب و محرکات کی واقفیت کے ساتھ ساتھ ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ اس علم کے باضابطہ طور پر سامنے آنے سے قبل عرب ادبا و شعرا کے یہاں اس کا تذکرہ کس شکل میں ملتا ہے، اس سے اس علم کے مباحث کے صحیح فہم اور مذاق سلیم کو تشکیل دینے میں مدد ملے گی، اس علم کی اہمیت و وقعت کے سلسلہ میں اگرچہ ادیبوں اور ناقدین کی آرا مثبت و منفی دونوں طرح کی ہیں؛ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عربی زبان کی بلاغت کی مضبوط اور پر شکوہ عمارت اس کے بغیر پر کشش اور جاذب نظر نہیں ہو سکتی، اس طرح اسے انسانی کلام کا ایک اہم عنصر تسلیم کرنا ناگزیر ہوتا ہے خواہ یہ خود بخود کلام میں آ جائے یا بہ تکلف لایا جائے، آمد ہو یا آورد۔

بعض ناقدین کسی شعری یا نثری ادبی نمونہ کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ علم بدیع کی ترجیحات کے اعتبار سے بھی اس کا جائزہ لیں، ان کا خیال ہے کہ عبارت اور تعبیر کی جمالیات اس کی محتاج نہیں، حالانکہ ایسا نہیں، اگر سنجیدگی کے ساتھ ایک باذوق ناقد کسی ادب کا جائزہ لیتا ہے تو اسے اس پہلو سے بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس میں کس حد تک لفظی اور معنوی صنائع و بدائع کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں کچھ عباسی دور میں اور پھر اس کے بعد کے زمانہ میں مسجع و مقفی جملوں کے استعمال اور عبارت آرائی کی کثرت نظر آتی ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دقیق معانی کی مختصر اور سادہ انداز میں ادائیگی کا ملکہ کم ہوتا جا رہا تھا، اسی وجہ سے عباسی دور کے بعد ادبی تخلیقات کا معیار بھی گرتا گیا؛ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ اس علم کا قصور نہیں، بلکہ اس کے بے جا استعمال کرنے والوں کی کمی ہے جنھوں نے بے محل لفاظی اور معنوی سقم کے باوجود الفاظ کی بازی گری کا راستہ اختیار کیا؛ اس لیے ہم کسی ادبی شاہکار کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے، جب کہ اس میں بے جا تکلف سے کام نہ لیا گیا ہو، ابو ہلال عسکری (وفات: 395ھ) کہتے ہیں: ''**إن هذا النوع من الكلام إذا سلم من التكلف وبرئ من العيوب كان في غاية الحسن ونهاية الجودة**'' (اس قسم کا کلام اگر تکلف سے محفوظ اور عیوب سے آزاد ہو تو وہ اپنے اندر اعلی درجہ کی جمالیاتی خوبیاں رکھتا ہے)۔

جاہلیت کے زمانہ میں بلاغت کی اکثر اقسام کو برتا جاتا تھا، ان میں بدیع کی نزاکتوں کی رعایت بھی داخل ہے؛ لیکن اس زمانہ کے شعرا ان کو ان ناموں سے نہیں جانتے تھے جو آج ہمارے درمیان معروف ہیں، عین اسی طرح جیسے وہ زبان کے اپنے فطری ملکہ کی بنیاد پر فاعل کو مرفوع اور مفعول کو منصوب استعمال کرتے تھے، جب کہ اس وقت نحو کے ماہرین سامنے نہیں آئے تھے جنھوں نے فاعل اور مفعول کے قواعد وضع کیے۔ اسلام کی آمد کے بعد عربی زبان کے ماہرین نے بلاغت پر خصوصی توجہ دی اور خاص طور سے بدیع کا خاصا اہتمام برتا اور ان کا سب سے بڑا مقصد اس علم سے قرآن کریم کے ادبی اعجاز کے اسرار و رموز سے واقف ہونا تھا۔ ہمیں بدیع کی جھلکیاں سب سے پہلے عباسی شاعر صریع غوانی مسلم بن ولید انصاری (وفات: 208ھ) کے یہاں ملتی ہیں، جسے مدح سرائی میں بڑا کمال حاصل تھا اور اس نے عباسی دور کے ایک عسکری قائد یزید بن مزید (وفات: 185ھ) کی تعریف میں اشعار کہے تھے، اس شاعر نے بیان کی بعض صورتوں اور صنائع و بدائع کے لیے جناس اور طباق جیسی آج بدیع کے تحت آنے والی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد ہمیں اس میدان میں جاحظ (وفات: 255ھ) نظر آتے ہیں، چنانچہ جاحظ نے اپنی کتاب ''البیان و التبیین'' میں جابجا متعدد ادبی موضوعات کے ساتھ ساتھ بلاغت سے متعلق مختلف مباحث کا ذکر کیا ہے، انھوں نے بدیع کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: ''بدیع کے موجد عرب ہیں، اس لیے عربی زبان دوسری زبانوں سے فائق ہے اور ہر زبان پر حاوی ہے، شاعر عبید بن معاویہ الراعی کی شاعری میں کثرت سے بدیع کے نمونے ہیں، بشار بھی بدیع کے تقاضوں کو برتنے میں بڑا ماہر ہے اور عتابی اس میدان میں بشار کا مقلد ہے''، جاحظ کے یہاں بدیع کے تمام مسائل نہیں ملتے بلکہ شعر و نثر کے اندر پائی جانے والی لفظی اور معنوی خوبیوں کا اجمالی اشارہ ملتا ہے، اس نے اس مقصد کے لیے اصطلاحات یا قواعد وضع نہیں کیے بلکہ اس کے نمونے اور اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- بدیع کا آغاز کس طرح ہوا؟

13.5 علم البدیع کے اہم مؤلفین اور ان کی کاوشیں

13.5.1 ابن المعتز

شاید کہ علم بدیع کے میدان میں اولین سنجیدہ کاوش ایک ایسے عباسی حکمراں کے حصہ میں آئی جو صرف ایک دن اور ایک رات حکمرانی کر سکے اور پھر ان کو قتل کر دیا گیا، یہ 296ھ کا واقعہ ہے۔ یہ خلیفۂ عباسی ابو العباس عبداللہ بن معتز بن متوکل بن معتصم بن ہارون رشید ہیں، جو 247ھ میں پیدا ہوئے، شاعری کا فطری ذوق پایا تھا، سہل ممتنع کے پابند تھے، الفاظ کو ان کے حسب حال برتنے کا سلیقہ رکھتے تھے، معنی میں جدت پیدا کرنا اور بدیع کی نازک بیانیوں سے اپنے شعر کو سجانا، سنوارنا اور نکھارنا ان کا خاص وصف تھا، اس دور کے ممتاز علما و ادبا میں ان کا شمار تھا، مختلف فنون میں دس سے زائد کتابیں تصنیف کی تھیں، جن میں ہمیں یہ چار ملتی ہیں:

1-دیوان ابن المعتز۔ 2-طبقات الشعراء۔ 3-فصول التماثیل في تباشیر السرور۔ 4-کتاب البدیع۔

اگر ہم عبدالقاہر جرجانی (وفات: 471ھ) کو علم بیان اور علم معانی کا بانی قرار دیتے ہیں تو بلا تکلف ابن معتز کو علم بدیع کا بانی قرار دے سکتے ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی تصنیف ''کتاب البدیع'' ہے، کتاب کا نام اور اس کی مشمولات سے بھی صاف اس کا اظہار ہوتا ہے، انھوں

نے یہ کتاب سن 274ھ میں تصنیف کی تھی، بعض تحریروں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب اپنے ان ہم عصر ناقدین کی تردید میں لکھی تھی جن کا دعویٰ تھا کہ بشار بن برد (وفات:168ھ)، صریع غوانی مسلم بن ولید انصاری (وفات:208ھ) اور ابونواس (وفات:198ھ) وہ شعرا ہیں جنھوں نے پہلی بار اپنے اشعار میں بدیع کا استعمال کیا؛ چنانچہ وہ اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں: ''ہم نے اپنی اس کتاب کے ابواب میں قرآن، زبان، احادیث رسول، کلام صحابہ، اعرابیوں (عرب کے بدوؤں) کی گفتگو اور متقدمین کے اشعار میں سے ایسا کلام پیش کیا ہے جس کو بعد کے شعرا بدیع کہنے لگے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ بشار، مسلم اور ابونواس اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے شعرا اس فن کے موجد نہیں ہیں، بلکہ چونکہ ان کی تخلیقات میں اس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے اس لیے اس دور میں کلام کی خوب صورتی اور رعنائی کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگا''۔

اس کے بعد انھوں نے ابوتمام حبیب بن اوس طائی (وفات:231ھ) کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اس کو زیادہ تر اچھی طرح برتا اور کہیں اس کی نزاکتوں کا خیال نہ رکھ سکے اور ان کے کلام میں تصنع پیدا ہو گیا، نیز انھوں نے عباسی دور کے مشہور ادیب اور شاعر صالح بن عبدالقدوس بصری (وفات:167ھ) کا تذکرہ کیا ہے کہ عربی کے ضرب الامثال میں اس نے بدیع کو نہایت خوب صورتی سے برتا ہے، اگر وہ ضرب الامثال کو اپنے اشعار میں جگہ دے پاتے تو اس موضوع پر اپنے ہم عصروں سے بہت آگے نکل جاتے۔ اپنی اس کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ متقدمین کے یہاں اس کے نمونے موجود ہیں، اس کا سہرا بعد کے شعرا کے سر باندھنا ناانصافی کی بات ہوگی''۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''مجھ سے پہلے کسی نے بدیع کی تمام اصناف کو یکجا نہیں کیا''۔

اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں جن میں ابن معتز بدیع کے بنیادی اصول بیان کرتے ہیں، جن کو وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق بدیع کے اصول کبریٰ قرار دیتے ہیں اور وہ ہیں: **الاستعارة، الجناس، المطابقة، ردّ إعجاز الكلام على ما تقدمها**، پانچویں باب کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ جاحظ نے اس کو ''**المذهب الكلامي**'' کہا ہے، مذہب کلامی یہ ہے کہ ایک ایسا ادیب جو بلاغت میں مہارت رکھتا ہو اپنے دعویٰ کی صحت اور اپنے فریق مخالف کے دعویٰ کی تردید میں علمائے علم کلام کی طرح عقلی دلیل بیان کرے، جیسے قرآن مجید میں ہے کہ آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو ان دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا لیکن جب یہ دونوں باقی ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ یہ قسم اب بدیع میں رائج نہیں۔ ابن معتز نے جاحظ (وفات:255ھ) اور اصمعی (وفات:216ھ) کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان کے یہاں بھی جناس کے بعض مباحث ملتے ہیں، ابن معتز نے ان پانچ کے علاوہ بدیع کے مزید 13 مباحث اور ذکر کیے ہیں، اس طرح ان کے یہاں ہمیں بدیع کے علم میں کل 18 مباحث کا تذکرہ نظر آتا ہے۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ ابن معتز پہلے مؤلف ہیں جنھوں نے علم بدیع کو بلاغت کے دو اور علوم بیان اور معانی سے ممتاز کر کے بیان کیا اور اس کو مستقل حیثیت سے پیش کیا اور اس طرف توجہ دلائی کہ بدیع جاہلیت اور ابتدائے اسلام کے ادوار میں رائج رہا، لیکن اس کا استعمال کلام میں جا بجا تصنع اور تکلف کے بغیر آ گیا ہے جب کہ بعد کے شعرا نے قصد و ارادہ سے اس کو اپنے کلام میں جگہ دینے کی کوشش کی؛ اس لیے بسا اوقات اس میں حسن پیدا ہونے کی بجائے سقم پیدا ہو گیا ہے، اسی طرح ابن معتز نے پہلی بار بدیع کی مختلف قسموں کے لیے اصطلاحات وضع کیں اور ہر قسم میں کیا چیزیں معیوب سمجھی جاتی ہیں ان کی طرف توجہ دلائی، یہ بے شک ایک سنجیدہ علمی کوشش تھی جس کو بعد کے ناقدین اور ماہرین بلاغت نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس میں اضافہ و تکمیل کا کام کیا۔

13.5.2 قدامة بن جعفر

ابن معتز کے اس علمی کارنامہ کو جن ناقدین نے آگے بڑھایا اور اس میں اضافے کیے ان میں نمایاں نام ان کے ہم عصر نقاد قدامہ بن جعفر کا ہے، انھوں نے یہ کام اپنی کتاب ''نقد الشعر'' لکھ کر انجام دیا، قدامہ پہلے عیسائی تھے، تیسری صدی ہجری کے اواخر میں اسلام قبول کیا، خلیفہ عباسی مطیع لِلّٰہ کے زمانہ میں 337ھ میں ان کا انتقال ہوا، فلسفہ و منطق سے متأثر ہوئے اور ادب و تنقید وغیرہ پر اپنی تقریباً چودہ کتابوں میں فکری اور منہجی اعتبار سے اس تأثر کا واضح اظہار بھی کیا، قدامہ نے اپنی اس کتاب میں 14 قسم کی محسنات لفظیہ و معنویہ یا صنائع و بدائع کا ذکر کیا ہے، ان میں تین وہ ہیں جن کی حقیقت ابن معتز اور قدامہ کے یہاں یکساں ہے لیکن قدامہ کے یہاں ان کی اصطلاحات ابن معتز سے مختلف ہیں، وہ'' اعتراض'' کو''تتميم''، ''طباق'' کو''تكافؤ''، اور''رد إعجاز الكلام على ما تقدمها'' کو''توشيح'' کہتے ہیں، ہاں''مبالغة''اور'' التفات'' کی دو اصطلاحات دونوں کے یہاں ہو بہو ہیں، بس فرق یہ ہے کہ ابن معتز کے یہاں''التفات'' کی دو قسمیں ہیں اور قدامہ کے نزدیک صرف ایک، 14 میں سے پانچ میں کسی نہ کسی درجہ میں دونوں میں اتفاق ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدیع کی بقیہ 9 قسمیں وہ ہیں جو خالص قدامہ کی دریافت ہیں۔

واضح رہے کہ ابن معتز اور قدامہ کی ان دونوں کتابوں کا موضوع گو کہ تنقید ادب ہے لیکن ان کا بڑا حصہ بدیع سے متعلق ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آئندہ آنے والے ناقدین کو تنقید کے ایک اہم عنصر بدیع سے واقف کرانا چاہتے تھے تاکہ کسی ادب کے تجزیاتی مطالعہ میں وہ اس کی لفظی و معنوی خوبیوں سے بھی پردہ اٹھائیں اور اس اعتبار سے اس میں کوئی نقص ہو تو اس کی نشاندہی کریں۔

13.5.3 أبو هلال العسكري

چوتھی صدی میں قدامہ کے بعد دوسرے عالم ابو ہلال عسکری (وفات: 395ھ) ہیں، جو گو کہ قدامہ کے ہم عصر تھے لیکن ان کے بعد نصف صدی سے زائد باحیات رہے، انھوں نے اپنی ایک اہم کتاب میں بدیع کو اپنی توجہ خاص کا مرکز بنایا، وہ کتاب تھی:''كتاب الصناعتين-الكتابة والشعر''اس کتاب سے ان کے دو مقاصد تھے، ایک تو یہ کہ قدامہ بن جعفر کی شروع کی ہوئی تنقیدی تحریک کو اور آگے لے جائیں، لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ قدامہ کے برخلاف اس مقصد کے لیے فلسفہ و منطق کے ماہرین کی بجائے ادبا کا اسلوب اختیار کیا جائے، دوسرے یہ کہ اس میں صرف شعر و شاعری کو بنیاد نہ بنایا جائے بلکہ نثر نگاری کا بھی جائزہ لیا جائے؛ چونکہ ادب صرف شعر کا نام نہیں، بلکہ شعر و نثر دونوں کا مجموعہ ادب کہلاتا ہے۔

یہ ابو ہلال حسن بن عبداللہ بن سہل عسکری ہیں، بصرہ اور فارس کے درمیان واقع تاریخی شہر''عسکر مکرم'' کے رہنے والے ہیں، یہاں بہت سے علما و ادبا پیدا ہوئے، جن میں محدث ابو احمد عسکری (293-382ھ) بھی ہیں جو ادیب ابو ہلال عسکری کے ماموں اور ان کے استاد تھے، ابو ہلال عسکری بیک وقت لغت، بلاغت، نحو و صرف، عَروض، شعر گوئی، تاریخ اور انساب وغیرہ میں مہارت رکھتے تھے، تفسیر، لغت، ادب، بلاغت اور تنقید پر بیس کتابیں لکھیں، ان کی ہر کتاب ان کے علمی تنوع اور ان کے عہد کے علمی معیار کا پتہ دیتی ہیں۔ ان میں مشہور کتابیں جو طبع ہو سکیں درج ذیل ہیں:

1- جمهرة الأمثال۔ 2-ديوان المعاني۔ 3-المعجم في بقية الأشياء۔ 4-كتاب الصناعتين۔

اس وقت ہمارے پیش نظر ان کی یہ آخری کتاب''كتاب الصناعتين'' ہے، جس میں دس ابواب ہیں، جن میں نواں باب خاص علم بدیع

پر ہے، جس میں 35 فصلیں ہیں اور یہ باب تقریباً کتاب کے ایک چوتھائی حصہ کا احاطہ کرتا ہے۔ اپنے ذہنوں میں تازہ کرلیں کہ عسکری سے پہلے بدیع کی 27 اقسام سے بحث ہوچکی تھی، چنانچہ ان سے پہلے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس علم کے بانی ابن معتز نے 18 کا تذکرہ کیا تھا جن میں قدامہ نے 9 کا اضافہ کیا تھا، ابو ہلال عسکری نے اس میں 6 کا اضافہ کیا اور مزید 8 ایسی اقسام کا تذکرہ کیا جس کو انھوں نے ابن معتز اور قدامہ کے سوا دیگر علمائے بیان سے حاصل کیا تھا، اس طرح عسکری کے دور میں بدیع کی 41 قسمیں ہوگئیں۔

قابل ذکر ہے کہ ان میں سے بہت سی اقسام بعد کے زمانہ میں بدیع کی بجائے بیان یا معانی میں شمار کی گئیں ہیں، مثلاً استعارہ اور کنایہ کو بعد میں علم بیان میں شمار کیا گیا، اسی طرح اعتراض اور تذییل کو بعد میں اطناب کے اسالیب میں شمار کیا گیا اور اطناب علم معانی کے ابواب میں سے ہے۔

13.5.4 ابن رشيق القيرواني

اب ہم پانچویں صدی میں داخل ہوتے ہیں تو ہماری ملاقات ایک مراقشی ادیب سے ہوتی ہے جن کا شعر وادب پر نمایاں کام ہے، انھوں نے اپنی تنقید وتحقیق میں بدیع کو بڑا حصہ دیا ہے۔ ابو علی حسن بن رشیق ازدی قیروانی کی پیدائش 390ھ میں مسیلہ میں ہوئی جو پہلے وسطی مراقش میں آتا تھا، اب الجزائر میں ہے، بچپن سے علم وادب کا شوق اور قیروانی شاہی خانوداہ کا قرب کشاں کشاں قیروان (تیونس) لے آیا اور اسی شہر کی طرف منسوب ہوئے، 463ھ میں ان کا انتقال ہوا، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں درج ذیل کتابیں مشہور ہیں:

1-نموذج الشعراء۔ 2-شعراء القيروان۔ 3-رسالة قراضة الذهب۔ 4 - العمدة في معرفة صناعة الشعر ونقده وعيوبه۔

آخر الذکر کتاب سے ہی ان کی پہچان ہے اور یہی کتاب اس وقت ہمارے موضوع سے متعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ ابن رشیق نے بدیع کے بہت سے فنون واقسام کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں شعر وادب کے شاہکار اقتباسات کے ساتھ ساتھ علم بیان اور بدیع پر بھی گفتگو کی گئی ہے، ابن رشیق کے نزدیک معنوی یا لفظی ہر دوجدت اور ندرت کو بدیع کہتے ہیں، ساتھ ہی انھوں نے ابن معتز، قدامہ اور عسکری کے طرز پر بدیع کی اقسام کا بھی ذکر کیا ہے، ان کے نزدیک ان کی تعداد 29 کو پہنچ جاتی ہے، جن میں 20 ان تینوں پیش رو ادیبوں کے یہاں ذکر کی گئی اقسام کے مطابق ہیں، اور 9 کا ان کے یہاں اضافہ ملتا ہے، **تورية، ترديد، تفريع، استدعاء، تكرار، نفي الشيء بإيجابه، اطراد، اشتراک اور تغاير**، شاید انھوں نے ان تینوں کے سوا کسی اور سے ان کو لیا ہو یا خود ان کی ایجاد کردہ ہو، ان کا منہج عسکری کے منہج کے مماثل ہے، لیکن تفصیل زیادہ ہے، بہت سی اصطلاحات کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ میرے نزدیک ان کے نام یہ ہیں جب کہ ابن معتز یا قدامہ ان کو فلاں نام سے یاد کرتے ہیں، استعارہ کو انھوں نے بھی بدیع میں شمار کیا ہے جب کہ اس کا تعلق اب بیان سے ہے۔

13.5.5 الجرجاني والزمخشري

جرجانی (وفات: 471ھ) اور زمخشری (وفات: 538ھ) کے یہاں بھی بدیع کی بعض اقسام کا تذکرہ ملتا ہے لیکن مستقل طور پر نہیں بلکہ ضمنی طور پر؛ چنانچہ جرجانی نے اپنی کتاب "أسرار البلاغة" میں اپنے نظریۂ نظم کو بیان کرتے ہوئے **جناس، سجع، حسن تعليل، طباق اور مبالغة** کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کا مقصد بیان کے اسالیب مثلاً **تشبيه، تمثيل، مجاز اور استعارة** وغیرہ میں اضافی طور پر کیا خوبیاں پائی جاتی ہیں

اس کو واضح کرنا تھا، اسی ضمن میں بدیع کا ذکر آ گیا۔ اسی طرح زمخشری نے بھی جرجانی کے پیش کیے گئے بیان اور معانی کے مباحث میں نظریاتی اور تطبیقی اضافہ کیا، جس کا اظہار ان کی ''أساس البلاغة'' ور ''الكشاف'' سے ہوتا ہے، لیکن بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدیع کو بلاغت کی ایک مستقل قسم کے طور پر نہیں دیکھتے، ہاں وہ کشاف کی بیانی تفسیر کرتے ہوئے کہیں کہیں خود کو بدیع کی مختلف اقسام سے بے نیاز نہیں کر پاتے، چنانچہ انھوں نے طباق، مشاكلة، لف و نشر، التفات اور تقسیم و استطراد وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ واضح رہے کہ ابوبکر باقلانی (وفات: 403ھ) سے عبدالقاہر تک اعجاز قرآنی پر لکھنے والے جتنے مؤلفین ہیں انھوں نے قرآن کریم کے ادبی مطالعہ سے بدیع کو علیحدہ رکھا ہے، اس لیے کہ قرآن کریم کا حسن لفظی و معنوی حسن ذاتی ہے، اس میں تکلف و تصنع نہیں اور بدیع کی بہت سی اقسام تکلف و تصنع کے نمونوں کا بھی احاطہ کرتی ہیں۔

13.5.6 أسامة بن منقذ

اس سلسلہ میں ایک نام شامی نقاد اسامہ بن منقذ (وفات: 584ھ) کا لیا جا سکتا ہے، جنھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، ان میں سب سے مشہور کتاب ''كتاب الاعتبار'' ہے جو اصلاً ان کی ڈائری ہے جس میں صلیبی جنگوں کا بھی مفصل تذکرہ آیا ہے، ان کی دوسری مشہور کتاب ''البديع في نقد الشعر'' ہے، جس میں انھوں نے بدیع کے ابواب 95 تک پہنچا دیے ہیں۔

13.5.7 الرازي

مشہور عبقری عالم علامہ فخر الدین رازی (وفات: 606ھ) نے جب جرجانی کی دونوں کتابوں ''دلائل الإعجاز'' اور ''أسرار البلاغة'' کو مختصر اور مرتب طور پر جمع کرنے اور اس میں کچھ اضافہ کرنے کی غرض سے اپنی کتاب ''نهاية الإيجاز في دراية الإعجاز'' لکھی تو اس میں بدیع کی بعض اقسام کا بھی ذکر کیا، اس کتاب میں بدیع پر کچھ نیا نہیں، بلکہ رشید الدین عمری وطواط (وفات: 573ھ) کی کتاب ''حدائق السحر في دقائق الشعر'' سے مستفاد ہے، جسے وطواط نے فارسی زبان میں لکھا تھا اور اس کے ذریعہ عربی بلاغت کو فارسی ادب پر منطبق کرنے کی کوشش کی تھی، جس میں مثالیں فارسی اور عربی دونوں اشعار سے ہیں اور خود ان کے عربی اشعار بھی بطور مثال پیش کیے گئے ہیں، اس کتاب کا عربی ترجمہ ابراہیم امین شواربی نے کیا ہے۔

13.5.8 السكاكي

اس کے بعد سراج الدین سکاکی (وفات: 626ھ) کا نام آتا ہے، بلاغت کی کوئی بحث ان کے تذکرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی، ان کی سب سے مشہور کتاب ''مفتاح العلوم'' ہے، اس کی تیسری قسم بیان و معانی اور کچھ بدیع کی بعض اقسام پر ہے، اس کتاب میں نحو و صرف، عروض اور منطق وغیرہ پر بھی بحث ہے، لیکن اس کی اصل شہرت بلاغت سے ہے جس میں صنائع و بدائع بھی شامل ہیں، سکاکی نے بلاغت کی اقسام میں خاص طور پر بیان اور معانی پر زیادہ توجہ دی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدیع کو مستقل علم نہیں مانتے۔ قابل ذکر ہے کہ انھوں نے بدیع کی صرف 26 اقسام کا ذکر کیا ہے اور اپنی طرف سے کسی نئی قسم کا اضافہ نہیں کیا، شاید یہ اقسام ان کی نگاہ میں زیادہ اہمیت کی حامل ہوں، جن میں 20 محسنات معنویہ ہیں اور 6 محسنات لفظیہ، خاص بات یہ ہے کہ یہ پہلے مؤلف ہیں جنھوں نے محسنات لفظیہ اور معنویہ کو علیحدہ علیحدہ ذکر کیا، ان سے پہلے ان دونوں کا ذکر ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر بلا امتیاز ہوتا تھا اور سکاکی نے یہ ساری قسمیں رازی کی کتاب سے بعینہ انہیں مثالوں کے ساتھ نقل کی ہیں جو رازی کی کتاب

میں ہیں، ترتیب اور تقسیم ان کی اپنی ہے اور انھوں نے انتخاب سے کام لیا ہے، تمام کا ذکر نہیں کیا۔

13.5.9 ابن الأثير

اس سلسلہ میں ضیاء الدین ابن الاثیر کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جو اثیر الدین شیبانی کے بیٹے تھے، جو خود بڑے سیاستداں، تاجر اور علم کے شیدائی تھے، ان کے تین فرزند تھے: مجد الدین ابن الاثیر (وفات: 606ھ)، یہ محدث تھے، ان کی ایک مشہور کتاب ''**النهاية في غريب الحديث**'' ہے۔ دوسرے فرزند عز الدین ابن الاثیر (وفات: 630ھ) ہیں، یہ مؤرخ تھے، ان کی سب سے مشہور کتاب ''**الكامل في التاريخ**'' ہے، ان کا حدیث اور دیگر علوم سے بھی شغف تھا، چنانچہ ''**أسد الغابة في معرفة الصحابة**'' انہیں کی ہے جس کا موضوع تراجم صحابہ ہے، اس طرح اس کا تعلق حدیث و تاریخ دونوں سے ہے۔ اسی طرح بلاغت میں ''**الجامع الكبير في البلاغة**'' لکھی۔ تیسرے فرزند ضیاء الدین ابن الاثیر (وفات: 637ھ) تھے جو لغوی اور ادیب تھے، ان کی سب سے مشہور کتاب "**المثل السائر في أدب الكاتب والشاعر**'' ہے۔ تینوں بھائیوں کو ابن الاثیر کہہ دیتے ہیں، ضیاالدین ابن الاثیر کی توجہ کا مرکز بھی علم بیان رہا، بدیع کی اصطلاحات ان کے یہاں بھی ضمنی طور پر آئی ہیں اور گویا ان کے یہاں بھی علم بدیع مستقل علم نہیں اور اس طرح وہ جرجانی، زمخشری اور سکاکی کے دبستان فکر میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

13.5.10 أحمد التيفاشي وزكي الدين المصري

اسی صدی میں ہمیں دو نام اور ملتے ہیں، ان میں ایک احمد بن یوسف تیفاشی مراقشی (وفات: 651ھ) ہیں، انھوں نے بھی بدیع پر ''**كتاب البديع**'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے 70 محسنات شمار کرائے ہیں اور دوسرے زکی الدین بن ابی الاصبع مصری (وفات: 654ھ) ہیں، ان کی ادب و بلاغت پر کئی کتابیں ہیں مثلاً ''**كتاب الأمثال**''، ''**كتاب بديع القرآن**'' اور ''**تحرير التحبير**''، آخر الذکر کتاب میں انھوں نے محسنات کی 120 اقسام شمار کرائی ہیں، سب سے پہلے ابن معتز اور قدامہ کے یہاں پائی جانے والی محسنات کا ذکر کیا ہے، پھر دوسری کتابوں سے کچھ اقسام نقل کی ہیں، اس طرح کی ماخوذ اقسام اس میں 92 ہیں، اس میں مزید انھوں نے 28 کا اضافہ کیا ہے، جن میں 20 اقسام تو خود اپنی طرف سے پیش کی ہیں اور بقیہ یا تو ان سے پہلے کے مؤلفین کے یہاں بعینہ ملتی ہیں یا کچھ ایسی بھی ہیں جو اصطلاح کے فرق کے ساتھ ایک سے زیادہ مرتبہ آئی ہیں۔

زکی الدین مصری نے اپنی دوسری کتاب ''**بديع القرآن**'' میں قرآن مجید سے 108 انواع کی محسنات کا ذکر کیا ہے، انھوں نے گزشتہ ادوار کے مؤلفین کے برخلاف علم معانی کے بعض مباحث کو علم بدیع میں داخل کر دیا ہے جب کہ ان سے پہلے زیادہ تر بیان کی صورتوں کو بدیع میں شمار کر لیا جاتا تھا۔

13.5.11 ابن مالك الأندلسي

ساتویں صدی میں اس کے بعد بدر الدین محمد بن جمال الدین بن مالک طائی اندلسی (وفات: 686ھ) کا نام آتا ہے، ان کے والد جمال بن مالک نحو میں ''**ألفية بن مالك**''، جیسی منظوم تصنیف کی وجہ سے مشہور زمانہ ہو چکے تھے، صاحبزادہ بدر الدین بھی والد کی طرح نحوی تھے، نحو و بلاغت میں ان کی متعدد کتابیں ہیں، جن میں ''**المصباح في علوم المعاني والبيان والبديع**'' مشہور ہوئی، یہ دراصل سکاکی کی مفتاح کی تلخیص

ہے، لیکن اس میں کچھ جدید مباحث بھی ہیں اور یہ کتاب سکاکی کی منطقی تعقیدات سے خالی ہے، اس میں سکاکی کی 26 اقسام بدیع کے بجائے 54 اقسام اختصار کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں، اس میں پہلی بار ہمیں یہ بحث نظر آتی ہے کہ محسنات معنویہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ ہے جو افہام وتفہیم کے لیے ہے، جیسے: تقسیم، احتراس اور مبالغة وغیرہ اور دوسری تزئین وتحسین کے لیے ہے جیسے: لف ونشر، جمع مع التقسیم، جمع مع التفریق۔

13.5.12 يحي بن حمزه

آٹھویں صدی میں ایک نمایاں نام یحی بن حمزہ علوی یمنی (وفات: 749ھ) کا ہے جو نحو، بلاغت اور اصول فقہ کے بڑے عالم تھے، ان کی کئی تصنیفات ہیں، ہمارے زیر بحث موضوع سے متعلق بھی ان کی ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے: ''**الطراز المتضمن لأسرار البلاغة وعلوم حقائق الإعجاز**''، اس میں ویسے تو بلاغت کی تین قسموں سے بحث کی گئی ہے، لیکن بدیع کے سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ابن مالک کی کتاب ''**المصباح**'' سے مستفاد ہے، تاہم اس کی ترتیب وتوضیح میں ندرت اور تسہیل کا خیال رکھا گیا ہے۔

13.5.13 محمد التنوخي

آٹھویں صدی میں علم بدیع پر تصنیفات کے اعتبار سے دوسرا نام محمد بن عمرو تنوخی (وفات: 749ھ) کا ملتا ہے جو یحییٰ بن حمزہ کے معاصر تھے اور ایک ہی سال دونوں کی وفات ہوئی، انھوں نے ''**الأقصى القريب في علم البيان**'' تصنیف کی، کتاب کے عنوان سے واضح ہے کہ وہ ابن اثیر کے طرز پر بلاغت کے علم کو ایک اکائی سمجھتے ہیں، جرجانی، زمخشری اور سکاکی کی طرح اس کی اقسام کو علیحدہ علیحدہ نہیں دیکھتے، ہاں ابن اثیر اور ان میں فرق یہ ہے کہ ابن اثیر کا ذوق خالص ادبی ہے جب کہ تنوخی کا ذوق سکاکی کی طرح نحوی اور منطقی ہے، دوسرے یہ کہ وہ اپنی اس کتاب میں بدیع کی صرف چند اقسام کا تذکرہ کرتے ہیں اور محسنات لفظیہ اور معنویہ میں فرق نہیں کرتے جب کہ یہ فرق ان کے زمانہ میں رائج ہو چکا تھا۔

معلومات کی جانچ

1- بدیع کا بانی کون ہے؟

2- بدیع کو محسنات لفظیہ اور معنویہ میں پہلی بار کس نے تقسیم کیا؟

3- بدیع میں ابن معتز کا کیا حصہ ہے؟

13.6 بدیعیات کے اہم شعرا اور ان کی کاوشیں

13.6.1 علي الإربلي

علی بن عثمان اربلی (وفات: 670ھ) ابن ابی الاصبع کے ہم عصر ہیں، انھوں نے ایک قصیدہ نظم کیا تھا جس میں 36 اشعار تھے اور ہر شعر میں بدیع کی ان اقسام میں سے ایک قسم کا ذکر کیا ہے جو ان کے زمانہ میں رائج تھیں، یہ علم بدیع کو منظوم کرنے کی اولین کوشش تھی، بعد میں کئی اور مؤلفین نے اس طرز پر منظوم کلام پیش کیے، اس صنف کو ادب میں ''**البديعيات**'' کے نام سے شہرت ملی۔

13.6.2 صفي الدين الحِلّي

مشہور شاعر صفی الدین بن سرایا طائی حلی (وفات: 750ھ) اپنے دیوان سے مشہور ہوئے، جس میں شعر کی متعدد اصناف ہیں، انہیں حضور

اکرم ﷺ کی شان میں بھی ایک طویل قصیدہ لکھنے کی سعادت حاصل ہے، جس میں 145 اشعار ہیں اور یہ قصیدہ موضوع اور وزن وقافیہ میں بصیری کے قصیدۂ بردہ کا مماثل مانا جاتا ہے، اس قصیدہ کو ''بديعية صفي الدين'' کہتے ہیں، اس میں جتنے اشعار ہیں اسی قدر محسنات کا استعمال بھی ہے، چونکہ ہر شعر بدیع کی محسنات میں سے کسی ایک قسم پر مشتمل ہے، اس طرح اس قصیدہ میں 145 محسنات لفظیہ ومعنویہ کا ذکر آیا ہے، ابتدائی 5 اشعار کو انھوں نے جناس کے ساتھ خاص کیا ہے جن میں جناس کی 12 قسمیں ذکر کی ہیں۔

حلی نے اس قصیدہ کا نام ''الكافية البديعية في المدائح النبوية'' رکھا تھا اور اس کی شرح بھی لکھی تھی جس کا نام ہے ''النتائج الإلهية في شرح الكافية البديعية'' اور شرح کے مقدمہ میں بدیع پر لکھنے والے اپنے پیش رو مؤلفین کا تذکرہ کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ حلی نے اپنی بدیعیہ کو 70 کتابوں سے تیار کیا ہے، اس بدیعیہ کی ایک دوسری شرح عبد الغنی نابلسی (وفات: 1143ھ) نے لکھی ہے جس کا نام ہے: ''الجوهر السني في شرح بديعية الصفي''۔

منظوم بدیع کے سلسلہ میں اربلی کے بعد یہ اپنی نوعیت کی دوسری کامیاب کوشش تسلیم کی گئی ہے۔

13.6.3 ابن جابر الأندلسي

محمد بن احمد بن علی بن جابر اندلسی (وفات: 780ھ) ایک جہاں دیدہ مصنف اور شاعر تھے، لسان الدین ابن الخطیب (وفات: 776ھ) کے مطابق انھوں نے ''فصيح ثعلب'' اور ''كفاية المتحفظ'' وغیرہ نظمیں لکھیں، میم کے قافیہ پر ابن جابر کا ایک بدیعیہ ہے، جس کا نام ہے ''الحلة السيرا في مدح خير الورى''، یہ صفی الدین حلی کے بدیعیہ کے طرز پر ہے، اس میں 127 اشعار ہیں اور 60 محسنات کا ذکر ہے، ان کے ہم سفر ابو جعفر غرناطی نے اس کی شرح لکھی، جس کے مقدمے میں ذکر کیا ہے کہ ابن جابر نے خطیب قزوینی کی ''التلخيص'' اور ''الإيضاح'' میں ذکر کی گئی محسنات بدیعیہ کو اپنے قصیدہ میں شمار کرایا ہے اور انھوں نے اپنے بعض ہم عصروں کی طرح اس کو علم بیان کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا۔

13.6.4 دیگر اصحاب بدیعیات

ان تینوں قصائد کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور بہت سے شعرا نے اس طرز پر رسول اکرم ﷺ کی شان میں قصائد لکھے جن میں محسنات کا خیال رکھا، ان پر سب سے زیادہ صفی الدین حلی کے اثرات ہیں، ان میں مشہور نام اور کام اس طرح ہیں:

1- عز الدین موصلی (وفات: 789ھ) کا بدیعیہ جو 145 اشعار پر مشتمل ہے۔

2- ابن حجہ حموی (وفات: 837ھ) کا بدیعیہ جس میں 142 اشعار ہیں۔

3- جلال الدین سیوطی (وفات: 911ھ) کی ''نظم البديع في مدح خير شفيع''۔

4- عائشہ باعونیہ (وفات: 922ھ) کی 130 اشعار پر مشتمل ''الفتح المبين في مدح الأمين''۔

5- صدر الدین بن معصوم حسینی مدنی (وفات: 1117ھ) جو شیرازی نژاد تھے اور مغل دور میں انھوں نے حیدرآباد میں بھی مختلف مناصب پر فائز رہ کر تقریباً 45 سال علمی خدمات انجام دی تھیں، گیارہویں صدی کے 128 مشاہیر شعرا پر ان کی کتاب ''سلافة العصر في محاسن الشعراء بكل مصر'' سے ان کی پہچان ہے، انھوں نے بھی ایک بدیعیہ لکھا تھا اور اس کی شرح ''أنوار الربيع في أنواع البديع'' کے نام سے لکھی تھی۔

اور بھی متعدد مشہور بدیعیات ہیں، ہم یہاں صرف ان 8 شعرا کے مختصر تذکرے پر اکتفا کرتے ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- صفی الدین حلی کے قصیدہ کا کیا نام ہے؟

2- بدیعیات کا پہلا شاعر کسے قرار دیا گیا ہے؟

3- بدیعیات میں صدر الدین حسینی کا کیا حصہ ہے؟

13.7 اکتسابی نتائج

عربی لغت میں بدیع کا لفظ ''بدع الشيء يبدعه بَدعا'' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو ایجاد کرنا، اس کو شروع کرنا، اسی سے فعیل کے وزن پر اسم مفعول بنالیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے نئی چیز، ایجاد کردہ شئے، اس کی جمع بدائع آتی ہے، اس کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے: **''علم يعرف به وجوه تحسين الكلام بعد مطابقته لمقتضى الحال مع وضوح دلالته على المراد لفظا ومعنى''** (وہ علم جس سے تحسین کلام کے ضوابط معلوم ہوں جب کہ اس میں مقتضائے حال کی رعایت بھی کی گئی ہو اور اپنی مراد پر لفظی ومعنوی دونوں اعتبار سے اس کی دلالت واضح ہو)۔

علم بدیع کا موجد ابن معتز (296ھ) کو قرار دیا جاتا ہے، ان کی کتاب **کتاب البدیع** اس موضوع پر بنیادی کتاب ہے، ان کے یہاں ہمیں بدیع کے علم میں کل 18 مباحث کا تذکرہ نظر آتا ہے، چوتھی صدی میں قدامہ بن جعفر (337ھ) نے ''**نقد الشعر**'' تصنیف کر کے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا، بدیع کی 9 اقسام وہ ہیں جو خالص قدامہ کی دریافت ہیں، چوتھی صدی میں قدامہ کے بعد دوسرے عالم ابو ہلال عسکری (وفات: 395ھ) ہیں، انھوں نے ''**کتاب الصناعتين-الكتابة والشعر**'' لکھ کر اس سلسلہ کو آگے بڑھایا عسکری سے پہلے بدیع کی 27 اقسام زیر بحث آچکی تھیں، عسکری کے دور میں اس کی تعداد 41 کو پہنچ گئی، پانچویں صدی میں جرجانی اور ابن رشیق قیروانی نے اس میں اضافے کیے، چھٹی صدی میں زمخشری اور اسامہ بن منقذ کے نام اس میدان کے شہسواروں میں لیے جاسکتے ہیں، ان کی مشہور کتاب ''**البديع في نقد الشعر**'' ہے، جس میں انھوں نے بدیع کے ابواب 95 تک پہنچا دیے ہیں۔

ساتویں صدی کے علما میں بدیع پر لکھنے والی نمایاں شخصیات میں فخر الدین رازی (وفات:606ھ)، سکاکی (وفات:626ھ) اور ضیاء الدین ابن الاثیر (وفات:637ھ) کے نام لیے جاسکتے ہیں، اسی صدی میں ہمیں تین نام اور ملتے ہیں، ان میں ایک احمد بن یوسف تیفاشی (وفات: 651ھ) ہیں اور دوسرے زکی الدین مصری (وفات:654ھ) ہیں اور تیسرے ابن مالک طائی اندلسی (وفات:686ھ) ہیں، آٹھویں صدی میں ایک نمایاں نام یحییٰ بن حمزہ علوی یمنی (وفات:749ھ) کا ہے اور دوسرا نام محمد بن عمر وتنوخی (وفات:749ھ) کا ملتا ہے۔

متعدد شخصیات نے علم بدیع کو منظوم بھی کیا، اس صنف کو ''بدیعیات'' کہتے ہیں، ان میں نمایاں نام علی اربلی (وفات:670ھ) کا ہے، انھوں نے ایک قصیدہ نظم کیا تھا جس میں 36 اشعار تھے اور ہر شعر میں بدیع کی ان اقسام میں سے ایک قسم کا ذکر کیا ہے جو ان کے زمانہ میں رائج تھیں، یہ علم بدیع کو منظوم کرنے کی اولین کوشش تھی، ان کے بعد صفی الدین بن سرایا طائی حلی (وفات: 750ھ) نے حضور اکرم ﷺ کی شان میں بھی ایک

طویل قصیدہ لکھنے کی سعادت حاصل ہے، جس میں 145 اشعار ہیں اس قصیدہ کو ''بديعية صفي الدين'' کہتے ہیں، اسی طرح محمد بن احمد بن علی بن جابر اندلسی (وفات: 780ھ) نے ''الحلة السيرا في مدح خير الورى'' کے عنوان سے بدیعیہ لکھا، ان تینوں قصائد کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور بہت سے شعرا نے اس طرز پر رسول اکرم ﷺ کی شان میں قصائد لکھے جن میں محسنات کا خیال رکھا، ان میں مشہور نام اور کام اس طرح ہیں: 1- عزالدین موصلی (وفات: 789ھ) کا بدیعیہ جو 145 اشعار پر مشتمل ہے۔ 2- ابن حجہ حموی (وفات: 837ھ) کا بدیعیہ جس میں 142 اشعار ہیں۔ 3- جلال الدین سیوطی (وفات: 911ھ) کی ''نظم البديع في مدح خير شفيع'' 4- عائشہ باعونیہ (وفات: 922ھ) کی 130 اشعار پر مشتمل ''الفتح المبين في مدح الأمين'' 5- صدر الدین بن معصوم حسینی مدنی (وفات: 1117ھ) نے بھی ایک بدیعیہ لکھا تھا اور اس کی شرح ''أنوار الربيع في أنواع البديع'' کے نام سے لکھی تھی۔

13.8 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے:

1- ابن رشیق قیروانی اور ابن الاثیر کون تھے؟ بدیع میں ان کے کیا کارنامے ہیں؟۔

2- زمخشری، جرجانی اور تیفاشی کا علم بدیع میں کیا کام ہے؟ روشنی ڈالیے۔

3- بدیعیات سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ نیز بدیعیات کے چار اہم شعرا کون ہو سکتے ہیں؟ تذکرہ کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالات کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے:

1- علم بدیع کی لغوی و اصطلاحی تعریفات لکھیے اور ان کی توضیح کیجیے۔

2- ابو ہلال عسکری پر ایک نوٹ لکھیے۔

3- علم بدیع میں قدامہ بن جعفر، سکاکی اور اربلی کا کیا کردار رہا؟ جائزہ لیجیے۔

13.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1-	**مختصر المعاني**	سعد الدین تفتازانی
2-	**البلاغة الواضحة**	مشترکہ تصنیف: علی الجارم و مصطفی امین
3-	**دروس البلاغة**	مشترکہ تصنیف: حفنی ناصف، محمد دیاب، سلطان محمد، مصطفی طموم
4-	**علم البديع**	ڈاکٹر عبد العزیز عتیق

اکائی 14 علم البدیع کی قسمیں

اکائی کے اجزا

14.1 تمہید

14.2 مقصد

14.3 جناس یا تجنیس اور اس کی قسمیں

14.4 تشابہ اطراف

14.5 تصدیر

14.6 سجع اور اس کی قسمیں

14.7 تشریع

14.8 قلب

14.9 التزام

14.10 عکس

14.11 موار بہ

14.12 موازنہ و مماثلت

14.13 ایہام یا توریہ اور اس کی قسمیں

14.14 طباق یا تضاد اور اس کی قسمیں

14.15 تاکید مدح شبہ ہجو و تاکید ہجو شبہ مدح

14.16 تناسب یا مراعات نظیر اور ایہام تناسب

14.17 مشاکلہ

14.18 ارصاد

14.19 استخدام

14.20 لف و نشر اور اس کی قسمیں

14.21 جمع، تفریق اور تقسیم

14.22 تجرید اور اس کی قسمیں

14.23 مبالغہ اور اس کی قسمیں

14.24 توجیہ، تجاہل عارف اور قول بالموجب

14.25 اقتباس

14.26 تضمین و تلمیح

14.27 عقد و حل، تشبیب یا حسن ابتدا

14.28 براعتِ استہلال، براعت طلب

14.29 گریز یا حسن تخلص، حسن انتہا یا حسن اختتام

14.30 اکتسابی نتائج

14.31 امتحانی سوالات کے نمونے

14.32 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

14.1 تمہید

بدیع کی دوقسمیں ہیں: محسنات لفظیہ اورمحسنات معنویہ،اس اکائی میں محسنات لفظیہ کی مشہورقسمیں: جناس،تشابہ اطراف،تصدیر،سجع، تشریع،قلب،التزام،عکس،موازنہ اور موازنہ،اسی طرح محسنات معنویہ کی مشہورقسمیں: توریہ،طباق،تاکیدمدح شبہ ہجو،تاکیدہجوشبہ مدح،تناسب یا مراعات نظیر،ایہام تناسب، مشاکلہ، ارصاد، استخدام، لف ونشر،جمع ،تفریق،تقسیم،تجرید،مبالغہ،توجیہ،تجاہل عارف اور قول بالموجب ذکر کی جائیں گی، نیزایک تیسری قسم جس میں محسنات لفظیہ اورمعنویہ دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں،اس کی بھی مشہورقسموں: اقتباس،تضمین،تلمیح، عقدوحل،تشبیب یاحسن ابتدا، براعت استہلال، براعت طلب،گریزیاحسن تخلص،حسن انتہایاحسن اختتام سے آپ واقف ہوسکیں گے۔

14.2 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ بدیع کی مشہوراقسام محسنات لفظیہ اورمحسنات معنویہ کی ذیلی قسموں سے واقف ہوسکیں گے،محسنات لفظیہ میں جناس،تشابہ اطراف،تصدیر،سجع،تشریع،قلب،التزام،عکس،موازنہ اور موازنہ کو پڑھیں گے،اسی طرح محسنات معنویہ میں آپ توریہ،طباق، تاکیدمدح شبہ ہجو،تاکیدہجوشبہ مدح،تناسب یامراعات نظیر،ایہام تناسب،مشاکلہ،ارصاد،استخدام،لف ونشر،جمع،تفریق،تقسیم،تجرید،مبالغہ،توجیہ، تجاہل عارف اورقول بالموجب کا مطالعہ کریں گے،ساتھ ساتھ ایک تیسری قسم سے بھی واقف ہوسکیں گے،جس میں محسنات لفظیہ اورمعنویہ دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں،اس اکائی میں اس کی یہ مشہورقسمیں ذکر کی جائیں گی :اقتباس،تضمین،تلمیح،عقدوحل،تشبیب یاحسن ابتدا، براعت استہلال، براعت طلب،گریزیاحسن تخلص،حسن انتہایاحسن اختتام۔

14.3 جناس یاتجنیس

14.3.1 جناس کی تعریف

علمائے بلاغت اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:" الجِناسُ أن يتشابهَ اللفظانِ في النُّطقِ ويختلفانِ في المعنى، وهو نوعان:

(1)تام: وهو ما اتفق فيه اللفظان في أمور أربعة هي: نوع الحروف، وشكلها، وعددها، وترتيبها.

(2)غیرتام: وهو ما اختلف فيه اللفظان في واحد من الأمور الأربعة المتقدمة.

یعنی دولفظوں کا تلفظ میں مشابہ اورمعنی میں مختلف ہونا "تجنیس" کہلاتا ہے،اوراسے "جناس" بھی کہتے ہیں،اس کی دوقسمیں ہیں:

(1)تام (2)غیرتام۔

14.3.1.1 تام

وہ تجنیس ہے جس میں دونوں لفظ حروف کی نوعیت، ہیئت، عدد اور ترتیب میں متفق ہوں،اس کی چارقسمیں ہیں:

(1)مماثل (2)مستوفی (3)متشابہ (4)مفروق

14.3.1.1.1 مماثل

وہ تجنیس تام ہے جس میں دونوں لفظ ایک ہی نوعیت کے ہوں، یعنی دونوں اسم ہوں، یا دونوں فعل ہوں، یا دونوں حرف ہوں، جیسے: ''روزگار'' بہ معنی زمانہ، اور ''روزگار'' بہ معنی پیشہ اور جیسے شاعر نے کہا ہے:

لم نلْقَ غَيْرَكَ إنساناً يُلاذُبه　　　فلا برحتَ لعين الدهر إنساناً

(ہم تیرے علاوہ کسی ایسے انسان سے نہیں ملے جس کی پناہ لی جائے، تو ہمیشہ زمانہ کی آنکھوں کی پتلی بنا رہا۔)

پہلا انسان ''بشر'' کے معنی میں ہے اور دوسرا ''آنکھوں کی پتلی'' کے لیے ہے۔

اور جیسے قرآن مجید میں ہے: {ويومَ تَقُومَ الساعةُ يُقْسِمُ المجرمونَ ما لَبِثوا غيرَ ساعةٍ} (الروم: 55)۔ آیت کریمہ میں پہلی ''ساعة'' سے مراد قیامت ہے اور دوسری ''ساعة'' سے مراد گھڑی اور وقت ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں لفظ ایک ہی نوعیت کے ہیں، یعنی دونوں اسم ہیں، لہذا یہ ''تجنیس تام مماثل'' ہے۔

14.3.1.1.2 مستوفی

وہ تجنیس تام ہے جس میں دونوں لفظ ایک نوع کے نہ ہوں، بلکہ دونوں مختلف ہوں، جیسے ''دِیا'' بہ معنی چراغ، یہ اسم ہے؛ اور ''دیا'' یعنی کوئی سامان دیا؛ یہ ''دینا'' مصدر سے فعل ماضی ہے اور جیسے شاعر کا یہ شعر:

فَدارِهم ما دُمْتَ في دارِهم　　　وأرضِهِمْ ما دُمْتَ في أرضِهم

(جب تک تو ان کی بستی میں رہے تو تو ان سے اچھا برتاؤ رکھ اور جب تک ان کی زمین میں رہے تو تو ان کو راضی رکھ۔)

پہلے مصرعہ میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں پہلے ''دارهم'' میں ''دارِ'' داری يداري مدارةً سے فعل امر ہے، اور دوسرے ''دارهم'' میں ''دار'' گھر کے معنی میں ہے، اسی طرح دوسرے مصرعہ کو سمجھیے کہ پہلے ''أرضهم'' میں ''أرضِ'' أرضى يرضي إرضاءً سے فعل امر ہے اور دوسرے ''أرضهم'' میں ''أرض'' زمین کے معنی میں ہے۔

14.3.1.1.3 متشابہ

وہ تجنیس تام ہے جس میں ایک لفظ مفرد اور دوسرا مرکب ہو، نیز دونوں ایک ہی طرح لکھے جاتے ہوں۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

إذا مَلِكٌ لم يَكُن ذاَ هِبَهْ　　　فدَعْه فدَولتُه ذاهِبَهْ

(جب کوئی بادشاہ داد و دہش والا نہ ہو تو اسے چھوڑ دو؛ کیونکہ اس کی سلطنت ختم ہونے والی ہے۔)

پہلے مصرعہ میں مرکب تعبیر ہے، ''ذا'' (والا) ''ذُو'' سے حالت نصبی میں ہے اور مضاف ہے، جب کہ ''هبه'' (داد و دہش) مضاف الیہ ہے اور دوسرے مصرعہ میں ''ذاهبه'' (ختم ہونے والی) ایک مفرد لفظ ہے۔

14.3.1.1.4 مفروق

متشابہ کے برعکس دونوں لفظ ایک طرح نہ لکھے جاتے ہوں۔ جیسے شاعر کا یہ قول:

كُلُّكُم قدْ أخَذَ الْجامَ ولا جامَ لَنا　　　ماالَّذي ضَرَّ مُديرَ الجامِ لَوْ جامَلَنَا

(تم میں سے ہرایک نے جام لے لیااور ہمیں جام نہ ملا، اگر وہ ساقی ہم سے اچھا سلوک کرتا تو اس کا کیا نقصان ہوتا۔)

اس شعر میں دیکھیے کہ دونوں مصرعوں میں یکساں تعبیریں آئی ہیں؛ لیکن دونوں کو دو الگ الگ انداز سے لکھا گیا ہے، چنانچہ پہلے مصرعہ میں ''جامَ لَنا'' کو علیحدہ علیحدہ لکھا گیا ہے، جب کہ دوسرے مصرعہ میں ''جَامَلَنا'' کو ملا کر لکھا گیا ہے، جس میں ''جامَلَ'' فعل ماضی ہے اور ''نا'' ضمیر متصل ہے جو کہ حالت نصبی میں ہے۔

14.3.1.2 غیر تام

وہ تجنیس ہے جس میں دونوں لفظ تام کے برعکس، حروف کی نوعیت ہیئت، عدد اور ترتیب میں سے کسی ایک میں مختلف ہوں، اس کی درج ذیل قسمیں ہیں:

14.3.1.2.1 محرف

وہ تجنیس غیر تام ہے جس میں دونوں لفظ صرف حروف کی ہیئت میں مختلف ہوں۔ جیسے ''سَحَر کا سِحْر چل پڑا''؛ یعنی صبح کا جادو چل پڑا۔ اس مثال میں لفظ ''سَحَر'' اور ''سِحْر'' ایک ہی نوع کے ہیں، کیونکہ دونوں اسم ہیں؛ اسی طرح دونوں کے حروف کا عدد اور ترتیب ایک طرح کے ہیں؛ مگر ان حروف کی ہیئت ایک نہیں، بلکہ مختلف ہے؛ جیسا کہ حرکت وسکون سے ظاہر ہے اور جیسے: "جُبّةُ البُرْدِ جُنّةُ البَرْدِ" (اونی جبہ سردی کے لیے ڈھال ہے)۔

اس مثال میں بھی ''جُبَة'' اور ''جُنَة'' اور ''البُرْد'' اور ''البَرْد'' ایک ہی نوع کے ہیں، کیونکہ دونوں اسم ہیں؛ اسی طرح دونوں کے حروف کا عدد اور ترتیب ایک طرح کے ہیں؛ مگر ان حروف کی ہیئت ایک نہیں، بلکہ مختلف ہے؛ جیسا کہ حرکت وسکون سے ظاہر ہے۔

14.3.1.2.2 مطرف

وہ تجنیس غیر تام ہے جس میں دونوں لفظ صرف حروف کی تعداد میں مختلف ہوں؛ بہ ایں طور کہ ایک کی بہ نسبت دوسرے کے شروع میں کوئی حرف زیادہ ہو۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: {والتفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ إلی ربّک یومئذ المَسَاق} (القیامۃ:29)، آیت کریمہ میں "ساق" کی بہ نسبت "مساق" کے شروع میں حرف ''میم'' زائد ہے اور جیسے یہ شعر:

إنْ كان فِراقُنا مَعَ الصُّبح بَدَا   لا أسْفَرَ بَعْدَ ذاک صُبْحٌ أَبدا

(اگر صبح ہوتے ہی ہمارے درمیان جدائی ہونے والی ہے تو خدا کرے اس کے بعد کبھی صبح ہی طلوع نہ ہو۔)

اس شعر میں بھی دیکھیے: پہلے مصرعہ کے ''بدا'' کی بہ نسبت دوسرے مصرعہ کے ''أبدا'' کے شروع میں حرف ''ہمزہ'' زائد ہے۔

14.3.1.2.3 مذیل

مطرف کے برعکس ایک لفظ کی بہ نسبت دوسرے لفظ کے آخر میں کوئی حرف زائد ہو۔ جیسے شاعر کا یہ شعر:

ويَمُدُّون مِنْ أيدٍ عَواصٍ عَوَاصِمِ   تَصُوْلُ بِأسْيافٍ قَوَاضٍ قَوَاضِبِ

(وہ لڑائی کے لیے بازو بڑھاتے ہیں، جو دشمنوں پر لاٹھی چلانے والے اور رفق کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ایسی تلواروں سے حملہ کرتے ہیں جو فیصلہ کرنے والی اور کاٹنے والی ہیں۔)

پہلے مصرعہ میں ''عَواصٍ عَوَاصِمِ'' کو دیکھیے، ''عَواصٍ'' کی بہ نسبت ''عَوَاصِمِ'' میں ایک حرف میم زائد ہے، اسی طرح دوسرے مصرعہ میں ''قَوَاضٍ قَوَاضِبِ'' پر غور کیجیے، ''قَوَاضٍ'' کے مقابلہ میں ''قَوَاضِبِ'' میں حرف ''باء'' زائد ہے۔

14.3.1.2.4 مضارع

وہ تجنیس غیر تام ہے جس میں دونوں لفظ کے حروف مختلف ہوں، مگر وہ قریب المخارج ہوں۔ جیسے لفظ ''خار'' اور ''عار'' اسی طرح لفظ ''بحر'' اور ''بہر''۔ ان مثالوں میں ''خ'' اور ''ع'' اسی طرح ''ح'' اور ''ہ'' مختلف حروف ہیں، مگر قریب المخارج ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {وهُمْ يَنْهَونَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ} (المائدة:26)۔ ظاہر ہے کہ ''ینھون'' اور ''يَنْئَوْنَ'' میں ''ھ'' اور ''ء'' کا فرق ہے اور یہ دونوں حروف قریب المخارج حروف حلقی میں سے ہیں۔

14.3.1.2.5 لاحق

مضارع کے برعکس دونوں لفظوں کے مختلف حروف قریب المخارج نہ ہوں، جیسے لفظ ''رنگ'' اور ''سنگ''؛ اسی طرح لفظ ''شاہ'' اور ''شاذ''؛ ظاہر ہے کہ ''ر'' اور ''س''؛ اسی طرح ''ہ'' اور ''ذ'' مختلف حروف ہیں اور قریب المخارج بھی نہیں ہیں اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {وإنَّهُ علٰى ذلك لَشَهيدٌ وإنه لِحُبِّ الخَيْرِ لَشَديدٌ} (العاديات: 7، 8)۔ آیت کریمہ میں ''لشهيد'' اور ''لشديد'' میں ''ھ'' اور ''ذ'' مختلف حروف ہیں اور دونوں قریب المخارج بھی نہیں۔

14.3.1.2.6 جناس قلب

وہ تجنیس غیر تام ہے جس میں دونوں لفظ صرف حروف کی ترتیب میں مختلف ہوں؛ خواہ یہ اختلاف ترتیب وار ہو یا بلا ترتیب؛ جیسے ''کان، ناک'' اور ''رفیق، فریق''۔ اسی طرح عربی میں ''نَيل، لين'' اور ''ساق، قاسِ'' اور جیسے قرآن کریم میں ہے: {وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ} (المدثر: 3)۔ ظاہر ہے کہ آیت کریمہ میں دونوں لفظ حروف کی ترتیب میں مختلف ہیں؛ کیونکہ پہلے میں حروف کی جو ترتیب ہے، دوسرے میں بالکل اس کے برعکس ہے، لہذا اسے الٹا یا سیدھا، جس طرح سے پڑھیں حاصل ایک ہی ہے۔

معلومات کی جانچ

1- جناس کی تعریف کیا ہے؟

2- جناس کی کتنی قسمیں ہیں اور کیا کیا؟

3- مماثل اور مستوفی کسے کہتے ہیں؟

14.4 تشابہ اطراف

محسنات لفظیہ کی یہ دوسری صورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ نثر میں پہلا جملہ جس لفظ پر ختم ہو؛ اسی سے دوسرا جملہ شروع کیا جائے، یعنی ایک ہی لفظ ایک ہی جملہ کے آخر میں؛ اور دوسرے جملہ کے شروع میں رکھا جائے۔ اسی طرح نظم میں پہلا مصرعہ، یا پہلا شعر جس لفظ پر ختم ہو؛ اسی سے دوسرے مصرعے؛ یا دوسرے شعر کا آغاز کیا جائے، بہ الفاظ دیگر ایک ہی لفظ کو ایک مصرعہ؛ یا شعر کے آخر میں؛ اور دوسرے مصرعہ؛

یا شعر کے آخر میں لایا جائے؛ جیسے قرآن میں ہے: {مَثَلُ نورِہ کَمِشکاۃٍ فیھا مِصْباحٌ، المِصْباحُ في زُجاجۃٍ، الزُّجاجۃُ کأنَّھا کَوْکَبٌ دُرِّيٌّ} (النور:35)، اور جیسے شاعر کا قول ہے:

إذا نَزَلَ الحَجّاجُ أرضاً مریضۃً   تَتَبَّعَ أَقْصَی دائِھا فَشَفاھا

شَفَاھا مِنَ الداَّءِ العُضالِ الذي بِھا   غُلامٌ إذا ھَزَّ القَناۃَ سَقَاھا

(جب حجاج کسی بیمار بستی میں پہنچتا ہے تو اس کی آخری بیماری کو تلاش کر لیتا ہے پھر اسے شفا دیتا ہے لاعلاج بیماری سے جو اسے لگی ہے، ایک ایسا لڑکا جب نیزہ کو حرکت دیتا ہے تو اسے سیراب کر دیتا ہے۔)

مثالیں واضح ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- تشابہ اطراف کسے کہتے ہیں؟

14.5 تصدیر

محسنات لفظیہ کی یہ تیسری صورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اشعار میں کسی لفظ کو درج ذیل مختلف صورتوں سے مکرر لایا جائے۔ مثلاً: جس لفظ سے پہلا مصرعہ شروع ہوا سی پر دوسرا مصرعہ ختم ہو۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

سَریعٌ إلیَ ابنِ العَمِّ یَلْطِمُ وجھَہ   ولیسَ إلیَ داعي النَّدیَ بِسَریعٍ

(وہ آدمی اپنے چچازاد بھائی کے چہرہ پر طمانچہ مارنے میں بہت تیز ہے۔ حالانکہ بخشش مانگنے والے کی طرف تیز نہیں ہے۔)

پہلا مصرعہ ''سَریع'' سے شروع ہے، اور دوسرا مصرعہ ''سَریع'' پر ہی ختم ہے۔

واضح رہے کہ تصدیر کی مذکورہ صورتیں نثر میں بھی جاری ہوتی ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {وتَخْشَی النَّاسَ واللہُ أحَقُّ أنْ تَخْشَاہُ} (الأحزاب:37)۔ ظاہر ہے کہ آیت کریمہ ''تخشی'' سے شروع اور ''تخشی'' ہی پر ختم ہے۔

معلومات کی جانچ

1- تصدیر کسے کہتے ہیں؟

14.6 سجع اور اس کی قسمیں

محسنات لفظیہ کی یہ چوتھی صورت ہے، جس کا مطلب ہے؛ دو فقروں یا دو مصرعوں کا آخری حرف میں موافق ہونا: یعنی دونوں فقروں، یا دونوں مصرعوں کا آخری حرف ایک طرح کا ہو؛ چنانچہ جس لفظ کے آخری حرف میں یہ موافقت ہوگی، نثر میں اسے ''فاصلہ'' کہتے ہیں؛ اور نظم میں اسے ''قافیہ'' کہتے ہیں۔

علما اس کی تعریف یوں کرتے ہیں: ''السَّجْعُ تَوافُقُ الفاصِلَتَیْن في الحرف الأخیر، وأفضلُہ ماتساوَتْ فِقَرُہ''۔

اس کی تین قسمیں ہیں: (1) مطرف   (2) متوازی   (3) مرصع یا ترصیع

14.6.1 سجع مطرف

نثر یا نظم میں جن دو لفظوں کے آخری حرف میں موافقت ہو، وہ دونوں لفظ وزن میں مختلف ہوں؛ جیسے قرآن پاک میں ہے: {مالکُمْ لا ترجونَ لِلّٰهِ وَقاراً وقد خَلَقَکم أطواراً} (نوح: 13)۔ آیت کریمہ میں ''وقارا'' اور ''أطوارا'' کا آخری حرف یکساں ہے، مگر دونوں کا وزن مختلف۔

14.6.2 متوازن

دونوں لفظ: یعنی نثر میں فاصلہ اور نظم میں قافیہ ہم وزن ہوں؛ بقیہ دوسرے الفاظ ہم وزن نہ ہوں۔ جیسے قرآن میں ہے: {والنَّجمِ إذا هَوىٰ، ماضَلَّ صاحبُکم وماغَوىٰ} (النجم: 2)۔ آیت کریمہ میں ''هوىٰ'' اور ''غوىٰ'' ہم وزن ہیں، مگر دوسرے الفاظ ہم وزن نہیں۔

14.6.3 مرصع یا ترصیع

دونوں فقروں، یا دونوں مصرعوں کے فاصلے اور قافیے کے ساتھ دوسرے تمام یا اکثر الفاظ ہم وزن ہوں۔ جیسے قرآن کریم میں ہے: {إنَّ الأبرارَ لَفِي نعيمٍ وإنَّ الفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ} (الانفطار: 13)۔

معلومات کی جانچ

1- سجع کسے کہتے ہیں؟

2- سجع مطرف کیا ہے؟

14.7 تشریع

محسنات لفظیہ کی یہ پانچویں صورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شعر میں دو، یا دو سے زائد قافیوں کو استعمال کیا جائے، کہ اگر کسی کو حذف کر دیا جائے تب بھی شعر مکمل رہے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

يا أيُّها المَلِکُ الذي عَمَّ الوَرَى　　　ما فِيْ الكِرامِ له نظيرٌ يُنْظَرُ

لوكان مثلُکَ آخَرَ في عَصرِنا　　　ما كان في الدنيا فقيرٌ مُعْسِرُ

(اے وہ بادشاہ! جس کی سخاوت مخلوق پر عام ہے، سخی لوگوں میں جس کی کوئی مثال نہیں دیکھی جاتی، اگر تیرے مانند دوسرا اور بادشاہ ہمارے زمانہ میں ہوتا تو دنیا میں کوئی تنگ دست فقیر باقی نہ رہتا۔)

ان چاروں مصرعوں کے آخری قوافی کو محذوف کر دیا جائے تب بھی درست اشعار اس طرح باقی رہیں گے:

يا أيُّها المَلِکُ الذي　　　ما فِيْ الكِرامِ له نظيرٌ

لوكان مثلُکَ آخَرَ　　　ما كان في الدنيا فقيرٌ

(اے وہ بادشاہ! جس کی سخی لوگوں میں کوئی مثال نہ ہو، اگر تیرا جیسا کوئی دوسرا ایک شخص ہوتا تو دنیا میں کوئی فقیر نہ رہتا۔)

معلومات کی جانچ

1- تشریع کسے کہتے ہیں؟

14.8 قلب

محسنات لفظیہ کی یہ چھٹی صورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا لفظ استعمال کیا جائے جسے سیدھا اور الٹا، دونوں طرح سے پڑھا جا سکتا ہو۔ جیسے ''قلق''، ''درد'' اور جیسے ''شاباش شاباش''۔ اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {كُلٌّ فِي فَلَكٍ} (الأنبياء:33)۔

معلومات کی جانچ

1- قلب کسے کہتے ہیں؟

14.9 التزام

التزام کو ''لزوم مالا یلزم'' بھی کہتے ہیں، محسنات لفظیہ کی یہ ساتویں صورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایک یا دو حرف کو لازم کر لیا جائے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {فَأَمَّا اليتيمَ فَلا تَقْهر وأَمَّا السَّائلَ فَلا تَنْهر} (الضحیٰ:9،10)۔

اس مثال میں ''تَقْهر'' اور ''تَنْهر'' دونوں کے اخیر میں ''ہاء'' اور ''راء'' کا التزام کیا گیا ہے۔

معلومات کی جانچ

1- التزام کسے کہتے ہیں؟

14.10 عکس

محسنات لفظیہ کی یہ آٹھویں صورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کے جزو کو پلٹ کر لایا جائے: یعنی کسی جز کو دوسرے جز پر مقدم کیا جائے اور پھر اسے پلٹ دیا جائے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {يُخرِجُ الحَيَّ مِنَ المَيِّتِ ويُخرِجُ المَيِّتَ مِنَ الحَيِّ} (الروم:19)۔

اس مثال میں پہلے ''الحَيِّ'' کو ''المَيِّت'' پر مقدم کیا گیا، پھر ''المَيِّت'' کو ''الحَيِّ'' پر مقدم کر دیا گیا ہے۔

معلومات کی جانچ

1- عکس کسے کہتے ہیں؟

14.11 مواربہ

یہ محسنات لفظیہ کی نویں صورت ہے، مواربہ یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام کو اس طرح استعمال کرے کہ مؤاخذہ سے بچنے کے لیے اگر اس کو بدلنے کی ضرورت پڑ جائے تو اس میں معمولی رد و بدل کر دے جیسے ابونواس کا یہ شعر:

لَقَد ضاعَ شِعرِي على بابكم   كما ضاع عقد على خالصة

(میرے اشعار تمہارے دروازے پہ ایسے ہی بے کار گئے جیسا کہ خالصہ (ہارون رشید کی کنیز) پر ہار بے کار گیا۔)

جب ہارون رشید نے اس پر نکیر کی تو ابونواس نے اس میں اس طرح ترمیم کر کے خود کو بادشاہ کے مؤاخذہ سے بچایا:

لَقَد ضاءَ شِعرِي على بابكم   كما ضاء عقد على خالصة

(میرے اشعار تمہارے دروازے پہ ایسے ہی چمک گئے جیسا کہ خالصہ (ہارون رشید کی کنیز) پر ہار کی چمک ہے۔)

ظاہر ہے کہ ''ضاع'' کو ''ضاءَ'' کر دیا، اور مؤاخذہ سے خود کو بچا لیا۔

معلومات کی جانچ

1- موارب کسے کہتے ہیں؟

14.12 موازنہ ومماثلت

14.12.1 موازنہ

یہ محسنات لفظیہ کی دسویں صورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دو فقروں یا دو مصرعوں کے آخری الفاظ: یعنی فاصلے اور قافیے وزن میں متفق ہوں؛ مگر آخری حرف میں مختلف۔ جیسے: قرآن پاک میں ہے: {ونَمارِقُ مصفوفةٌ وزَرابِيُّ مبثوثةٌ} (الغاشية: 16) ۔آیت کریمہ میں ''مصفوفة'' اور ''مبثوثة'' دونوں لفظ ہم وزن ہیں، مگر آخری حرف اصلی میں مختلف۔

14.12.2 مماثلت

یہ موازنہ ہی کی ایک قسم ہے، جس میں دونوں فقرے یا دونوں مصرعے کے تمام یا اکثر الفاظ ہم وزن ہوتے ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {وآتيناهما الكتابَ المُستَبين، وهَدَيناهما الصراطَ المستقيم} (الصافات: 117، 118) ۔دونوں آیت کریمہ کے اکثر الفاظ ہم وزن ہیں، مگر آخری لفظ: یعنی ''مستبين'' اور ''مستقيم'' کا آخری حرف یکساں نہیں۔

معلومات کی جانچ

1- موازنہ کسے کہتے ہیں؟

14.13 ایہام یا توریہ اور اس کی قسمیں

محسنات معنویہ: وہ طریقے جن سے معنوی خوبصورتی پیدا کی جائے محسنات معنویہ کہلاتے ہیں، یہ طریقے حسب ذیل ہیں:

14.13.1 ایہام یا توریہ

محسنات معنویہ کی یہ پہلی قسم ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایسا لفظ استعمال کرنا جس کے دو معنی ہوں، ایک قریب: یعنی مشہور اور دوسرا بعید: یعنی غیر مشہور اور پھر اس لفظ سے قرینہ کی بنا پر بعید: یعنی غیر مشہور معنی مراد لینا۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

يا سيداً حازَ لُطفاً له البرايا عَبِيدُ

أنتَ الحُسَينُ ولكن جَفَاكَ فِينا يَزِيدُ

(اے وہ سردار! جنہوں نے ہر طرح کی توفیق الٰہی کو جمع کر لیا ہے اور ساری مخلوق اس کی غلام ہے۔ آپ تو حسین ہیں، مگر آپ کا ظلم ہم پر بڑھتا جا رہا ہے۔)۔ یہاں یزید کے لفظ سے فائدہ اٹھایا گیا۔

اس کی دوقسمیں ہیں:(1) مجردہ (2) مرشحہ

14.13.1.1 مجردہ

وہ ایہام ہے جس میں معنی قریب کے مناسبات مذکور نہ ہوں۔ جیسے قرآن میں ہے: {وهو الذي يتوفَّاكم بالليل ويعلمُ ما جرَحتم بالنهار} (الأنعام:60)۔آیت کریمہ میں "جرحتم" کے دومعنی ہیں،ایک قریب: یعنی "زخم لگانا" اور یہی معنی مشہور بھی ہے؛اور دوسرا بعید: یعنی "اعضائے جوارح سے کچھ کرنا" اور یہاں یہی معنی مراد ہے؛اور ظاہر ہے کہ معنی قریب کے مناسبات یہاں مذکور نہیں۔

14.13.1.2 مرشحہ

وہ ایہام ہے جس میں معنی قریب کے مناسبات مذکور ہوں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:{والسَّماء بَنَيْنَاها بأيدٍ} (الذاريات: 47)۔ آیت کریمہ میں "أید" سے مراد، قدرت ہے، جو معنی بعید ہے اور قریب معنی ہاتھ کے ہیں اور یہاں اس قریب معنی کے مناسبات سے "بنانے" کا ذکر بہ طور ترشیح ہے۔

معلومات کی جانچ

1- توریہ کسے کہتے ہیں؟

14.14 طباق یا تضاد اور اس کی قسمیں

محسنات معنویہ کی دوسری قسم طباق یا تضاد ہے اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: "الطِّباقُ الجمعُ بينَ الشيء وضِدِّه في الكلام، وهو نوعان: (1) طِباقُ الإيجاب، وهو مالم يختلف فيه الضدان إيجاباً وسلباً۔ (2) طِباقُ السلب، وهو ما اختلف فيه الضدان إيجاباً وسلباً"۔

یعنی کلام میں دو ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جن کے معنی میں تضاد ہو۔اس کی دوقسمیں ہیں:(1) ایجابی (2) سلبی

14.14.1 ایجابی

وہ طباق ہے جس میں حرف نفی استعمال نہ ہو۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:{هو الأول والآخر والظاهر والباطن} (الحديد:3)۔

14.14.2 سلبی

وہ طباق ہے جس میں حرف نفی مذکور ہو۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:{يستخفون من الناس ولا يستخفون من الله} (النساء: 108)۔

14.14.3 مقابلہ

یہ بھی طباق ہی کی ایک قسم ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں دو یا دو سے زائد ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے معنی میں تضاد نہ ہو اور پھر ترتیب وار ان کے مقابل اور متضاد الفاظ ذکر کرنا۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:{فأمَّا من أعطى واتقى وصدَّق بالحُسنى، فسنيسِّره لليُسرىٰ، وأمَّا مَنْ بَخِل واستغنىٰ وكذَّبَ بالحُسنىٰ فسَنيسِّره للعُسرىٰ} (الليل:10-5)۔ظاہر ہے کہ دوسری آیت کریمہ میں پہلی آیت کریمہ کے بالمقابل الفاظ ترتیب وار لائے گئے ہیں۔

14.14.4 تدبیج

اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں متضاد رنگوں کے الفاظ مقابلۃً ذکر کرنا۔ واضح رہے کہ ''تدبیج'' اور ''مقابلہ'' درحقیقت ''طباق'' ہی کی قسمیں ہیں، کیونکہ یہاں بھی مستعمل الفاظ کے معنوں میں تضاد ہوتا ہے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

تردَّى ثيابَ الموتِ حمْراً فما أتىَ　　　لها الليلُ إلاّ وهيَ مِنْ سُندُسٍ خُضْرِ

(اس نے موت کے کپڑے پہن لیے، اس حال میں کہ وہ سرخ تھے، ان کپڑوں پر ایک رات بھی نہیں گذری کہ وہ سبز ریشم میں تبدیل ہوگئے۔)

معلومات کی جانچ

1- طباق کسے کہتے ہیں؟

2- تدبیج کی کیا تعریف ہے؟

14.15 تاکید مدح شبہ ہجو اور تاکید ہجو شبہ مدح

14.15.1 تاکید مدح شبہ ہجو

بہ طور تاکید کسی کی اس طرح تعریف کرنا کہ اس میں ہجو کا شبہ ہونے لگے۔

اس کی دو صورتیں ہیں:

14.15.2 اول: کسی چیز سے بری صفتوں کی نفی کر کے بہ صورت استثنا اس کے لیے کوئی اچھی صفت ثابت کرنا۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

ولا عيبَ فيهم غيرَ أنَّ سيوفَهمْ　　　بهنَّ فُلولٌ من قِراعِ الكَتائِبِ

(ان لوگوں میں کوئی عیب نہیں ہے، البتہ ان کی تلواریں ایسی ہیں جن میں دندانے پڑ گئے ہیں، لشکروں پر بکثرت تلوار کا وار کرتے رہنے کی وجہ سے)۔

14.15.3 دوم: کسی چیز کے لیے ایک اچھی صفت ثابت کرنا اور پھر حرف استثنا لا کر اس کے لیے کوئی دوسری اچھی صفت ذکر کرنا۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

فتىً كمُلتْ أوصافُه غيرَ أنه　　　جوادٌ فما يُبقي على المالِ باقيا

(وہ ایسا نوجوان ہے جس کے اوصاف کامل ہیں، سوائے اس کے کہ وہ ایسا سخی ہے کہ مال میں سے کچھ باقی نہیں رکھتا۔ یعنی سارا مال خرچ کر دیتا ہے۔)

14.15.4 تاکید ہجو شبہ مدح

بہ طور تاکید کسی کی اس طرح ہجو کرنا کہ اس میں مدح کا شبہ ہونے لگے۔

اس کی بھی دو صورتیں ہیں:

14.15.5 اول: کسی چیز سے اچھی صفتوں کی نفی کر کے بہ صورت استثنا اس کے لیے کوئی بری صفت ثابت کرنا۔ جیسے ''اس میں کوئی بھلائی نہیں، سوائے اس کے کہ کام نکالنے کے لیے جھوٹ بولتا ہے'' یا جیسے یہ جملہ: ''لا جمال في الخُطبة إلاّ أنها طويلة في غير فائدة'' (خطبہ میں کوئی خوبصورتی نہیں سوائے اس کے کہ وہ طویل اور بے فائدہ ہے۔)

14.15.6 دوم: کسی چیز کے لیے ایک بری صفت ثابت کرنا اور پھر حرف استثنا لا کر اس کے لیے کوئی دوسری بری صفت ذکر کرنا۔ جیسے: ''وہ بڑا بے وفا ہے، مگر گناہوں کا وعدہ پورا کرتا ہے''۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

هو الكلبُ إلاّ أنّ فيه مَلالةً وسُوءَ مُراعاةٍ، وماذاکَ في الكلبِ

(وہ شخص تو کتا ہے مگر اس میں بے قراری اور بے حفاظتی ہے اور یہ دونوں باتیں کتے میں نہیں ہیں)۔

معلومات کی جانچ

1- تاکید مدح شبہ ہجو کی تعریف کریں۔

2- تاکید ہجو شبہ مدح کی تعریف کریں۔

14.16 تناسب یا مراعات نظیر اور ایہام تناسب

14.16.1 تناسب یا مراعات نظیر

کلام میں دو یا دو سے زائد چیزوں کو بغیر کسی تضاد کے معنوی مناسبت کی وجہ سے جمع کرنا۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {وهو السميع البصير} (الشوریٰ: 11)۔ ظاہر ہے کہ ''سميع'' اور ''بصير'' ایک دوسرے کے مناسب ہے اور کوئی تضاد نہیں۔

14.16.2 ایہام تناسب

یہ تناسب ہی کی ایک صورت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں جن چیزوں کو جمع کیا جائے؛ ان میں بہ ظاہر کوئی مناسبت نہ ہو، مگر کسی دوسرے معنی کے اعتبار سے مناسبت کا وہم ہو۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {الشمس والقمر بحسبان والنجم والشجر يسجدان} (الرحمن: 6-5)۔ آیت کریمہ میں ''نجم'' سے مراد پودا ہے اور ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے یہ ''شمس و قمر'' کے مناسب نہیں؛ مگر یہ لفظ ستارہ کے معنی پر بھی دلالت کرتا ہے، لہٰذا اس اعتبار سے شمس و قمر کے مناسب ہے۔

معلومات کی جانچ

1- تناسب کی تعریف کریں۔

14.17 مشاکلہ

کسی چیز کو ایسے لفظ سے تعبیر کرنا جو اس کے لیے موضوع نہیں ہے؛ مگر دونوں ایک ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {قالو إنا معكم إنما نحن مستهزؤن، الله يستهزئ بهم} (البقرة: 15-14)۔ آیت کریمہ میں اللہ کے لیے ''يستهزئ'' کا استعمال ''مستهزؤن'' کی مناسبت سے بہ طور مشاکلہ ہوا ہے؛ ورنہ استہزا کی نسبت اللہ پاک کی طرف صحیح نہیں۔

معلومات کی جانچ

1- مشاکلہ کی تعریف کریں۔

14.18 ارصاد

اثنائے کلام میں ایسا لفظ لانا جس سے دوسرے مصرعہ کے قافیہ یا دوسرے جملہ کے آخری لفظ کا پتہ چل جائے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وقَبْلَ الْغُرُوْب} (ق: 39)۔ آیت کریمہ میں سامع جب "قبل طلوع الشمس" سنے گا تو اس سے جان لے گا کہ آگے "وقبل الغروب" آنے والا ہے۔

معلومات کی جانچ

1- ارصاد کی تعریف کریں۔

14.19 استخدام

کسی لفظ کو ذکر کرکے اس سے ایک معنی صراحۃً مراد لیے جائیں اور دوسرے معنی اس کی طرف ضمیر لوٹا کر یا ایک معنی ایک ضمیر لوٹا کر اور دوسرے معنی دوسری ضمیر لوٹا کر۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {فمن شهد منكم الشهر فليصمه} (البقرة: 185)۔ آیت کریمہ میں پہلے لفظ "شهر" سے ہلال مراد لیا گیا ہے اور پھر اس کی طرف "فليصمه" کی ضمیر مفعول بہ لوٹا کر ایام رمضان مراد لیے گئے۔

معلومات کی جانچ

1- استخدام کی تعریف کریں۔

14.20 لف ونشر اور اس کی قسمیں

لف ونشر یا "طي و نشر" یعنی چند چیزوں کو اجمالاً یا تفصیلاً ذکر کرکے پھر بلا تعیین ہر ایک کے مناسبات ذکر کیے جائیں، اس کی دو قسمیں ہیں: (1) مرتب (2) غیر مرتب۔

14.20.1 مرتب

جس ترتیب سے چند چیزوں کو ذکر کیا جائے اسی ترتیب سے ان میں سے ہر ایک کے مناسبات بھی ذکر کیے جائیں۔ جیسے قرآن میں ہے: {ومن رحمته جعل لكم الليل والنهار لتسكنوا فيه ولتبتغوا من فضله} (القصص: 73)۔ آیت کریمہ میں پہلے "لیل" اور "نہار" کو ذکر کیا گیا ہے اور پھر اسی ترتیب سے دونوں کے مناسبات ذکر کیے گئے ہیں؛ چنانچہ "لتسكنوا فيه" لیل سے متعلق ہے اور "لتبتغوا من فضله" نہار سے متعلق ہے۔

اور جیسے شاعر کا قول ہے:

ثَلاثةٌ تُشْرِقُ الدُّنيا بِبَهْجَتِها شَمْسُ الضُّحیٰ وأبواسحاقَ والقَمَرُ

(تین چیزیں ایسی ہیں جن کی رونق سے دنیا منور ہوگئی: سورج، ابواسحاق اور چاند)

14.20.2 غیر مرتب

جس ترتیب سے چند چیزیں ذکر کی جائیں اسی ترتیب سے ان کے مناسبات ذکر نہ کیے جائیں، بلکہ ترتیب بدل دی جائے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {فمحونا آیة اللیل وجعلنا آیة النهار مبصرة لتبتغوا فضلاً من ربکم ولتعلموا عدد السنین والحساب} (الإسراء: 12)۔آیت کریمہ میں پہلے ''لیل'' اور پھر ''نهار'' کو ذکر کیا گیا ہے اور بعد میں ترتیب الٹ کر ''لتبتغوا فضلاً من ربکم'' جو نهار سے متعلق ہے؛ اسے پہلے اور ''لتعلموا عدد السنین والحساب'' جو لیل سے متعلق ہے؛ اسے بعد میں لایا گیا ہے۔

معلومات کی جانچ

1- لف ونشر کسے کہتے ہیں۔

14.21 جمع وتفریق اور تقسیم

14.21.1 جمع

دو یا دو سے زیادہ چیزوں کو ایک حکم میں جمع کر دینا۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {واعلموا أنما أموالکم وأولادکم فتنة} (الأنفال: 28) یا جیسے شاعر کا قول ہے:

إن الشَّباب والفراغ والجِدَةَ مَفْسَدَةٌ لِلْمرْءِ أيُ مَفْسَدَةٍ

(بلاشبہ جوانی، فراغت اور مالداری ایک انسان کو کلی طور پر خراب وتباہ کر دینے والی چیزیں ہیں۔)

14.21.2 تفریق

ایک نوعیت کی دو چیزوں کے درمیان فرق ظاہر کر دینا۔ جیسے قرآن میں ہے: {وما یستوي البحران هذا عذب فرات سائغ شرابه وهذا ملح أجاج} (فاطر: 12)۔آیت کریمہ میں دونوں دریاؤں کے درمیان فرق ظاہر کر دیا گیا کہ دونوں برابر نہیں، بلکہ ایک شیریں وخوش گوار؛ اور دوسرا کھارا اور تلخ ہے۔

14.21.3 تقسیم

چند چیزوں کو ذکر کر کے پھر علی التعیین ہر ایک کے مناسب احوال وصفات ذکر کرنا۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {کذبت ثمود وعاد بالقارعة، فأما ثمود فأهلکوا بالطاغیة، وأما عاد فأهلکوا بریح صرصر عاتیة} (الحاقة: 6-4)

تقسیم کے مزید دو مفہوم اور بیان کیے جاتے ہیں: اول یہ کہ کسی شئے کی تمام قسموں کا احاطہ کر لینا۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {له ما في السموات وما في الأرض وما بینهما وما تحت الثرئ} (طٰہٰ: 6) اور دوم یہ کہ پہلے ایک چیز ذکر کر کے اس کے مناسب حال ذکر کرنا اور پھر دوسری چیز ذکر کر کے اس کے مناسب حال ذکر کرنا۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {فسوف یأتي الله بقوم یحبهم ویحبونه أذلةٍ علی المؤمنین أعزةٍ علی الکافرین یجاهدون في سبیل الله ولا یخافون لومة لائم} (المائدة: 54)۔آیت کریمہ میں ''الله'' کو ذکر کر کے اس کے مناسب حال ''یحبهم'' ذکر کیا گیا اور ''قوم'' کو ذکر کر کے اس کے مناسب حال ''یحبونه أذلة علی المؤمنین'' ذکر کیا گیا۔

معلومات کی جانچ

1- جمع وتفریق کی تعریف کریں۔

14.22 تجریداوراس کی قسمیں

14.22.1 تجرید

ایک شئ جو کسی وصف کے ساتھ متصف ہے اس کے وصف میں مبالغہ کرنے کے لیے اس شئ سے اسی وصف کے ساتھ متصف کسی دوسری شئ کو نکالنا؛ تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ وہ پہلی شئ اس صفت میں ایسی کامل ہے؛ کہ اس سے ایک اور شئ اسی طرح نکل سکتی ہے، تجرید کی دو صورتیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

14.22.2 **اول:** یہ کہ کسی حرف کے واسطہ سے تجرید ہو۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: **{ولهم فيها دار الخلد} (حم السجدة: 28)**۔ آیت کریمہ میں حرف "**في**" کے واسطہ سے تجرید ہے۔

14.22.3 **دوم:** یہ کہ بغیر کسی حرف کے واسطہ سے ہو۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: **{وإن نكثوا أيمانهم من بعد عهدهم وطعنوا في دينكم فقاتلوا أئمة الكفر} (التوبة: 12)**۔ آیت کریمہ میں مذکورہ اوصاف کے ساتھ متصف کافروں کو کفر کا سردار اور امام کہا گیا ہے کہ یہ لوگ ان اوصاف کی وجہ سے کفر میں اس حد کو پہنچ گئے ہیں کہ ان سے کفر کا سرغنہ تیار ہوتا ہے؛ جن کی امامت ان کے سر ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تجرید کسی حرف کے واسطہ کے بغیر ہے۔

معلومات کی جانچ

1- تجرید کی تعریف بیان کریں۔

14.23 مبالغہ اوراس کی قسمیں

14.23.1 مبالغہ

کسی وصف کی خوبی یا خامی کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ وہ زیادتی یا کمی میں اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ جو محال یا بعید از عقل ہے، اس کی تین قسمیں ہیں: (1) تبلیغ (2) اغراق (3) غلو۔

14.23.2 **تبلیغ:** وصف میں کمی یا زیادتی کا دعویٰ، اگر عقلاً وعادتاً ممکن ہے؛ تو اسے "تبلیغ" کہتے ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: **{ظلمات بعضها فوق بعض إذا أخرج يده لم يكد يراها} (النور: 40)**۔

14.23.3 **اغراق:** دعویٰ اگر عقلاً ممکن مگر عادتاً محال ہے تو اسے "اغراق" کہتے ہیں۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

ونُكْرِمُ جارَنا مادامَ فِينَا ونُتْبِعُه الكَرامةَ حيثُ مالاَ

(ہم اپنے پڑوسی پر احسان کرتے ہیں جب تک وہ ہمارے پاس رہے اور ہم اس کے پیچھے احسان کو بھیجتے ہیں جہاں وہ جائے)۔

14.23.4 غلو: دعویٰ اگر عقلاً بھی محال ہو اور عادتاً بھی، تو اسے ''غلو'' کہتے ہیں۔ جیسے یہ شعر:

تكاد قسيّه من غير رام تُمكن في قلوبهم النبالاَ

(ان کی کمانیں بغیر تیر انداز کے ان کے دلوں میں تیر پیوست کر دیتی ہیں)۔

معلومات کی جانچ

1- مبالغہ کی تعریف کریں۔

14.24 توجیہ، تجاہل عارف اور قول بالموجب

14.24.1 توجیہ

اس طرح کلام کرنا جس سے دو مختلف معنوں کا احتمال نکلتا ہو۔ جیسے یک چشم (کانا) کو دعا دینا؛ کہ ''سوى الله لك عينيك'' اس کا ایک مطلب تو یہ ہوسکتا ہے کہ خراب آنکھ کو اچھی کر دے؛ اس صورت میں یہ دعا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اچھی آنکھ کو بھی خراب کر دے؛ اس صورت میں یہ بددعا ہے۔

14.24.2 تجاہل عارف

کسی نکتہ کے تحت اس طرح کلام کرنا جس سے معلوم شئے سے عدم واقفیت ظاہر ہو؛ بہ الفاظ دیگر جان بوجھ کر انجان بننا ''تجاہل عارف'' کہلاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے: {أفسحر هذا أم أنتم لا تبصرون} (الطور: 15)۔

14.24.3 قول بالموجب

متکلم اپنے کلام میں ایک صفت کو کسی شئے کے لیے ثابت کر کے اس پر کوئی حکم مرتب کرے؛ مگر مخاطب اسی صفت کو کسی دوسری شئے کے لیے ثابت کر دے؛ البتہ اس حکم کے ثبوت یا عدم ثبوت سے کوئی بحث نہ کرے۔ جیسے کوئی ظالم خود کو حق دار سمجھ کر کسی کا حق مارنا چاہے اور کہے: ''سيأخذ المستحق حقه'' مگر وہ حق اس کو نہ ملے اور صحیح حق دار کو مل جائے؛ تو اس وقت مخاطب کہے: ''لقد أخذ المستحق حقه''۔ دیکھیے متکلم نے خود کو حق دار سمجھا اور اپنے ہی لیے حق کے لینے کا حکم لگایا؛ مگر مخاطب نے اس حق دار کی صفت دوسرے صحیح حق دار کے لیے ثابت کر دی؛ مگر متکلم کو حق ملا یا نہیں ملا؛ اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور جیسے قرآن پاک میں ہے: {يقولون لئن رجعنا إلى المدينة ليخرجن الأعز منها الأذل ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين} (المنافقون: 8)۔ منافقوں نے اپنے لیے عزت کی صفت اور مومنین کے لیے ذلت کی صفت ثابت کر کے اس پر مومنین کو مدینہ سے نکال دینے کا حکم مرتب کیا؛ تو اللہ پاک نے عزت کی صفت مومنین کے لیے اور ذلت کی صفت منافقین کے لیے ثابت فرما دی اور اخراج مدینہ کے حکم کے ثبوت یا عدم ثبوت کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔

معلومات کی جانچ

1- تجاہل عارف کا کیا مفہوم ہے؟

2- قول بالموجب کسے کہتے ہیں؟

14.25 اقتباس

یہاں سے ان اقسام کا ذکر ہے جن میں محسنات لفظیہ اور معنویہ دونوں کی خوبیاں ہوتی ہیں۔

اقتباس: نثر یا نظم میں قرآن یا حدیث کا کچھ حصہ اس طرح لانا کہ معلوم نہ ہو سکے کہ یہ قرآن یا حدیث کا ٹکڑا ہے۔ جیسے ''اگر تم مجھے داغ فراق ہی دینے پر آ گئے ہو تو صبر جمیل''۔ یہاں ''صبر جمیل'' قرآن پاک سے اقتباس ہے اور جیسے ''تم مجھے بار بار دھوکہ نہیں دے سکتے، کیونکہ مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا''۔ یہاں ''مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا'' حدیث ''لا يُلْدَغُ المؤمنُ مِن جُحْرٍ مَرَّتين'' سے اقتباس ہے اور جیسے شاعر کا قول ہے:

لا تَكُنْ ظالماً ولا تَرضَ بالظُّلمِ وأَنْكِرْ بِكُلِّ ما يُسْتَطاعُ

يومَ يأتي الحِسابُ بالظَّلومِ ما مِنْ حَمِيمٍ ولا شَفِيعٍ يُطاعُ

(تو خود ظالم نہ بن اور نہ ہی ظلم سے راضی ہو اور ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کو ظلم سے منع کر، جس دن کے روز حساب میں بڑے ظالم کی سزا آ پہنچے گی تو نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ سفارشی جس کی بات مانی جائے)

اس مثال میں '' مِنْ حَمِيمٍ ولا شَفِيعٍ يُطاعُ'' قرآن کریم کی آیت {مَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ ولا شَفِيعٍ يُطاعُ} (غافر: 18) سے اقتباس ہے۔

معلومات کی جانچ

1- اقتباس کی تعریف کریں۔

14.26 تضمین و تلمیح

14.26.1 تضمین

اپنی نظم میں دوسرے کسی شاعر کا کوئی شعر یا اپنے شعر میں دوسرے کا کوئی مصرع شامل کرنا۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

إذا ضَاقَ صَدْري وخِفْتُ العِدَى تَمَثَّلْتُ بيتاً بِحالِي يَلِيْقُ

فَبِاللهِ أَبلُغُ ما أَرتَجِيْ وبِاللهِ أَدْفَعُ ما لا أُطِيْقُ

(جب میرا سینہ تنگ ہوتا ہے اور میں دشمنوں کا خوف محسوس کروں تو اپنے حال کی تمثیل بیان کرتا ہوں ایک ایسے شعر سے جو میرے لیے زیادہ مناسب ہے، بس میں اللہ ہی کی مدد و توفیق سے اپنی مراد کو پاتا ہوں اور اللہ ہی کی مدد و توفیق سے ایسے ضرر کو دور کرتا ہوں جس کے دفع کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔) ''تَمَثَّلْتُ بيتا'' کی تعبیر بتا رہی ہے کہ دوسرا شعر کسی اور کا ہے جس کو یہ شاعر بطور مثال پیش کر رہا ہے۔

14.26.2 تلمیح

کلام میں کسی آیت یا حدیث، یا شعر یا قصہ، کہاوت کی طرف اشارہ کرنا۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {هل آمنكم عليه إلا كما أمنتم على أخيه من قبل} (یوسف: 64)۔ حضرت یعقوبؑ نے اس کلام میں اپنے بیٹوں کو ان کے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں وعدہ

خلافی کے واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا۔

معلومات کی جانچ

1- تضمین کسے کہتے ہیں؟

14.27 عقد وحل، تشبیب یا حسن ابتدا

14.27.1 عقد وحل

نثر کو نظم میں اور نظم کو نثر میں منتقل کرنا۔ جیسے متنبی کا یہ شعر:

والظلم من شِيَمِ النفوسِ وان تجد ذا عِفّمٍ، فلعلة لا يظلم

(اور ظلم کرنا انسانوں کی عادت ہے، سو اگر تو کوئی ایسا شخص دیکھے جو ظلم سے محفوظ ہے تو وہ کسی سبب کی وجہ سے ظلم نہیں کر رہا ہے)۔

شاعر نے اس شعر میں کسی شخص کا یہ قول منظوم کر دیا ہے: "الظلم من طباع النفس، وإنما يصدها عنه إحدى علتين: دينية، وهي خوف المعاد؛ ودنيوية، وهي خوف العقاب الدنيوي"۔

دوسرے یعنی نظم کو نثر میں منتقل کرنے کی مثال: کسی حکیم کا یہ قول ہے: "العِيادَةُ سُنَّةٌ مأجورةٌ، ومَكْرُمَةٌ مأثُورةٌ، ومع هذا فنحن المَرْضىٰ ونحن العُوّاد، وكُلُّ وِدادٍ لا يَدُومُ فليس بِوِدادٍ"۔ اس مضمون میں شاعر کے اس شعر کو نثر میں بیان کر دیا گیا ہے:

إذا مَرِضْنا أتَيْناكُم نَعُودُكُمْ وتُذْنِبُونَ فَنَأتِيكُمْ ونَعْتَذِرُ

(جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو تمہارے پاس آ کر تمہاری عیادت کرتے ہیں اور تم جرم کرتے ہو، مگر ہم تمہارے پاس آتے ہیں اور عذر خواہی کرتے ہیں)۔

14.27.2 تشبیب یا حسن ابتدا

آغاز کلام میں خوب صورت اور دلچسپ الفاظ، عمدہ اور مناسب ترکیبیں، صحیح اور لطیف معانی، اونچے اور بلند خیالات کا لانا؛ تاکہ مخاطب کو شروع ہی سے کلام کے سننے کی رغبت اور شوق ہو جائے۔ جیسے شاعر نے اپنے ممدوح کو بیماری سے شفایاب ہونے کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے یوں کہا ہے:

المَجْدُ عُوفِيَ إذ عُوفيتَ والكَرَمُ وزالَ عَنْکَ إلى أعدائک السَّقَمُ

(آپ کے شفایاب ہونے سے بزرگی اور سخاوت نے شفا پائی، اور بیماری آپ سے رخصت ہو کر آپ کے دشمنوں کو پہنچ گئی)۔

معلومات کی جانچ

1- تشبیب یا حسن ابتدا کسے کہتے ہیں؟

14.28 براعت استہلال، براعت طلب

14.28.1 براعت استہلال

شروع کلام میں ایسے الفاظ لانا، جو مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوں۔ جیسے ایک شاعر نے محل کی تعمیر کی مبارکباد دیتے ہوئے یوں کہا ہے:

قصرٌ عليه تَحِيّةٌ وسلامٌ خَلَعَتْ عَلَيْهِ جَمالَهَا الأيّامُ

(یہ ایک ایسا محل ہے جس پر ہماری دعا وسلام پہنچے۔ اس کو زمانہ نے اپنا جمال عطا کیا)۔

14.28.2 براعت طلب

اپنی طلب کی صراحت کیے بغیر انوکھے انداز پر اپنی خواہش کی طرف اشارہ کرنا۔ جیسے قرآن پاک میں ہے: {ونادى نوح ربه فقال ربي إن ابني من أهلي} (ھود:45)۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے لیے اشارۃً نجات طلب کی، مگر اس طلب کی صراحت نہیں فرمائی۔

اور جیسے شاعر کا قول ہے:

وفي النَّفْسِ حاجاتٌ وفِيْکَ فَطانَةٌ سُکُوْتِيْ کَلامٌ عِنْدَها وَخِطابُ

(میرے دل میں چند مرادیں ہیں اور تجھ میں ایسی دانائی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے میرا چپ رہنا کلام اور خطاب ہے)۔

معلومات کی جانچ

1- براعت استہلال کسے کہتے ہیں۔

14.29 گریز یا حسن تخلص، حسن انتہا یا حسن اختتام

14.29.1 گریز یا حسن تخلص

افتتاحی گفتگو سے گریز کرتے ہوئے مقصد کی طرف اس انداز سے منتقل ہونا کہ مقصد اور اس افتتاحی گفتگو کے درمیان مناسبت جھلکتی ہو۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

دَعَتِ النَّوىَ بِفِراقِهِم فَتَشَتَّتُوْا وقَضَى الزَّمانُ بينهم فَتَبَدَّدُوْا

وهُوَ ذَمِيْمُ الحالَتَيْنِ فَما به شَيْئٌ سِوىَ جُوْدِ بْنِ اَرْتَقَ يُحْمَدُ

(دوری نے ان کے حق میں فراق کو چاہا تو وہ منتشر ہو گئے اور زمانہ نے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا تو وہ متفرق ہو گئے، زمانہ دو بری حالتوں والا ہے، سو اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی تعریف کی جائے سوائے ابن ارتق کی سخاوت کے)۔

14.29.2 حسن انتہا یا حسن اختتام

آخر کلام میں الفاظ کی شیرینی، ترکیب وترتیب کی عمدگی اور معنی کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے دل میں اتر جانے والی بات پر گفتگو ختم کرنا۔ جیسے کسی شاعر کا قول ہے:

بَقِيْتَ بَقاءَ الدَّهْرِ يا کَهْفَ أهْلِه وهذا دُعاءٌ لِلْبَرِيّةِ شامِلُ

(آپ زمانہ کے باقی رہنے تک زندہ رہیں اے زمانہ والوں کی جائے پناہ! اور یہ دعا سب مخلوق کو شامل ہو۔)

معلومات کی جانچ

1- حسن تخلص کسے کہتے ہیں؟

14.30 اکتسابی نتائج

بدیع کی دو قسمیں ہیں: محسنات لفظیہ اور محسنات معنویہ۔ محسنات لفظیہ کی مشہور قسمیں یہ ہیں: جناس، تشابہ اطراف، تصدیر، سجع، تشریع، قلب، التزام، عکس، موارابہ اور موازنہ۔ اسی طرح محسنات معنویہ کی مشہور قسمیں یہ ہیں: توریہ، طباق، تاکید مدح شبہ ہجو، تاکید ہجو شبہ مدح، تناسب یا مراعات نظیر، ایہام تناسب، مشاکلہ، ارصاد، استخدام، لف ونشر، جمع، تفریق، تقسیم، تجرید، مبالغہ، توجیہ، تجاہل عارف اور قول بالموجب، اور ایک تیسری قسم بھی کی جاتی ہے جس میں ایسے جملے یا اشعار آتے ہیں جن میں محسنات لفظیہ اور معنویہ دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، اس کی مشہور قسمیں یہ ہیں: اقتباس، تضمین، تلمیح، عقد وحل، تشبیب یا حسن ابتدا، براعت استہلال، براعت طلب، گریز یا حسن تخلص، حسن انتہا یا حسن اختتام۔

14.31 امتحانی سوالات کے نمونے

ا۔ درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے:

1- سجع اور اس کی اقسام پر روشنی ڈالیے۔

2- مبالغہ اور اس کی اقسام لکھیے۔

3- قول بالموجب کی وضاحت کیجیے۔

4- اقتباس، تضمین اور تلمیح پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

ب۔ درج ذیل سوالات کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے:

1- جناس کی تعریف اور اس کی اقسام لکھیے۔

2- طباق یا تضاد اور اس کی اقسام پر مفصل لکھیے۔

3- لف ونشر، تاکید مدح شبہ ہجو اور تاکید ہجو شبہ مدح پر ایک نوٹ لکھیے۔

14.32 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1- مختصر المعاني — سعد الدین تفتازانی

2- البلاغة الواضحة — مشترکہ تصنیف: علی الجارم و مصطفی امین

3- دروس البلاغة — مشترکہ تصنیف: حفنی ناصف، محمد دیاب، سلطان محمد، مصطفی طمّوم

اکائی 15 عروض وقافیہ: تعریف اور اہمیت

اکائی کے اجزا

15.1 تمہید

15.2 مقصد

15.3 عروض کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

15.4 وجہ تسمیہ

15.5 علم عروض کی ابتدا

15.6 خلیل بن احمد الفراہیدی

15.7 علم عروض کے فوائد

15.8 عروضی تحریر

15.9 عربی شاعری کی بحریں

15.10 عروضی اصطلاحیں

15.11 قافیہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

15.12 حروف القافیہ

15.13 حرکات کے اعتبار سے قافیہ کی قسمیں

15.14 حروف کے اعتبار سے قافیہ کی قسمیں

15.15 قافیہ کے عیوب

15.16 حرکات قافیہ

15.17 اکتسابی نتائج

15.18 امتحانی سوالات کے نمونے

15.19 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

15.1 تمہید

عربی زبان کو قرآن کریم کی زبان ہونے کے ساتھ یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس زبان کے علما اور فضلا نے بہت سے علوم وضع کیے جو عربی زبان سے پہلے کسی زبان میں نہیں پائے جاتے تھے۔ اگر کسی زبان میں موجود تھے تو بھی ان کی صورت با قاعدہ علم کی نہیں تھی، بلکہ ان کے متعلق کچھ معلومات غیر مربوط اور غیر مرتب صورت میں جمع کر دی گئی تھی۔ ایسے ہی ایک علم کا نام علم عروض ہے۔ اس علم کے موجد اور اس کے قواعد اور اصول کو الخلیل بن احمد الفراھیدی نے وضع کیا۔ یہ علم ''شاعری'' کے اصول اوزان اور قوافی سے بحث کرتا ہے۔ اس اکائی میں ہم اس علم کے معنی اور اہمیت سے متعلق گفتگو کریں گے اور اس کی بنیادی اصطلاحوں کو بھی جانیں گے۔

شعر کی سب سے مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ موزوں اور مقفی کلام ہے۔ موزوں کا مطلب یہ ہے کہ وہ شعری بحور میں سے کسی بحر کے وزن پر ہو اور مقفی کا مطلب یہ ہے کہ اس میں قافیہ بھی پایا جاتا ہو۔ ابن رشیق نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب **العمدة** میں لکھا ہے:

''نیت کے بعد شعر چار چیزوں کا مرکب ہوتا ہے، لفظ، وزن، معنی اور قافیہ۔''

موزوں اور مقفی کلام اگر شاعری کی غرض سے نہ کہا گیا ہو تو وہ شاعری نہیں ہے۔

اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ قافیہ کیا ہے؟ شاعری میں اس کی کیا اہمیت ہے اور اس کی کتنی صورتیں ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

سأكذب من قد كان يزعم أنني إذا قلت قولا لا أجيد القوافيا

15.2 مقصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ:

☆ عروض وقافیہ کے لغوی واصطلاحی مفہوم سے واقف ہو سکیں گے۔

☆ عروض وقافیہ کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔

☆ عروض کے فوائد سے واقف ہو سکیں گے۔

☆ عروض کی بنیادی اصطلاحوں سے واقف ہو سکیں گے۔

☆ تقطیع کے معنی سے واقف ہو سکیں گے۔

☆ قافیہ کی قسموں سے واقف ہو سکیں گے۔

☆ قافیہ کے عیوب سے آگاہ ہو سکیں گے۔

☆ روی اور قافیہ کا فرق جان سکیں گے۔

15.3 عروض کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

عروض کے لغوی معنی ناحیة (گوشہ) الطریق الصعب (مشکل راستہ) الحاجة (ضرورت) کے ہیں، عروض مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام بھی ہے۔

شاعر کا کہنا ہے:

فان يعرض أبو العباس عني ويركب بي عروضا عن عروض

اس شعر میں عروض "ناحية"یعنی گوشے اور کنارے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔عربی میں کہا جاتا ہے: أنت معي في عروض لاتلائمني۔ یعنی تم میرے ساتھ اس مقام پر ہو جو مجھے زیب نہیں دیتا۔

اصطلاحی معنی میں عروض وہ علم ہے جس کے ذریعے صحیح اور غلط شعر میں فرق کیا جاتا ہے اور اس کی کمیوں اور خامیوں کا پتا لگایا جاتا ہے۔

15.4 وجہ تسمیہ

علم عروض کی وجہ تسمیہ مندرجہ ذیل طور پر بیان کی گئی ہیں:

۱۔ خلیل بن احمد افراہیدی کو یہ علم مکہ میں الہام ہوا اور مکہ کا ایک نام عروض بھی ہے، لہٰذا اس کا نام عروض رکھ دیا گیا۔

۲۔ العروض علوم کا ایک گوشہ ہے، اسی لیے اس کا نام عروض رکھ دیا گیا، جس کے معنی گوشے کے ہیں۔

۳۔ عرض، یعرض، عرضا کے لغوی معنی پیش کرنا ہے، چونکہ اشعار کو اس علم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جو اشعار اس کے مطابق ہوتے ہیں وہ صحیح ہوتے ہیں اور جو اس کے مخالف ہوتے ہیں غلط ہوتے ہیں اس لیے اس کو علم العروض، کا نام دیا گیا۔

بعض علما کا ماننا ہے کہ یہ تیسری رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ان میں امام بدرالدین دمامینی (متوفی 1424ء) پیش پیش ہیں۔

15.5 علم عروض کی ابتدا

خلیل بن احمد الفراھیدی نے علم عروض کیوں وضع کیا؟ اس سلسلے میں مختلف آرا اور اقوال ملتے ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ خلیل کو سیبویہ کی بڑھتی ہوئی شہرت اور قبول عام سے پریشانی تھی۔ لہٰذا انھوں نے حج کے دوران اللہ سے دعا مانگی کہ وہ انہیں ایسا علم الہام کرے جو ان سے پہلے کسی کے وہم و گمان میں نہ آیا ہو۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور یہ علم ان کو الہام کیا۔ اس قول کی تائید میں بعض حضرات خلیل کے یہ اشعار پیش کرتے ہیں:

علم الخليل رحمة الله عليه سببه ميل الورى لسيبويه

فخرج الإمام ...للحرم يسال رب البيت من فيض الكرم

فزاده علم العروض فانتشر بين الورى فأقبلت له ...

یہ رائے اس لیے صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ سیبویہ خلیل کے شاگرد تھے اور تمام تر شہرت اور مقبولیت کے باوجود خلیل سے آگے نہیں نکل پائے تھے۔ خلیل کا اپنا علمی مقام اور مرتبہ مسلم تھا۔

۲۔ ایک رائے یہ ہے کہ خلیل اپنے زمانے کے بعض شعرا کی شاعری سے مطمئن نہیں تھے۔ یہ شعرا ایسے اوزان کا استعمال کر رہے تھے جو عربی شاعری میں سرے سے موجود ہی نہیں تھے۔ لہٰذا خلیل نے عربی اوزان کو منظم کرنے کی ٹھانی اور علم عروض کی بنیاد ڈالی۔

۳۔ خلیل سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو علم عروض کا خیال کیسے آیا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ میں مدینے سے گزر رہا تھا، راستے میں مجھے ایک

بزرگ دکھائی دیے، ایک گھر کے دروازے پر بیٹھے وہ ایک بچے کو کچھ اس طرح سکھا رہے تھے:

نعم لا نعم لا لا نعم لا نعم نعم   نعم لا نعم لالانعم لا نعم لالا

میں ان کے قریب گیا اور ان سے پوچھا کہ جناب آپ اس بچے کو کیا سکھا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ ان کا موروثی علم ہے۔ اس کو 'التنعیم' کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں ''نعم'' کا استعمال ہوتا ہے۔ خلیل کہتے ہیں میں نے واپس آ کر علم عروض کی بنیاد رکھی اور اس کے اصول اور قواعد کو منظم کر کے محفوظ کر دیا۔

گفتگو کے خلاصے کے طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وجہ یا سبب جو بھی رہا ہو، خلیل نے علم عروض کی بنیاد ڈالی، دن اور رات محنت کر کے اس کے اصول اور قواعد مرتب کیے۔ اس عرق ریزی اور علمی مشقت کے بعد انھوں نے ۱۵ (پندرہ) بحروں کی شناخت کی۔ یہ وہ بحریں ہیں جو شاعری میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان بحروں کے قواعد اور اصول بنائے۔ خلیل کے بعد ان کے شاگرد اخفش نے ایک بحر کا اضافہ کیا جس کا نام ''المتدارک'' ہے۔

علم عروض غالباً تنہا ایسا علم ہے جس کی وضع و ایجاد فرد واحد کی جانب منسوب ہے۔ ورنہ عموماً ہر علم و فن کی ایجاد میں متعدد افراد بلکہ متعدد نسلوں کی کدوکاوش شامل ہوتی ہے۔ کسی علم کو اس کے تمام اصول و قواعد کے ساتھ کوئی ایک فرد ایجاد کرے اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ اسی لیے علم عروض کی وضع و ایجاد کو کلی طور پر خلیل کی طرف منسوب کرنے میں بعض افراد نے شک و شبہے کا اظہار کیا ہے۔

15.6 خلیل بن احمد الفراھیدی

خلیل کا پورا نام خلیل بن احمد الفراھیدی الازدی البصری ہے۔ ان کی پیدائش 100ھ مطابق 718ء میں اور وفات 170ھ مطابق 786ء میں ہوئی۔ خلیل کا شمار دوسری صدی ہجری کے ادب اور لغت کے ماہر اور نامور علما میں ہوتا ہے۔ ابن خلکان نے خلیل کو ''علم نحو کا امام'' کہا ہے۔ یاقوت الحموی نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف **معجم الادباء** میں لکھا ہے کہ خلیل بن احمد کو علم عروض کو وضع کرنے، عربی زبان کی حفاظت کرنے اور عربی شاعری کو جمع کرنے میں اولیت حاصل ہے۔ خلیل موسیقی کا بھی شغف رکھتے تھے۔ انہیں سروں سے واقفیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے شعری بحور کو جمع کرنا اور وضع کرنا آسان ہو گیا۔ خلیل بن احمد الفراھیدی کی دوسری اہم کتابیں **کتاب العین، کتاب النغم، کتاب الإیقاع، کتاب النقط و الشکل** وغیرہ ہیں۔

القفطی نے **کتاب الأنباۃ و الرواۃ** میں خلیل کو علم، ادب اور زہد میں تمام ادبا اور علمائے لغت کا سردار کہا ہے۔ خلیل کو 'علم عروض' کے وضع کرنے ہی میں اولیت حاصل نہیں ہے، بلکہ عربی زبان میں 'معاجم' کی ابتدا بھی ان کی کتاب '**کتاب العین**' سے ہوتی ہے۔ خلیل بن احمد کے تلامذہ کی فہرست میں بڑے بڑے علما کے نام شامل ہیں۔ ان میں سیبویہ 'الاصمعی' الکسائی، وھب بن جریر اور عبداللہ بن اسحاق کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

خلیل کے علم عروض کے وضع کرنے سے پہلے بھی عرب شاعری کے اوزان سے مناسبت رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے ابو عمرو بن العلاء متوفی 154ھ مطابق 771ء نے قافیے اور اس کے اصول و ضوابط کے سلسلے میں خلیل سے پہلے گفتگو کی اور اس کی اصطلاحات بھی وضع کیں۔

الشعر صعب وطويل سلمه إذا رقى فيه الذي لا يعلمه
ذلت به إلى الحضيض قدمه يريد أن يعربه فيعجمه

15.7 علم عروض کے فوائد

۱۔ علم عروض کے جاننے سے صحیح اور غلط شعر میں تمیز کرنی آتی ہے۔

۲۔ شاعری اور سجع (یعنی ایسا کلام جو با قافیہ ہو لیکن باوزن نہ ہو) میں فرق معلوم ہو پاتا ہے۔ دو یا دو سے زائد فقروں کے آخری کلمات کے آخری حروف کی موافقت کو سجع کہتے ہیں، جیسے: اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان: "رحم اللہ عبدا قال خیرا فغنم او سکت فسلم"۔

۳۔ اس بات پر یقین اور ایمان مضبوط ہوتا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث نبوی شاعری نہیں ہیں کیونکہ شاعری کے لیے شعر کی نیت اور ارادہ ضروری ہیں۔

بعض لوگوں نے علم عروض کی اہمیت اور ضرورت سے انکار کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اس علم کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ان میں جاحظ کا نام بھی شامل ہے۔ ان لوگوں سے ہمارا کہنا ہے کہ علم عروض سے ناواقفیت آپ کو دھوکے میں ڈال سکتی ہے۔ آپ بحور اور اوزان سے لاعلم ہونے کی بنا پر کسی ایسے کلام کو شاعری سمجھ سکتے ہیں جو سرے سے شاعری ہے ہی نہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص فطری طور پر ان اوزان اور بحور کا ذوق رکھتا ہے اور اس کی طبیعت موزوں ہے تو وہ علم عروض کے ذریعے اپنے کلام کو فنی غلطیوں سے پاک کرسکتا ہے۔ علم عروض کے ذریعے عربی شاعری کی صحیح قرأت کی جاسکتی ہے۔ رہی جاحظ کی بات تو انھوں نے دوسرے مقام پر علم عروض کی تعریف بھی کی ہے۔ غالبا اس متضاد بیانی سے ان کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ وہ ایک ہی شئے کے اچھے اور برے پہلو دکھانے کی قوت رکھتے ہیں۔ چنانچہ عروض کی تعریف میں کہتے ہیں۔

"هو علم الشعر ومعياره، وقطبه الذي عليه مداره، به يعرف الصحيح من الفاسد والعليل من السليم، وعليه تبنى قواعد الشعر، وبه يسلم من الكسر"

15.8 عروضی تحریر: تقطیع

شاعری اور عروض کا تعلق صوتی بنیادوں پر ہے۔ جب ہم کسی شعر کو عروض کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں کہ وہ موزوں ہے یا نہیں اس کے لیے ساری توجہ اس کی قرأت پر ہوتی ہے، اس کی تحریر پر نہیں اس لیے کہ بات شروع سے ہی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وزن کا تعلق تلفظ سے ہے، تحریر یا رسم خط سے ہرگز نہیں۔ عام طور پر الفاظ کا تلفظ اور ان کا املا ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر کسی طرح کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحریر اور تلفظ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیتے، بلکہ ان میں واضح طور پر فرق ہوتا ہے۔

عروض کی بنیادی اور سب سے اہم بات یہی ہے کہ اس میں حرفِ ملفوظ معتبر ہے حرفِ مکتوب نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ علم عروض میں کل ما ينطق يكتب (جو بھی بولا جائے وہ لکھا جاتا ہے) وكل ما لا ينطق لا يكتب (جو بولا نہیں جائے گا وہ لکھا نہیں جائے گا یعنی اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا)۔

مثال: ستبدي لک الأيام ما کنت جاهلاً

اس مصرعے کوعروض میں تقطیع کے لیےاس طرح لکھا جائے گا۔

ستبدي /لكل أيبا /مما كن /تجاهلن

فعولن /مفاعيلن /فعولن /مفاعلن

اس شعر کا دوسرا مصرعہ ہے:

ویاتیک بالأخبار امالم تزود

تقطیع کے لیے اسے اس طرح لکھا جائے گا:

ويأتي /كبل أخبا /رمالم /تزوودى

فعولن /مفاعيلن /فعولن /مفاعلن

یہ مشہور شعر جاہلی شاعر طرفہ بن العبد (متوفی 569ء) کے معلقہ سے ماخوذ ہے اور بحر طویل میں ہے۔

عباسی عہد کے مشہور شاعر ابوتمام (متوفی 845ء) کا شعر ہے:

السيف أصدق أنباء من الكتب   في حده الحد بين الحد واللعب

تقطیع کے لیے اس شعر کو یوں لکھا جائے گا:

اس سيف أص /دق أن /باء ن منل /كتبي   مستفعلن /فعلن /مستفعلن /فعلن

عروضی حضرات تقطیع شعری کے لیے علامات کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ متحرک حرف کے لیے خط مائل (/) اور ساکن حرف کے لیے علامت سکون (0) کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ استعمال بحروں کے تعین کے لیے ہوتا ہے۔ ابوتمام کے مذکورہ بالا مصرعے کو یوں لکھا جائے گا:

اس سيف أص۔۔دق أن۔۔باءن منل۔۔كتبي

0///--0//0/0/--0///--0//0/0/

مستفعلن۔۔فعلن۔۔مستفعلن۔۔فعلن

۱۔ حرفِ مشدد کو دو حرف مانا جاتا ہے پہلے کو ساکن اور دوسرے کو متحرک جیسے: شَدَّ کو شَدْدَ لکھا جائے گا۔

۲۔ مد کو ہمزہ اور اس کے بعد الف سے لکھا جائے گا۔ جیسی: آمن کو أامن لکھا جائے گا۔

۳۔ تنوین کو نونِ ساکنہ سے ظاہر کیا جائے گا۔ جیسے: جبلٌ کو جبلُنْ لکھا جائے گا۔

۴۔ الف کو ان حروف میں ظاہر کیا جائے گا جن مین وہ بولا جاتا ہے مگر لکھا نہیں جاتا۔ جیسے۔: هذا کو هاذا اور هذه کو هاذه لکھا جائے گا۔ اس طرح ذلک کو ذالک، اسم جلالت کو اللاه، لکن کو لاکن، لکنّ کو لاکنن، الرحمن کو اررحمان لکھا جائے گا۔

۵۔ داؤد اور طاؤس کو داؤود اور طاؤوس لکھا جائے گا۔

۶۔ حرف قافیہ کی حرکت کو اس کے ہم جنس حرف میں بدل دیا جائے گا۔ مثلا: یلعب، مدلل اور تعود کو بالترتیب یلعبو، مدللی اور تعودا

لکھا جائے گا۔

۷۔ بسا اوقات شعری وزن کی سلامتی کے لیے اشباع حرکت کی ضرورت پڑتی۔ اشباع حرکت کا مفہوم یہ ہے کہ حرکت کی ادائیگی میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جائے۔ یہ مفرد مذکر غائب کی ضمیروں میں عموماً ہوتا ہے اور اگر ضرورت شعری کی بنا پر اشباع حرکت ہو تو تقطیع یا عروضی تحریر میں ایسی حرکات کو ہم جنس حروف کی صورت میں لکھا جائے گا۔ جیسے له، منه، به اور إليه کو لهو، منهو، بهي اور إليهي لکھا جائے گا۔

اس قاعدے کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل شعر میں غور کیجیے۔

جاء الربيع ببيضه، وسوده صنفان من ساداته وعبيده

مذکورہ شعر میں واقع مفرد مذکر غائب کی چاروں ضمیریں (بيضه، سوده، ساداته، عبيده) اگر اشباع حرکت کے ساتھ یعنی قدرے کھینچ کر نہ پڑھی جائیں تو وزن شعری سلامت نہیں رہتا اور شعری موسیقی کی پوری رعایت نہیں ہوتی ہے لہٰذا ان چاروں ضمیروں کو حرکت کے اشباع کے ساتھ پڑھا جائے گا اور جب ان کی تقطیع ہوگی تو عروضی تحریر میں انھیں بيضهِي، سودهي، ساداتهِي اور عبيدهي لکھا جائے گا۔ مصرعوں کے آخری متحرک کلمات کی آخری حرکات بھی اشباع کے ساتھ ہوں گی۔

۸۔ عروضی تحریر میں ہمزۂ وصل نہیں لکھا جائے گا لہٰذا فاستغفر کو فستغفر، طلع القمر کو طلع لقمر، طلعت الشمس کو طلعتش شمس لکھا جائے گا۔ اگر ہمزۂ وصل ابتدائے کلام میں ہو تو چونکہ اسے پڑھا جاتا ہے، لہٰذا لکھا بھی جائے گا۔

۹۔ الف، واو اور یا اگر ساکن ہوں اور ان کے بعد بھی ساکن ہو تو عروضی تحریر میں انھیں حذف کر دیا جایائے گا، مثل في البحر اور إلى السهل کو فلبحر اور السسهل لکھا جائے گا۔ عمرو کے واو زائدہ کو حالت نصبی اور جری میں عروضی تحریر میں حذف کر دیا جائے گا۔

۱۰۔ الف فارقہ کو بھی عروض سے حذف کر دیا جائے گا۔ الف فارقہ جمع کے واو اور اصلی واو میں فرق کرنے کے لیے افعال میں لکھا جاتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا ہے جیسے: هم كتبوا، لم يكتبوا اور واو اصلی کی مثال جیسے يدعو اور يرجو کا واو۔

15.9 عربی شاعری کی بحریں

یہ بحریں عربی شاعری کے وہ اوزان ہیں جن پر عرب قدیم زمانے سے شعر کہتے آئے ہیں۔ خلیل بن احمد فراہیدی نے ان اوزان کا استخراج کیا اور ان کا نام ''بحر'' رکھا۔ خلیل نے پندرہ بحریں وضع کی تھیں۔ جن کے نام ہیں:

۱۔طویل	۲۔مدید	۳۔بسیط	۴۔وافر	۵۔کامل
۶۔ھزج	۷۔رجز	۸۔رمل	۹۔سریع	۱۰۔مسرح
۱۱۔خفیف	۱۲۔مضارع	۱۳۔مقتضب	۱۴۔مجتث	۱۵۔متقارب

عربی شاعری کا ایک وزن خلیل سے چھوٹ گیا تھا جسے ان کے شاگرد اخفش نے وضع کیا اور اس کا نام متدارک رکھا۔ اس طرح عربی شاعری کی کل سولہ بحریں ہوئیں جو آج بھی معروف اور مستعمل ہیں۔

ان اوزان کو یاد رکھنے کے لیے ان کے ارکان (تفاعیل) کے ساتھ انھیں نظم کیا گیا ہے۔

1- بحر الطويل

طويل له دون البحور فضائل   فعولن فعاعلين فعولن مفاعلن

2- بحر المديد

لمديد الشعر عندي صفات   فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

3- بحر البسيط

إن البسيط لديه يبسط الأمل   مستفعلن فعلن مستفعلن فعلن

4- بحر الوافر

بحور الشعر وافرها جميل   مفاعلتن مفاعلتن فعولن

5 - بحر الكامل

كمل الجمال من البحور الكامل   متفاعلن متفاعلن متفاعلن

6 - بحر الهزج

على الأهزاج تسهيل   مفاعيلن مفاعيلن

7 - بحر الرجز

في أبحر الأرجاز بحر يسهل   مستفعلن مستفعلن مستفعلن

8 - بحر الرمل

رمل الأبحر ترويه الثقات   فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

9 - بحر السريع

بحر سريع ما له من ساحل   مستفعلن مستفعلن فاعلن

10 - بحر المنسرح

منسرح فيه يضرب المثل   مستفعلن مفعولات مفتعلن

11 - بحر الخفيف

يا خفيفا خفت به الحركات   فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن

12 - بحر المضارع

تعد المضارعات   مفاعيل فاعلاتن

13 - بحر المقتضب

اقتضب كما سألوا   مَفعَلات مُفْتَعِلُنْ

14 - بحرالمجتث

ان جثت الحرکات — مستفعلن فاعلات

15 - بحرالمتقارب

عن المتقارب قال الخلیل — فعولن فعولن فعولن فعولن

16 - بحرالمتدارک

متدارکنا بحر عجل — فعلن فعلن فعلن فعلن

15.10 عروضی اصطلاحیں

۱۔ بحر	:	وہ وزن جس کی اتباع پورے قصیدے میں کی جاتی ہے جو مخصوص تفعیلات سے مرکب ہوتا ہے۔
۲۔ تفعیلة	:	وہ رکن جن سے بحریں مرکب ہوتی ہیں۔ان ارکان کو اصول اوزان، تفاعیل، افاعیل بھی کہتے ہیں۔
۳۔ وزن	:	وزن کے لغوی معنی تولنے کے ہیں۔اصطلاح میں دوکلموں کے حرکت اور سکون میں برابر ہونے کو وزن کہتے ہیں۔
۴۔ موزون	:	اس کلام کو کہتے ہیں جو اوزان عروض میں سے کسی کے وزن پر ہو۔موزون کلام کے لیے کسی وزن کا ہونا ضروری ہے۔
۵۔ تقطیع	:	تقطیع کے لغوی معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں۔اصطلاح میں شعر کے ٹکڑے کرکے انھیں ارکان بحر کے مطابق کرنے کو کہتے ہیں۔یعنی متحرک کے مقابل متحرک اور ساکن کے مقابل ساکن اجزا و حروف رکھے جاتے ہیں۔تقطیع میں حروف ملفوظ کی تعداد اور حرکات اور سکون کا اعتبار کرتے ہیں۔
۶۔ زحاف	:	زحاف کے لغوی معنی گرنے کے ہیں۔اصطلاح میں ان تغیرات کو زحاف کہتے ہیں جو ارکان شعر میں واقع ہوتے ہیں۔مثلاً کسی حرکت کا گرادینا یا کسی حرف کا حذف کردینا یا کسی حرف کا بڑھادینا۔
۷۔ سالم	:	جس بحر کے ارکان میں کوئی تغیر نہ ہو اس کو 'سالم' کہتے ہیں۔
۸۔ مثمن	:	جس شعر کے دونوں مصرعوں میں آٹھ رکن ہوں اس کو 'مثمن' کہتے ہیں۔
۹۔ مسدس	:	جس شعر کے دونوں مصرعوں میں چھ رکن ہوں اس کو مسدس کہتے ہیں۔
۱۰۔ مربع	:	جس شعر کے دونوں مصرعوں میں چار رکن ہوں اس کو مربع کہتے ہیں۔

اجزائے بیت یا ارکان یا اجزا تین ہیں: سبب، وتد، فاصلہ

۱۱۔ سبب	:	دوحرفی کلمے کو کہتے ہیں۔اس کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ سبب خفیف ۲۔ سبب ثقیل
۱۲۔ سبب خفیف	:	جس کا دوسرا حرف ساکن ہو جیسے ھل، من، ماوغیرہ جیسے (مس، تف) مستفعلن میں۔
۱۳۔ سبب ثقیل	:	جس کے دونوں حروف متحرک ہوں جیسے: لک، بک (مت) متفاعلن میں۔
۱۴۔ وتد	:	سہ حرفی کلمے کو کہتے ہیں اس کی بھی دو قسمیں ہیں: ۱۔ وتد مجموع ۲۔ وتد مفروق

۱۵۔ وتدمجموع : جس کا تیسرا حرف ساکن ہو۔جیسے نعم، علی، بکم (علن) متفاعلن میں۔

۱۶۔ وتدمفروق : جس کا دوسرا حرف ساکن ہو۔جیسے ھات، امس، قام (فاع) فاعلاتن میں۔

۱۷۔ فاصلہ : چار یا پانچ حروف کے کلمے کو فاصلہ کہتے ہیں۔اس کی دو قسمیں ہیں: ۱۔فاصلۂ صغری ۲۔فاصلۂ کبری

۱۸۔ فاصلۂ صغری : جس کلمے میں تین متحرک حروف کے بعد ایک ساکن حرف ہو۔جیسے جبل، امل، شعرت، (متفا) متفاعلن میں اور (علتن) مفاعلتن میں۔

۱۹۔ فاصلۂ کبری : جس کلمے میں چار متحرک حروف کے بعد ساکن حرف ہو۔جیسے عملکم، سمکۃ

خلیل نے ان تمام اصطلاحوں کو اس جملے میں جمع کر دیا۔

لَمْ اَرَ عَلٰی ظَهْرِ جَبَلٍ سَمَكَةً۔

زحافات:

۲۰۔ خبن : دوسرے ساکن کو حذف کرنا جیسے: فاعلن سے فعلن۔

۲۱۔ اضمار : دوسرے متحرک کو ساکن کرنا۔جیسے: مُتَفَاعِلُنْ سے مُتْفَاعِلُنْ جو مُسْتَفِلُنْ میں بدل جائے گا۔

۲۲۔ وقص : دوسرے متحرک کو حذف کرنا۔جیسے: متفاعلن سے مستعلن، جو مفتعلن ہو جائے گا۔

۲۳۔ طي : چوتھے ساکن کو حذف کرنا۔جیسے: مستفعلن سے مفتعلن

۲۴۔ قبض : پانچویں ساکن کو حذف کرنا۔جیسے: فعولن سے فعول

۲۵۔ عصب : پانچویں متحرک کو ساکن کرنا۔جیسے: مُفَاعِلَتُنْ سے مُفَاعِلْتُن۔

۲۶۔ عقل : پانچویں متحرک کو حذف کرنا۔جیسے: مفاعلتن سے مفاعلن

۲۷۔ کف : ساتویں ساکن کو حذف کرنا۔جیسے: مفاعیلن سے مفاعیل

جن اجزا یا ابیات یا بحور میں یہ زحافات ہوں ان کو مندرجہ ذیل اسما دیے گئے ہیں:

۱-مخبون ۲-مضمر ۳-موقوص ۴-مطوی

۵-مقبوض ۶-معصوب ۷-معقول ۸-مکفوف

زحافات مرکبہ

۲۸۔ خبل : طي مع الخبن (دوسرے اور چوتھے ساکن کو حذف کرنا) جیسے مستفعلن سے متعلن

۲۹۔ خزل : طي مع الاضمار (دوسرے متحرک کو ساکن اور چوتھے ساکن کو حذف کرنا) جیسے متفاعلن سے متفعلن

۳۰۔ شکل : کف مع الخبن (دوسرے اور ساتویں ساکن کو حذف کرنا) جیسے فاعلاتُن سے فعِلات

۳۱۔ نقص : کف مع العصب (پانچویں متحرک کو ساکن اور ساتویں ساکن کو حذف کرنا) جیسے مفاعلتن، سے مفاعلت جو مفاعیل ہو جائے گا۔

جن اجزا میں یہ زحافات آتے ہیں ان کو مندرجہ ذیل نام دیے گئے ہیں:

۱- مخبول ۲- مخزول ۳- متکول ۴- منقوص

شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل اجزا مقرر کیے گئے ہیں۔

۳۲۔ صدر : مصرعۂ اولی

۳۳۔ عجز : مصرعۂ ثانیہ

۳۴۔ عروض : صدر کا آخری جز

۳۵۔ ضرب : عجز کا آخری جز

۳۶۔ حشو : بقیہ یا زائد جز

۳۷۔ بیت تام : جس شعر میں تمام اجزا موجود ہوں

۳۸۔ بیت مجزوء: جس شعر کے ہر مصرعے کے آخر سے ایک جز حذف ہو

۳۹۔ بیت شطور: جس شعر کا نصف حصہ حذف ہو

۴۰۔ منهوک : جس شعر کے دو تہائی اجزا محذوف ہوں

15.11 قافیہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

لفظ القافیة قفا یقفو سے بنا ہے جس کے معنی پیچھے آنے یا پیروی کرنے کے ہیں۔ لغت میں قافیہ گردن کے پچھلے حصے کو بھی کہتے ہیں۔ اس کو قافیہ اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ شاعر اس کی اتباع کرتا ہے اور اس کے اشعار اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

اصطلاح میں قافیہ وہ علم ہے جس کے ذریعے اشعار کی آخری حالت کو جانا جاتا ہے، جیسے حرکت اور سکون، لزوم اور جواز، فصیح اور قبیح وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر کے آخر میں آنے والے چند حروف کو بھی قافیہ کہتے ہیں۔

اخفش کی رائے میں قافیہ ہر شعر کے آخری لفظ کو کہتے ہیں۔ خلیل بن احمد فراہیدی کی رائے میں قافیہ شعر کے آخر میں دو ساکن حرفوں اور ان کے درمیان ایک یا اس سے زائد متحرک حرف اور ساکن اول سے پہلے متحرک حرف سے مل کر بنتا ہے۔ چنانچہ خلیل کی رائے کے مطابق اس شعر میں:

نعیب زماننا والعیب فینا وما لزماننا عیب سوانا

'وانا' قافیہ ہے۔

لہٰذا یہ معلوم ہوا کہ خلیل کے مطابق قافیہ کسی کلمہ یا کلمات کی محدود تعداد کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ قافیہ کسی لفظ کا کچھ حصہ ہو سکتا ہے۔ جیسے کعب بن زہیر کا شعر:

بانت سعاد فقلبي اليوم متبول متيم إثرها لم يفد مكبول

اس شعر میں قافیہ (بولو /0/=0) ہے، جو مکبول کا جز ہے۔

۲۔ قافیہ مکمل لفظ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے متنبی کا یہ شعر:

واذا اتتک مذمتي من ناقص فهي الشهادة لي بأني كامل

اس شعر میں قافیہ (کاملو=/0//0) ہے جو مکمل لفظ ہے۔

۳۔ قافیہ مکمل لفظ اور اس کے ساتھ دوسرے لفظ کا کچھ حصہ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے متنبی کا یہ شعر:

إن كان سركم ما قال حاسدنا فما لجرح إذا أرضا كم ألم

اس شعر میں قافیہ (موألمو=/0///0) ہے جو ایک لفظ اور دوسرے لفظ کا کچھ حصہ ہے۔

۴۔ قافیہ دو لفظوں سے مل کر بھی بن سکتا ہے۔ جیسے ابن الوردی کا یہ شعر:

لاتقل أصلي وفصلي أبدا إنما أصل الفتى ما قد حصل

اس شعر میں قافیہ (قد حصل=/0//0) ہے۔ جو دو لفظوں پر مشتمل ہے۔

۵۔ قافیہ دو لفظوں اور تیسرے کلمے کا کچھ جز بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے:

لما رأو أن يومهم أشب شدوا حيا زيمهم على ألمه

اس شعر میں قافیہ (لا ألمه=/0///0) ہے، جو ''لا، ألم، ہ'' کا مجموعہ ہے۔

۶۔ قافیہ تین لفظوں پر بھی مشتمل ہوسکتا ہے۔ جیسے ابو العتاھیہ کا شعر۔

حلم الفتى مما يزينه وتمام حلية فضله أدبه

اس شعر میں قافیہ (هي أدبه=/0///0) ہے جو تین کلمات سے مل کر بنا ہے۔ (ضمیر) أدب اور (ضمیر)۔

ابن منظور متوفی (1311ء) نے لسان العرب میں لکھا ہے:

''والقافية من الشعر الذي يقفو البيت، وسميت قافية لأنها تقفو البيت''

قافیہ شعر کے پیچھے آنے والا ہوتا ہے، اس کے پیچھے آنے کی وجہ سے ہی اس کو قافیہ کہا جاتا ہے۔

قطرب متوفی (812ء) کا کہنا ہے کہ:

''القافية الحرف الذي تبنى القصيدة عليه وهو المسمى رويا''

قافیہ وہ لفظ ہے جس پر قصیدے کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس کو 'روی' بھی کہا جاتا ہے۔

ابن کیسان (متوفی 912ء) کہتے ہیں:

''القافية كل شيء لزمت اعادته في آخر البيت وقد لاذ هذا بقول الخليل لو لا خلل فيه''

قافیہ ہر وہ شئے جو شعر کے آخر میں بار بار آئے، اس سلسلے میں خلیل کی بات اہم ہے کہ اس میں خلل واقع نا ہو۔

ابن جنی (متوفی 1002ء) کہتے ہیں:

''والذي يثبت عندي صحته من هذه الأقوال هو قول الخليل''

ان تمام اقوال میں سب سے معتبر میرے نزدیک خلیل کا قول ہے۔

قافیہ کی اس بنیادی اہمیت کے پیش نظر بعض شعرا نے پورے قصیدے کے لیے ''القافية'' کا لفظ استعمال کیا۔ مثلاً: حسان بن ثابت کا یہ شعر:

فتحكم بالقوافي من هجانا ونضرب حين تختلط الدماء

مذکور بالا شعر کے سلسلے میں اخفش کا ماننا ہے کہ اس شعر میں القوافي سے مراد قصائد ہیں۔ وہ یہاں اس کے لغوی معنی ''گردن کا پچھلا حصہ'' مراد نہیں مانتے۔ ابن جنی کا بھی یہی ماننا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''لا يمتنع عندي أن يقال في هذا: إنه أراد القصائد''

مجھے یہ ماننے میں کوئی تامل نہیں کہ اس شعر میں قوافی سے مراد قصائد ہیں۔

جیسے حضرت خنساء (متوفیہ 646ء) کا شعر:

وقافيةٍ مثل حد السنا ن تبقي ويهلك من قالها

وہ بھی اس شعر میں 'قافية'' سے قصیدہ یا شعر ہی مراد لیتی ہیں۔

مذکور بالا گفتگو سے ہم نے یہ سمجھا کہ قافیہ شعر کے لیے کتنا ضروری ہے۔ بحر کے اشعار میں حرفوں کے سکون اور حرکت کی مطابقت سے نغمگی پیدا ہوتی ہے۔ قافیہ چونکہ شعر کے آخری اجزا سے متعلق ہے اس لیے آواز آخر میں خوش آئند ہو جاتی ہے اور شعر میں جان ڈال دیتی ہے۔ اگر شعر میں قافیہ نہ ہو تو اس کا حسن ادھورا رہتا ہے۔

15.12 حروف القافیہ

قافیہ کے 6 حروف ہوتے ہیں:

1۔ الروی: حرف روی قافیہ کے آخری حرف کو کہتے ہیں۔ اس حرف کی تکرار ہوتی ہے۔ کوئی قافیہ حرف روی سے خالی نہیں ہوتا۔ یہی اصلی حرف قافیہ ہے اور اسی پر قافیہ کا دار و مدار ہوتا ہے۔ بعض حضرات ''حرف روی'' کو ہی قافیہ سمجھتے ہیں۔ لیکن دراصل قافیہ اور روی دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ مثلاً ''میم'' پر ختم ہونے والے قصیدے کو قصیدۂ میمیہ 'نون' پر ختم ہونے والے قصیدے کو ''قصیدۂ نونیہ'' تبھی کہا جاتا ہے جب حرف روی یعنی قافیہ کا آخری حرف میم یا نون ہو۔

روی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں درج ذیل اقوال ملتے ہیں۔

ا۔ یہ رؤية (بمعنی نظریہ اور فکر) سے ماخوذ ہے۔ روی سے فعيل کے وزن پر روی بن گیا۔

۲۔ الرواء سے ماخوذ ہے جس کے معنی رسی کے ہیں۔ رسی چونکہ اشیا کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے کام آتی ہے چنانچہ روی کو روی اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اشعار کو باہم مربوط کرتی ہے۔

۳۔ رواء کے معنی منظر کے بھی ہوتے ہیں، یہ چونکہ شعر کے حسن میں اضافہ کرتی ہے اس لیے اس کو 'روی' کہا جاتا ہے۔

2۔ الوصل: حرف مد یاء ہائے ساکنہ یا متحرکہ جو روی کے فوراً بعد آتے ہیں۔ حروف وصل چار ہوتے ہیں: تین مدات (الف، واو اور یاء)

اور ایک ھاء۔ الف کی مثال جیسے أصابا میں باء حرف روی اور الف حرف وصل ہے، واو کی مثال جیسے **الخیام** =**الخیامُو** میں میم حرف روی اور واو حرف وصل ہے، یاء کی مثال جیسے **إضربي** میں باء حرف روی اور یاء حرف وصل ہے، ھائے ساکنہ کی مثال جیسے **أخاطبه** اور ھائے متحرکہ کی مثال جیسے **حسنه** =**حسنهو** میں اول میں باء حرف روی اور ھاء حرف وصل اور ثانی میں نون حرف روی اور ھاء حرف وصل ہے۔

3۔الخروج: وہ حرف مد ہوتا ہے جو ہائے وصل کی حرکت کے اشباع کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ حروف خروج تین ہوتے ہیں (الف، واو اور یاء) کیونکہ حرف مد یہی تین ہوتے ہیں۔

عفت الديار محلها ومقامُها بمنىً تأبَدَ غولها فرِجامُها

لبید ابن ربیعہ (661ء) کے معلقے کے اس شعر میں میم حرف روی، ھا حرف وصل اور الف حرف خروج ہے۔

4۔الردف: قافیہ کا وہ حرف مد (الف، واو اور یاء) ہوتا ہے جو حرف روی سے فوراً پہلے ہوتا ہے جیسے لبید کے مذکورہ شعر میں **مقامها** اور **لجامها** میں میم کے پہلے کا الف الردف کہلاتا ہے۔

5۔التأسيس: ایسا الف ہے جس کے اور روی کے درمیان ایک متحرک حرف ہوتا ہے۔

6۔الدخيل: تاسیس اور روی کے درمیان کا متحرک حرف دخیل کہلاتا ہے جیسے متنبی (965ء) کا مشہور شعر ہے:

على قدر أهل العزم تأتي العزائم وتأتي على قدر الكرام المكارم

اس شعر میں **عزائم** اور **مکارم** کا الف حرف تاسیس ہے جب کہ ہمزہ اور را حروف دخیل ہیں۔

''منھاج البلغاء'' میں حازم القرطاجنی (متوفی 1285ء) کا قول نقل ہے:

''إن القوافي فيها من التزام شيء أو أشياء وتلك الأشياء حروف وحركات وسكون''

''قوافی میں ایک شئے یا اشیا کا التزام ضروری ہے، وہ اشیا حروف، حرکات اور سکنات ہوتی ہیں۔''

15.13 حرکات کے اعتبار سے قافیہ کی قسمیں

حرکات کے اعتبار سے قافیہ کی پانچ قسمیں ہیں:

۱۔متکاوس ۲۔متراکب ۳۔متدارک ۴۔متواتر ۵۔مترادف

۱۔متکاوس: وہ قافیہ ہے جس کے دو ساکن حروف کے درمیان چار حرکات ہوں۔ جیسے:

تولت به إلى الحضيض قدمه

0 ۱ ۲ ۳ ۴ 0

یْ ضِ قَ دَ مُ هْ

۲۔متراکب: وہ قافیہ ہے جس کے دو ساکن حروف کے درمیان تین حرکات ہوں۔ جیسے:

سل في الظلام أخاك البدر عن سهري

نْ سَ هَ رِ يْ

۳۔متدارک: وہ قافیہ ہےجس کے ساکن حروف کے درمیان دو حرکتیں ہوں۔جیسے:

يا له ذرعا منيعا لو جمد

وُ جَ مَ دْ

۴۔متواتر: وہ قافیہ ہےجس کے دو ساکن حروف کے درمیان ایک حرکت ہو۔جیسے:

سمعت بأذني رنة السهم في قلبي

لُ بِ يْ

۵۔مترادف: وہ قافیہ ہےجس کے دونوں ساکن جمع ہوں۔جیسے:

البخل خير من سوال البخيل

يْ لُ

15.14 حروف کے اعتبار سے قافیہ کی قسمیں

حروف کے اعتبار سے قافیہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔قافیہ مطلقہ: وہ قافیہ ہےجس کا روی متحرک ہو۔

۲۔قافیہ مقیدہ: وہ قافیہ ہےجس کا روی ساکن ہو۔

قافیہ مطلقہ کی چھ قسمیں ہیں:

۱۔مطلقہ مجردہ موصولہ باللین: وہ قافیہ ہے جس میں حرف ردف اور تاسیس نہ ہو اور حرف وصل لین (الالف، الواو والیاء) ہو، جیسے ابوتمام (متوفی 845ء) کا مصرع:

السيف أصدق أنباءً من الكتب

اس میں قافیہ نَلْ کُتُبِي ہے جو ردف اور تاسیس دونوں سے خالی ہے لیکن حرف وصل یاء ہے جو کہ حرف روی با کی حرکت کے اشباع کے سبب پیدا ہوا۔

۲۔مطلقہ مجردہ موصولہ بالھاء: وہ قافیہ ہے جس میں ردف اور تاسیس نہ ہو اور حرف وصل ھاء ہو۔اس مصرعے میں غور کیجیے:

الا فتى لاقى العلى بهمه

اس میں قافیہ هَمِّهِي ہے جس میں ''میم'' حرف روی، ''ھاء'' حرف وصل اور ''یاء'' جو اشباع حرکت یا ''ھاء'' کے کسرہ کو کھینچنے سے پیدا ہوئی ہے حرف خروج ہے۔

۳۔مطلقہ مردوفہ موصولہ باللین: وہ قافیہ ہے جس میں روی سے پہلے حرف ردف (الف، واو، یاء) ہو اور حرف روی کے بعد حرف وصل

(الف واو یا یاء) ہو۔ جیسے مندرجہ ذیل شعر کا قافیہ:

الا قالت بثينة إذ رأتني وقد لا تعدم الحسناء ذاما

اس میں قافیہ ذاما ہے۔ اس میں ''میم'' حرف روی ہے اور حرف روی سے پہلے کا ''الف'' حرف ردف اور بعد کا ''الف'' حرف وصل لین ہے اسی مناسبت سے اس کو مردوفہ موصولہ باللین کہتے ہیں۔

۴۔ مطلقہ مردوفہ موصولہ بالھاء: وہ قافیہ جس میں حرف ردف ہو اور حرف وصل ھاء ہو۔ جیسے

عفت الديار محلها فمقامها بمنى تابد غولها فرجا مها

اس شعر میں قافیہ قامھا اور رجامھا ہے اس میں حرف روی ''میم'' ہے اس سے پہلے کا ''الف'' حرف ردف ہے اور بعد کا ''ھاء'' حرف وصل ہے اور آخری ''الف'' حرف خروج ہے۔

۵۔ مطلقہ مؤسسہ موصولہ باللین: وہ قافیہ جس میں حرف تاسیس اور حرف وصل باللین یعنی الف واو یا یاء حرف وصل ہو، جیسے نابغہ زبیانی متوفی 604ء کا شعر:

كليني لهم يا أميمة ناصب وليل أقاسيه بطيء الكواكب

اس شعر میں قافیہ ناصبي اور واکبي ہے۔ حرف روی ''باء'' ہے، ''الف'' حرف تاسیس ہے اور روی کے کسرہ کو کھینچنے سے پیدا ہونے والی ''یاء'' حرف وصل باللین ہے۔

۶۔ مطلقہ مؤسسہ موصولہ بالھاء: وہ قافیہ ہے جس میں حرف تاسیس اور حرف وصل ''ھاء'' ہو۔ جیسے الاعشیٰ (متوفی 625ء) کا یہ شعر:

في ليلة لا نرى بها أحدا يحكي علينا إلا كواكبها

قافیہ مقیدہ کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مقیدہ مجردہ: وہ قافیہ ہوتا ہے جس میں حرف روی ساکن ہو اور ردف وتاسیس کے حروف سے خالی ہو۔ جیسے

أتهجر غانية أم تلم أم الحبل واه بها منجذم

اس شعر میں قافیہ منجذم ہے جس کا حرف روی ساکن ہے اور ردف وتاسیس سے خالی ہے۔

۲۔ مقیدہ مردوفہ: وہ قافیہ جس میں حرف روی ساکن ہو اور جس میں حرف ردف موجود ہو۔ جیسے

لايغرن امرء عيشه كل عيش صائر للزوال

اس شعر میں قافیہ وال ہے جس کا حرف روی لام ساکن ہے اور الف حرف ردف ہے۔

۳۔ مقیدہ مؤسسہ: وہ قافیہ ہے جس میں حرف روی ساکن ہو اور حرف تاسیس موجود ہو۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ حرف تاسیس قافیہ کا وہ الف ہوتا ہے جس کے بعد اور روی سے پہلے ایک متحرک حرف ہو۔ جیسے

وَغَرَرتَنِي وزعمتَ أَنَّ ك لابنٌ في الصيف تَامِرْ

یہ شعر مشہور مخضرمی شاعر الحطیئہ کا ہے۔ اس کا قافیہ تامر ہے۔ الف حرف تاسیس ہے اور راء حرف روی ہے جو ساکن ہے اور ان دونوں

کے درمیان میں میم متحرک ہے۔ لہذا یہ قافیہ مقیدہ مؤسسہ ہے۔

15.15 قافیہ کے عیوب

عیوبِ قافیہ سات ہیں:

۱۔ایطاء	۲۔تضمین	۳۔اقواء	۴۔اصراف
۵۔الفاء	۶۔اجازہ	۷۔سناد	

۱۔ایطاء۔ کلمۂ قافیہ کو (بغیر سات اشعار کا فصل کیے) اسی معنی کے ساتھ دوبارہ ذکر کرنا، البتہ سات اشعار کے بعد ایسا کرنا جائز ہے۔
مثال: نابغہ ذبیانی نے قافیہ (ساري) کو نظم کیا اور پھر چار اشعار کے بعد وہی قافیہ دوبارہ لے آئے۔ عربی شاعری میں قافیہ کی جلدی جلدی تکرار کو عیب مانا جاتا ہے اور اس عیب کو ایطاء کہتے ہیں۔ جیسے:

وواضع البيت في خرساءَ مظلمةٍ　　تُقَيِّدُ العيرَ لا يسري بها الساري

لا يخفض الرز عن أرض أَلَمَّ بها　　ولا يَضِلُّ على مِصباحِه الساري

۲۔تضمین: کسی شعر کے قافیے کا ربط و تعلق اگلے شعر کے مصرعہ اول سے ہو۔ جیسے نابغہ ذبیانی کے مندرجہ اشعار:

وهم وردوا الجفار على تميمٍ　　وهم أصحاب يوم عكاظ إني

شهدت لهم مراطن صادقات　　شهدت لهم بحسن الظن مني

پہلے شعر کا قافیہ (إني) ہے جس میں إن حرف مشبہ بالفعل اور یاء ضمیر منصوب متصل إن کا اسم ہے اور اس کی خبر (شهدت) اگلے شعر میں آئی ہے۔

۳۔اقواء: روی کا مختلف ہونا کسرہ وضمہ میں۔ یعنی کسی شعر کا روی مضموم ہو اور کسی کا مکسور۔ یہ اختلاف بھی قافیے کا عیب مانا جاتا ہے۔ اس عیب کی مثال: حضرت حسانؓ (متوفی 674ء) کے یہ اشعار:

لا بأس بالقوم من طول ومن قصر　　جسم البغال وأحلام العصافيرِ

كأنهم قصب جوف أسافله　　مثقب نفخت فيه الأعاصيرُ

دونوں اشعار میں بالترتیب صافیر اور عاصیر قافیہ ہیں اور دونوں میں راء حرف روی ہے جو پہلے شعر میں مکسور اور دوسرے میں مفہوم ہے۔

۴۔اصراف: روی کا مختلف ہونا فتحہ وغیرہ میں۔ یعنی ایک ہی قصیدے کے حروف روی کی حرکتوں میں باہم اختلاف ہو اور یہ اختلاف فتحہ و کسرہ کے ساتھ ہو یا فتحہ وضمہ کے ساتھ ہو۔ جیسے:

أرَيتَک إن منعت كلام يحى　　أتمنعي على يحيى البكاء

ففي طرفي على يحيى سهاد　　وفي قلبي على يحيى البلاءُ

۵۔اکفاء: روی کا مختلف ہونا قریب المخارج حروف میں۔ یعنی ایک ہی قصیدے کے قوافی میں حرف روی الگ الگ لیکن ہم مخرج یا

قریب المخرج ہوں۔ مثلا:

جاريةٌ مِنْ ضَبَّة بن أُدّ كأنها في درعها الْمُنْعَطِّ

اس شعر کے دونوں مصرعوں کے قوافی میں حروف روی دال اور طا ہیں جو الگ الگ ہیں البتہ قریب المخارج ہیں۔

۶۔اجازہ: روی کا مختلف ہونا بعید المخارج حروف میں۔ جیسے ایک قافیے کا روی لام ہو اور دوسرے کا میم جیسا کہ مندرجہ ذیل شعر میں ہے:

الأ هل ترى إن لم تكن أم مالك بملك يدي أن الكفاء قليل

رأى من خليله جفاء وغلظة إذا قام يبتاع القلوص ذميم

۷۔سناد: ان حروف وحرکات میں اختلاف ہونا جن کی رعایت قبل روی کی جاتی ہے۔ سناد کی پانچ قسمیں ہیں: سناد الردف، سناد التاسیس، سناد الاشباع، سناد الحذو اور سناد التوجیہ۔ جن میں پہلے دو کا تعلق اختلاف حروف سے ہے اور آخری تین کا اختلاف حرکات سے۔

ا۔سناد الردف: ایک بیت میں ردف ہونا دوسری میں نہ ہونا۔ مثال: حضرت حسانؓ کا یہ شعر:

إذا كنت في حاجة مرسلا فأرسل حكيما وَلَا تُوْصِهِ

وإن ناب أمر عليك التوى فشاوِرْ لبيبا وَلَا تَعْصِهِ

ان دونوں اشعار میں توصہ اور تعصیہ قافیہ ہیں، پہلے میں حرف ردف واو موجود ہے جب کہ دوسرا قافیہ اس سے خالی ہے۔ قافیے کے اس عیب کو سناد الردف کہتے ہیں۔

۲۔سناد التاسیس: قافیے کا وہ عیب ہے جس میں ایک بیت میں تاسیس ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔ سناد التاسیس کی مثال مندرجہ ذیل شعر ہے:

يا دارَميّةَ أسلمي ثم أسلمي فَخِنْدِفُ هامةُ هذا العالِم

پہلے مصرعے میں قافیہ أسلمي اور دوسرے میں عالمي ہے۔ دوسرے میں حرف تاسیس الف ہیں جب کہ پہلے مصرعے کا قافیہ اس سے خالی ہے۔

۳۔سناد الاشباع: قوافی کے حرف دخیل کی حرکت میں باہم اختلاف ہونا۔ ہم جانتے ہیں کہ حرف دخیل تاسیس اور روی کے درمیان کے متحرک حرف کو کہتے ہیں۔ جیسے:

وَهُم طردو منها بَلِيّاً فأصبحتْ بَلِيّ بوادٍ من تِهامةَ غَائِرِ

وَهُمْ منعوها من قُضَاعَة كُلَّها ومن مضر الحمواء عند التَغَاوُرِ

ان دونوں اشعار میں غَائِر اور غَاوُر قافیہ ہیں۔ دونوں میں الف حرف تاسیس اور را حرف روی ہے اور ان دونوں کے درمیان میں واقع ہونے والے ہمزہ اور واو حروف دخیل ہیں جو باہم مختلف ہیں۔

۴۔سناد الحذو: حذو (ماقبل حرف ردف کی حرکت) کا مختلف ہونا۔ مثال:

لقد أَلِجُ الخِبَاءَ عَلَى جَوَارٍ كَأَن عيونهن عيون عِيْنِ

كَأني بين خافِيَتَيْ عُقَابٍ يُرِيْدُ حَمَامَةً في يومِ غَيْنِ

دونوں قافیوں میں حروف ردف یاء ہے اور حروف روی نون ہے اور حرف ردف سے پہلے کے دونوں حروف مختلف الحرکات ہیں۔ (عِینِ) کا عین مکسور ہے جب کہ (غَینِ) کا غین مفتوح ہے، یوم غین یعنی بادلوں والے دن۔

۵۔ سناد التوجیہ: روی مقید (ساکن) کے ماقبل کی حرکت کا مختلف ہونا۔

وَقَاتِمِ الأعماقِ خاوي الْمُخْتَرَقْ

أَلَّفَ شتى ليس بالراعى الْحَمِقْ

شَذَابَةٌ عنها شذى الرُّبَعِ السُّحُقْ

رویہ بن العجاج (متوفی 762ء) کے ارجوزہ سے ماخوذ یہ مختلف مصرعے ہیں جن کے قافیے کا قاف روی مقید یعنی ساکن ہے اور اس کے پہلے کے حروف پہلے مصرعے میں مفتوح دوسرے میں مکسور اور تیسرے میں مضموم ہیں۔ قافیے کے اس عیب کو سناد التوجیہ کہتے ہیں۔

تنبیہ: ان عیوب میں سے ایطاء، تضمین اور سناد مولدین کے نزدیک جائز ہے باقی نہیں اور ان سب سے بڑا عیب اجازہ ہے پھر اکفا پھر اصراف پھر اقواء۔

15.16 حرکات قافیہ

حرکات قافیہ چھ ہیں:

۱۔ مجری ۲۔ نفاد ۳۔ حذو ۴۔ رس ۵۔ اشباع ۶۔ توجیہ

۱۔ مجری: روی مطلق (یعنی متحرک) کی حرکت جیسے عتابا میں باء کی حرکت۔

۲۔ نفاذ: ہائے وصل کی حرکت۔ جیسے مقامها کے هاء کی حرکت۔

۳۔ حذو: ماقبل ردف کی حرکت۔ جیسے مال کی میم کی حرکت۔

۴۔ رس: ماقبل تاسیس کی حرکت: جیسے جداول کے دال کی حرکت۔

۵۔ اشباع: دخیل کی حرکت۔ جیسے جداول کے واو کی حرکت۔

۶۔ توجیہ: روی مقید (ساکن) کے ماقبل کی حرکت۔ جیسے قط کے قاف کی حرکت ذیل کے مصرعے میں:

جاءوا بِمَذْقٍ هل رأيت الذئب قط

15.17 اکتسابی نتائج

عروض لغت میں گوشہ، مشکل راستہ اور ضرورت کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں ایک مخصوص علم کا نام ہے جس کے ذریعے صحیح اور غلط شعر میں فرق کیا جاتا ہے اور اس کی کمیوں اور خامیوں کا پتا لگایا جاتا ہے۔

عرض یعرض عروضا کا معنی پیش کرنا ہوتا ہے اور اس لیے اس علم کو بھی علم العروض کہا جاتا ہے کہ شعر کو اس کے اصول وقواعد پر منطبق کر کے شعر کی اچھائی اور خرابی کو جانچا جاتا ہے۔

یہ تنہا ایسا علم ہے جسے فرد واحد یعنی خلیل بن احمد فراہیدی نے ایجاد کیا اور اس کے قواعد اور اصول وضوابط وضع کیا۔ خلیل بن احمد فراہیدی کا شمار دوسری صدی ہجری کے ماہرین لغت و ادب میں ہوتا ہے اور انہیں امام النحو بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں **کتاب النغم، کتاب الایقاع** اور **کتاب النقط و الشکل** وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علم عروض میں تقطیع کے ذریعے شعر کی عمدگی اور غیر موزوں ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ تقطیع کے لیے شعر کو اس کی بحروں پر منطبق کر کے دیکھا جاتا ہے۔ شعر کی بحروں کے نام یہ ہیں: بحر الطویل، بحر المدید، بحر البسیط، بحر الواخر، بحر الکامل، بحر الھزج، بحر الرجز، بحر الرمل، بحر السریع، بحر المنسرح، بحر الخفیف، بحر المضارع، بحر المقتضب، بحر الجثت، بحر المتقارب، بحر المتدارک۔

کسی بھی شعر کی تقطیع کے لیے اسے حرکت وسکون میں تبدیل کرتے ہیں اور حرکت کے لیے (/) اور سکون کے لیے (0) کو بطور نشان استعمال کرتے ہیں۔

اس عمل میں اس فن کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے اس کے مصطلحات سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے مصطلحات میں بحر، تفعیلہ، وزن، موزون، تقطیع، زحاف، سالم، مربع، اجزائے بیت یعنی سبب، وتد، فاصلہ اور اس کے اقسام، زحافات اور زحافات کی مختلف صورتیں اہم ہیں۔

موزوں و مقفی کلام کو شعر کہتے ہیں۔ اس میں بحر کے ساتھ ساتھ قافیہ بھی اہم ہے۔ علم عروض میں شعر کے آخر میں بار بار آنے والے حروف کو قافیہ کہتے ہیں اور یہ کسی کلمہ یا لفظ کا کچھ حصہ یا پورا لفظ یا دو لفظ یا دو کے ساتھ تیسرے کے کچھ حروف ہوسکتا ہے۔ قافیہ کے چھ حروف ہوتے ہیں: روی، وصل، خروج، ردف، تاسیس اور دخیل۔ حروف قافیہ کے حرکات کے اعتبار سے قافیہ کی پانچ صورتیں ہیں: متکاوس، متراکب، متدارک، متواتر اور مترادف اور حروف قافیہ کے اعتبار سے اس کی دو صورتیں ہیں: قافیہ مطلقہ اور قافیہ مقیدہ۔ قافیہ مطلقہ کی چھ شکلیں ہیں: مطلقہ مجردہ موصولہ باللین، مطلقہ مجردہ موصولہ بالھاء، مطلقہ مردوفہ موصولہ باللین، مطلقہ مردوفہ موصولہ بالھاء، مطلقہ مؤسسہ موصولہ باللین اور مطلقہ مؤسسہ موصولہ بالھاء۔ قافیہ مقیدہ کی تین قسمیں ہیں: مقیدہ مجردہ، مقیدہ مردوفہ اور مقیدہ مؤسسہ۔ قافیہ کے عیوب میں ایطاء، تضمین، اقواء، اصراف، اکفاء، اجازہ اور سناد کو شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں سناد کی پانچ قسمیں ہیں: سناد الردف، سناد التاسیس، سناد الاشباع، سناد الحذو اور سناد التوجیہ۔ ان عیوب میں سے ایطاء، تضمین اور سناد کی پانچوں صورتوں کو مولدین شعرا قافیہ کے عیوب میں شمار نہیں کرتے۔ حرکات قافیہ کے اعتبار سے اس کی چھ قسمیں ہیں: مجری، نفاد، حذو، رس، اشباع اور توجیہ۔

15.18 امتحانی سوالات کے نمونے

۱۔ علم عروض کے لغوی معنی کیا ہیں؟

۲۔ **خلیل بن احمد الفراھیدی** کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۳۔ علم عروض کی اہمیت پر مختصراً نوٹ تحریر کیجیے۔

۴۔ علم عروض کے فوائد تحریر کیجیے۔

۵۔ ''**تقطیع**'' سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

۶۔ ’’زحاف‘‘ کے معنی تحریر کیجیے۔

۷۔ عروضی تحریر (الکتابة العروضية) کے اصول تحریر کیجیے۔

۸۔ شعر کے اجزا کے نام تحریر کیجیے۔

۱۔ قافیہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف تحریر کیجیے۔

۲۔ قافیہ کی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔

۳۔ قافیہ اور روی میں کیا فرق ہے؟

۴۔ روی کے لغوی معنی تحریر کیجیے۔

۵۔ قافیہ کی اقسام مثالوں کے ساتھ تحریر کیجیے۔

۶۔ حروف قافیہ کیا ہیں؟ تحریر کیجیے۔

۷۔ حرکاتِ قافیہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔

15.19 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

۱۔	أهدى سبيل إلى علمي الخليل العروض والقافية	محمود مصطفى، شرح وتحقيق: سعيد محمد اللحام
۲۔	علم العروض والقافية	د۔ عبد العزيز عتيق
۳۔	المرشد الوافي في العروض والقوافي	د۔ محمد بن حسن بن عثمان
۴۔	دراسات في العروض والقافية	عبد الله درويش
۵۔	ميزان الذهب في صناعة شعر العرب	السيد أحمد الهاشمي، تحقيق: علاء الدين عطية
۶۔	محيط الدائرة في علمي العروض والقافية	خان وایک الأمريكاني
۷۔	العروض الواضح وعلم القافية	الدكتور محمد علي الهاشمي
۸۔	المعجم المفصل في علم العروض والقافية وفنون الشعر	د۔ اميل بديع يعقوب
۹۔	معراج العروض	عارف حسن خاں
۱۰۔	في علم القافية	د۔ أمين علي السيد

اکائی 16 بحر اور اس کی قسمیں

اکائی کے اجزا

16.1 تمہید

16.2 مقصد

16.3 وجہ تسمیہ

16.4 بحر کی قسمیں

16.5 بحر طویل

16.6 بحر متقارب

16.7 بحر بسیط

16.8 بحر رجز

16.9 بحر سریع

16.10 بحر منسرح

16.11 بحر کامل

16.12 بحر وافر

16.13 بحر مدید

16.14 بحر رمل

16.15 بحر خفیف

16.16 بحر ہزج

16.17 بحر مضارع

16.18 بحر مقتضب

16.19 بحر مجتث

16.20 بحر متدارک (بحر محدث)

16.21 اکتسابی نتائج

16.22 امتحانی سوالات کے نمونے

16.23 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

16.1 تمہید

خلیل بن احمد الفراہیدی نے علم عروض کی بنیاد رکھی اور تمام شعری اوزان کے مطالعے کے بعد ان اوزان کو پندرہ بحروں میں تقسیم کیا۔ ان بحروں کے نام رکھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد اخفش نے ایک اور بحر کا اضافہ کیا اور اس طرح یہ بحریں سولہ ہوگئیں۔

16.2 مقصد

اس اکائی کے بعد طلبہ مندرجہ ذیل امور سے واقف ہوسکیں گے:

- ☆ شعری بحور کے ناموں سے واقف ہوسکیں گے۔
- ☆ شعری بحور کے اوزان جان پائیں گے۔
- ☆ ان بحور کی اہمیت سمجھ سکیں گے۔
- ☆ اشعار کی تقطیع پر قادر ہوسکیں گے۔

16.3 وجہ تسمیہ

بحر کو ''بحر'' اس کے نام کی معنویت کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی لامتناہیت کے اعتبار سے سمندر کے مشابہ ہوتی ہے۔ سمندر سے جتنا بھی استفادہ کیا جائے اس کا پانی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہی حال بحر کا ہے۔ ایک بحر میں کتنے بھی شعر کہے جائیں اس کی گہرائی اور عمق میں کوئی فرق نہیں آتا۔

16.4 بحر کی قسمیں

شعری بحور ۱۶ ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ طویل	۲۔ متقارب	۳۔ بسیط	۴۔ رجز	۵۔ سریع	۶۔ منسرح
۷۔ کامل	۸۔ وافر	۹۔ مدید	۱۰۔ رمل	۱۱۔ خفیف	۱۲۔ ہزج
۱۳۔ مضارع	۱۴۔ مقتضب	۱۵۔ مجتث	۱۶۔ متدارک		

16.5 بحر طویل

۱۔ وزن اصلی: **فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن فعول مفاعیلن**

اس بحر میں عربی شاعری تین اوزان پر ہوتی ہے اور وہ تین اوزان ہیں:

۱۔	**فعولن**	**مفاعیلن**	**فعولن**	**مفاعیلن**	**فعولن**	**مفاعیلن**	**فعولن**	**مفاعیلن**
۲۔	"	"	"	"	"	"	**مفاعلن**	
۳۔	"	"	"	"	"	"	**فعولن**	

ہم پڑھ چکے ہیں کہ شعر کے پہلے مصرعے کو صدر اور اس کے آخری تفعیلہ کو عروض کہتے ہیں اور شعر کے دوسرے مصرعے کو عجز (جیم

مضموم) اوراس کے آخری تفعیلہ کوضرب کہتے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ بحر طویل کے مستعمل تینوں اوزان میں عروض صحیح نہیں ہے بلکہ اس کا پانچواں حرف یعنی مفاعیلن کی یاء محذوف ہے۔ہم جان چکے ہیں کہ عروض کے پانچویں حرف کے حذف کوقبض اور ایسے عروض کومقبوض کہتے ہیں اور چونکہ اس بحر کے تینوں مستعمل اوزان کے عروض مقبوض ہیں لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس بحر کا ایک ہی عروض ہے جومقبوض ہے۔

اگران اوزان کے ضرب پر نظر ڈالیں تومعلوم ہوگا کہ پہلے وزن کا ضرب مفاعیلن ہے جوصحیح ہے دوسرے وزن کا ضرب مقبوض ہے یعنی عروض ہی جیسا ہے اور تیسرے وزن کا ضرب محذوف ہے۔تفعیلہ کے آخر سے سبب خفیف کے ساقط کرنے کوحذف کہتے ہیں۔مفاعیلن سے آخری سبب خفیف کوساقط کرنے سے مفاعی باقی رہا جووزن میں فعولن کے مساوی ہے۔

۲۔مثال: ولوأن ما أسعى لأدنى معيشة كفاني ولم أطلب ،قليل من المال

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: ولوأن نماأسعى لأدنى معيشتن كفاني ولمأطلب قليلن منل مالي

0/0// 0/0/0// 0/0// 0//0// 0/0// 0/0/0// 0/0// 0/0/0//

فعولن مفاعيلن فعولن مفاعلن فعولن مفاعيلن فعولن مفاعيلن

یہ شعر عروض مقبوضہ اور ضرب صحیح کی مثال ہے۔

۴۔ مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) على قدر أهل العزم تأتي العزائم وتأتي على قدر الكرام المكارم

(۲) أقيموا بني النعمان عنا صدوركم والاّ تقيموا صاغرين الرّؤوسا

نوٹ: مشق کے لیے دیے گئے ان دونوں شعروں میں عروض مقبوضہ اور ضرب مقبوض کی مثال ہے جب کہ دوسرا شعر عروض مقبوضہ ضرب محذوف کی مثال ہے۔گویا مشق اور مثال میں دیے گئے تینوں اشعار بحر طویل کے تینوں اوزان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

16.6 بحر متقارب

۱۔وزن اصلی: فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن

اس بحر میں تام اور مجزو دونوں طرح کے اشعار آتے ہیں۔البيت التام اس شعر کو کہتے ہیں جس کے اجزا میں سے کوئی جز کم نہ ہو اور البيت المجزوء اس شعر کو کہتے ہیں جس کے عروض اور ضرب یعنی دونوں مصرعوں کے آخری اجزا یا تفعیلات حذف کردیے گئے ہوں اور اس کے پہلے کے اجزا عروض اور ضرب بن گئے ہوں۔اس طرح یہ بحر تام بھی ہوتی ہے اور مجزو بھی۔متقارب تام کے مندرجہ ذیل چار اوزان ہیں۔

۱۔	فعولن	فعولن	فعولن	فعولن	فعولن	فعولن	فعولن	فعولن
۲۔	"	"	"			"	"	فعول
۳۔	"	"	"			"	"	فَعَلْ
۴۔	"	"	"			"	"	فَعْ

متقارب مجزو کے دو وزن ہے:

۱۔ فعولن فعولن فعل فعولن فعولن فَعَلْ

۲۔ فعولن فعولن فعل فعولن فعولن فَعْ

مذکور ٹیبل سے واضح ہے کہ بحر متقارب تام میں ایک عروض صحیحہ (فعولن) اور چار ضروب ہیں، ضرب اول صحیح (فعولن)، ضرب ثانی مقصور اور قصر یہ ہے کہ سبب خفیف (لُن) کے دوسرے حرف کو حذف اور پہلے کو ساکن کردیا جائے۔ اس طرح فَعُوْلَنْ فَعُلْ ہوجاتا ہے۔

تیسری ضرب (فَعَلْ) محذوف ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حذف تفعیلہ کے آخر سے سبب خفیف کو حذف کرنا ہے اس سے "فَعُوْلَنْ" "فَعُوْ" ہوجاتا ہے جو فَعَلْ کے مساوی ہے۔

چوتھی ضرب (فَعْ) ابتر ہے۔ یہ مرکب علت ہے جس میں حذف وقطع دونوں ہوتا ہے۔ حذف ہم جانتے ہیں قطع کا مطلب وتد مجموع کے آخر کو حذف کردیا جائے اور دوسرے حرف کو ساکن کردیا جائے، جیسے فاعلن سے فاعل جو مساوی ہے فعلن کے۔ مذکورہ مثال میں تفعیلہ فعولن ہے اس میں آخر کا (لُنْ) سبب خفیف حذف کردیا گیا اور وتد مجموع (فَعُوْ) کا آخر حرف کردیا گیا اور ثانی کو ساکن کردیا گیا تو (فَعْ) ہوگیا۔

متقارب مجزو ایک عروض محذوفہ ہے اور دو ضربیں ہیں پہلی ضرب محذوف اور دوسری ابتر ہے۔ اس طرح بحر متقارب میں دو عروض اور چھ ضربیں ہیں۔

۲۔مثال: فأمّا تميمٌ تميمُ بْنُ مرٍّ فَألفاهم القومُ رَوْبَى نِيَاما

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: فأمما تميمن تميمب نمررن فألفا همل‌قو مروبا نياما

0/0// 0/0// 0/0// 0/0// 0/0// 0/0// 0/0// 0/0//

فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن

متقارب تام کے دوسرے وزن کی مثال:

ويأوى إلى نسوة بائساتٍ وشعث مراضيع مِثلِ السعالْ

عروضی تحریر اور تقطیع: ويأوى إلى‌نس وتن‌با ئساتن وشعثن مراضى عمثلس سعال

0/0// 0/0// 0/0// 0/0// 0/0// 0/0// 0/0// 00//

فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولْ

متقارب تام کے تیسرے وزن کی مثال یہ شعر ہے۔

تَقَارَبْتُ إذ شَمَّرُوْا لِلذّهاب وَأَغلَقْتُ بِالصَّبْرِ بَابَ الحَرَج

متقارب تام کے چوتھے وزن کی مثال میں اس شعر کو پیش کیا جاسکتا ہے:

خَلِيْلَيَّ عوجا على رسم دار خلت من سلَيمَى ومِنْ مَيَّهْ

۴۔ مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) أأسماء لم تسألي عن أبي كِ وَالْقَومُ قد كان فيهم خُطُوبُ

(۲) إن غريبا وإن ساء ني أحب حبيب وأدنى قريب

16.7 بحر بسیط

۱۔وزن اصلی: مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن

یہ بحر تام بھی آتی ہے اور مجزو بھی آتی ہے۔ بسیط تام میں ایک عروض اور دو ضربیں ہوتی ہیں۔ اس کی عروض مخبونہ ہے۔ خبن کہتے ہیں تفعیلہ کے دوسرے حرف ساکن کے حذف کو یعنی فاعلن کا الف جس سے وہ فعلن ہو جاتا ہے۔ دونوں ضربوں میں سے پہلی ضرب ہی مخبون ہے جب کہ دوسری مقطوع ہے۔ لہذا ''فاعلن'' ''فاعل'' ہو گیا جو فَعْلُنَ کے مساوی ہے۔ تام بسیط کے دونوں اوزان یوں ہے:

۱۔ مستفعلن فاعلن مستفعلن فَعِلُنْ مستفعلن فاعلن مستفعلن فَعِلُنْ

۲۔ مستفعلن فاعلن مستفعلن فَعِلُنْ مستفعلن فاعلن مستفعلن فَعْلُنْ

۲۔مثال: ياحارِ لا أُرمَيَنْ منكم بِداهيةٍ لم يَلْقَها سُوقَةٌ قبلي ولامَلِك

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: ياحارلا أرمين منكمبدا هيتن لميلقها سوقتن قبليولا ملكو

0//0/0/ 0//0/ 0//0/0/ 0/// 0//0/0/ 0//0/ 0//0/0/ 0///

مستفعلن فاعلن مستفعلن فَعِلُنْ مستفعلن فاعلن مستفعلن فَعِلُنْ

بسیط تام کے دوسرے وزن کے شاہد کے طور پر اس شعر کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

قَدْ أَشْهَدُ الغارةَ الشَعْواءَ تَحمِلُنِيْ جَرداءُ مَعْرُوقَةُ اللَّحْيَيْنِ سُرحوبُ

اس شعر کی تقطیع اس طور پر ہوگی

قدأشهدل غارتش شعواءتح ملني جرداءمع روقتل لحيينسر حوبو

0//0/0/ 0//0/ 0//0/0/ 0/// 0//0/0/ 0//0/ 0//0/0/ 0/0/

مستفعلن فاعلن مستفعلن فعلن مستفعلن فاعلن مستفعلن فعلن

بحر بسیط مجزو کے دو عروض ہیں: پہلا صحیحہ اور دوسرا مقطوعہ۔ عروض مجزوءہ صحیحہ کی تین ضربیں ہیں اور مقطوعہ کی ایک ضرب ہے۔ اس طرح بحر بسیط کے مجموعی طور پر چھ اوزان ہوتے ہیں۔

۴۔ مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) يا دار مَيَّةَ بالعلياءِ فالسَّنَدِ أَقْوَتْ وَطَالَ عليها سَالِفُ الأَبَدِ

(۲) وقفت فيها أصيلاً كي أسائلها عيت جواباً وما بالربع من أحدِ

(۳) السيف أصدق أنباءً من الكتب في حده الحد بين الجدِّ واللَّعِبِ

(۴) رِيمٌ على القاعِ بَيْنَ البَانِ وَالعَلَمِ   أَحَلَّ سَفکَ دَمي في الأَشهرِ الحُرُمِ

16.8 بحر رجز

۱۔وزن اصلی: مستفعلن مستفعلن مستفعلن   مستفعلن مستفعلن مستفعلن

بحر رجز تام کے دو اوزان ہیں: پہلا صحیح العروض والضرب، دوسرا صحیح العروض مقطوع الضرب۔

پہلے وزن کی مثال:

دار لسَلمَى إذ سليمى جاره   قَفْرا تُرى آياتُها مثلَ الزُّبُرْ

رجز تام کے دوسرے وزن کی مثال جس کا ضرب مقطوع ہے:

القلبُ منها مُسْتَرِيحٌ سالمٌ   والقلبُ مِنِّي جاهد مجهودُ

دونوں میں پہلے شعر کی معروضی کتابت اور تقطیع آگے آرہی ہے اور دوسرے شعر کی حسب ذیل ہے:

القلبمن هامستري حن سالمن   ول قلبمن ي جاهدن مجهودو

مستفعلن مستفعلن مستفعلن   مستفعلن مستفعلن مفعولن

بحر رجز مجزو کا ایک وزن ہے اور وہ ہے صحیح العروض والضرب۔اس پر یہ شعر شاہد ہے۔

قد هاج قلبي منزل   من أم عمرو مقفر

اس کی عروضی کتابت اور تقطیع یوں ہوگی

قد هاج قل بي منزلن   من أم عم رن مقفرو

مستفعلن مستفعلن   مستفعلن مستفعلن

۲۔مثال: دار لسلمى إذ سليمى جارة   قفراً ترى آياتها مثل الزبر

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: دَارُنْ لِسَل مَاإِذْسَلَىْ مَا جَارَتُنْ   قَفْرَنْ تُرَى آيَاتُهَا مِثْلُزْ زُبُر

0//0/0/ 0//0/0/ 0//0/0/   0//0/0/ 0//0/0/ 0//0/0/

مستفعلن مستفعلن مستفعلن   مستفعلن مستفعلن مستفعلن

۴۔ مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) أَنْعَتُهَا إِنِّيَ مِنْ نُعَّاتِهَا   مندحَةَ السَّراتِ وادِ قاتها

(۲) مَكْفُوفَةَ الأَخْفَافِ مُجْمَراتها   سَابِغَةَ الْأَذْنَابِ ذَيَّا لاتِها

16.9 بحر سریع

۱۔وزن اصلی: مستفعلن مستفعلن مفعولات   مستفعلن مستفعلن مفعولات

اس بحر میں تام اور مشطور دو طرح کے اشعار آتے ہیں۔ البیت التام سے ہم واقف ہیں۔ البیت المشطور اس بیت یا شعر کو کہتے ہیں جس کا ایک مصرعہ حذف کر دیا گیا ہو اور اس میں ایک ہی مصرعہ رہ گیا ہو۔

الف سریع تام: بحر سریع تام کے چار اوزان ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔	مستفعلن	مستفعلن	فاعلن	مستفعلن	مستفعلن	فاعلان
۲۔	"	"	"	"	"	فاعلن
۳۔	"	"	"	"	"	فَعْلن
۴۔	"	"	فَعِلن	مستفعلن	مستفعلن	فَعِلن

اوزان کی اس ٹیبل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحر سریع تام میں دو عروض اور چار ضربیں ہیں۔

پہلا عروض مطویہ مکسوفہ ہے اور اس کا وزن فاعلن ہے۔

مطوية: اس عروض کو کہتے ہیں جسے (طي) لاحق ہو، طي چوتھے ساکن کے حذف کو کہتے ہیں۔

مکسوفة: اس عروض کو کہتے ہیں جس میں (کسف) ہو جس کا معنی ہے وتد مفروق کے آخر کا حذف۔ اس بحر کے وزن اصلی کا عروض مفعولات ہے جس کا چوتھا ساکن واو ہے جسے حذف کرنے پر "مَفْعولات" "مَفْعُلات" ہو گیا۔ وتد مفروق (لات) ہے جس کا آخر حذف کرنے سے یہ تفعیلہ (مَفعُلا) ہو گیا جو فاعلن کے مساوی ہے۔

اس عروض مطویہ مکسوفہ کی تین ضربیں ہیں:

۱۔ مطوی موقوف، موقوف اسے کہتے ہیں جس کو وقف لاحق ہے جس کا معنی ہے وتد مفروق کے آخر کو ساکن کرنا۔ اس طرح یہ ضرب طی کے سبب مَفْعُلات ہو جاتی ہے جیسا کہ اس کے عروض میں ہم نے ملاحظہ کیا، پھر وقف کی وجہ سے آخری تائے مضموم ساکن ہو جاتی ہے اور یہ تفعیلہ (مَفْعُلات) بن جاتا ہے جو کہ فاعلان کے مساوی ہے۔

۲۔ دوسرے ضرب مطوی (چوتھے ساکن کا حذف) مکسوف (وتد مفروق کے آخر کا حذف) ہے، لہذا یہ اپنے عروض ہی کی طرح (فاعلن) بن جاتا ہے۔

۳۔ تیسری ضرب أصلم ہے یعنی اسے صلم پیش آتا ہے جس کا معنی ہے تفعیلہ کے آخر سے وتد مفروق کو حذف کرنا ہے۔ مفعولات میں وتد مفروق (لات) ہے جس کے حذف کے بعد یہ تفعیلہ صرف (مفعو) رہ جاتا ہے جو (فعلن) کے مساوی ہے۔

بحر سریع تام کا دوسرا عروض مخبولہ مکسوفہ ہے۔ خبل و خبن (دوسرے ساکن کا حذف) اور طي (چوتھے کا حذف) سے مرکب ہے۔ خبل کے سبب یہ تفعیلہ (معلات) ہو جاتا ہے۔ یہ مکسوفہ بھی ہے لہذا وتد مفروق (لات) کا آخری بھی حذف ہو گیا اور تفعیلہ میں صرف (معلا) رہ گیا جو فعلن کے مساوی ہے۔

اس عروض میں ایک ہی ضرب ہے جو عروض ہی کی طرح مخبول و مکسوف یعنی (فعلن) کے وزن پر ہے۔

ب سریع مشطور:

ا۔	مستفعلن	مستفعلن	مفعولان
۲۔	"	"	مفعولن

سریع مشطور چونکہ ایک ہی مصرعہ پر مبنی ہوتا ہے لہذا اس میں عروض تو ہوتا ہے لیکن ضرب نہیں ہوتی ہے یا عروض ہی ضرب بھی ہوتا ہے۔سریع مشطور کے دو اوزان ہیں:

ا۔ عروض موقوفہ مشطورہ یعنی اس میں وقف (وتد مفروق کے آخر کی تسکین) ہوتا ہے لہذا (مفعولات) مفعولان میں متغیر ہوجاتا ہے۔

۲۔ عروض مکسوفہ مشطورہ چنانچہ کسف کے سبب مفعولات (مفعولا) سے بدل جاتا ہے جو مفعولن کے مساوی ہے۔

۲۔مثال: خمسون ألفا لا يُرَى منهم إلا قتيلٌ أو أسيرٌ جريحٌ

۳۔ عروضی تحریر اور تقطیع:

ذیل میں بحر سریع تام کے پہلے وزن پر مبنی مندرجہ بالا شعر کی عروضی تحریر و تقطیع پیش کی جارہی ہے۔

خمسون ال	فن لا يرى	منهمو	إلا قتي	لن أو أسي	رن جريح
0//0/0/	0//0/0/	0 / / 0 /	0//0/0/	0//0/0/	0 0 / / 0 /
مستفعلن	مستفعلن	فاعلن	مستفعلن	مستفعلن	فاعلان

۴۔ مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(ا) هَاجَ الهَوَى رسمٌ بِذاتِ الغَضَا مُخْلَوْلَقٌ مُسْتَعْجِمٌ مُحْوِلُ

یہ شعر بحر تام کے دیے گئے اوزان میں سے دوسرے وزن کی مثال ہے۔

(۲) قَالَتْ وَلَمْ تقصد لِقِيل الخَنَا مهلاً فقد أبلغت أسماعي

یہ شعر مذکورہ ٹیبل میں دیے گئے تیسرے وزن کی مثال ہے۔

16.10 بحر منسرح

ا۔وزن اصلی: مستفعلن مفعولات مستفعلن مستفعلن مفعولات مستفعلن

اس بحر میں تام اور منہوک اشعار آتے ہیں۔منہوک اس بیت یا شعر کو کہتے ہیں جس کا دو تہائی حصہ محذوف ہو۔یہ بحر رجز اور منسرح میں ہوتا ہے۔

الف منسرح تام:

اس کے دو وزن ہوتے ہیں:

مستفعلن	مفعولات	مستفعلن	مستفعلن	مفعولات	مفتعلن
"	"	"	"	"	مفعولن

منسرح تام میں ایک عروض ہوتا ہے جو صحیحہ (مستفعلن) ہے اور اس عروض کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

ا۔ پہلی ضرب مطوی (چوتھے ساکن کا حذف) ہے، جس سے (مستفعلن) مُسْتَعِلُن ہوجاتا ہے جو مفتعلن کے مساوی ہے۔

۲۔ دوسری ضرب مقطوع (وتد مجموع کے آخر کا حذف اور حرف ثانی کی تسکین) ہے جس سے (مستفعلن) مُسْتَفْعِلْ ہوجاتا ہے جو مفعولن کے مساوی ہے۔

ب منسرح منھوک:

اس کے دو اوزان ہے۔

ا۔ مستفعلن مفعولان

۲۔ مستفعلن مفعولن

مُنْسَرِح منھوک میں دو عروض ہوتے ہیں اور وہی دونوں ضرب بھی ہوتے ہیں۔

ا۔ پہلا عروض مَنْهُوكة موقوفة ہے (جس کے وتد مفروق کا آخر ساکن کر دیا گیا ہو جیسے (مفعولاتُ) سے مفعولاتْ جو مفعولان کے مساوی ہے۔

۲۔ دوسرا عروض منهوكة مكسوفة ہے (جس کے وتد مفروق کا آخری حرف محذوف ہو) اس طرح (مفعولات) سے مفعولا رہ جاتا ہے جو مفعولن کے مساوی ہے۔

۲۔مثال: إن ابن زيدٍ لازال مُسْتَعمِلا للخير يُشفي في مصره العُرُفا

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع:	ان نبزي	دن لازال	مستعملن	للخيريش	في في مصر	هلعرفا
	/0//0/	/0/0/0/	/0/0//0/	/0/0//0/	/0/0/0/	/0///0/
	مستفعلن	مفعولات	مستفعلن	مستفعلن	مفعولات	مفتعلن

یہ شعر بحر منسرح تام کے پہلے وزن کی مثال ہے۔

۴۔ مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) سرحت طرفي في حسن ذي غنج جنت به الباب الورى عجبا

یہ شعر بحر منسرح تام کے دوسرے وزن کی مثال ہے۔

(۲) مامثل قومي قوم إذا غضبوا عند قراع الحروب وانصرفوا

16.11 بحر کامل

ا۔وزن اصلی: متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

اس بحر میں تام اور مجزو دونوں قسم کے ابیات آتے ہیں۔

ا۔کامل تام: اس کے پانچ اوزان ہیں:

ا۔	متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن
۲۔	"	"	"	"	"	فعلاتن
۳۔	"	"	"	"	"	فَعْلن
۴۔	"	"	"	"	"	فَعِلن
۵۔	"	"	"	"	"	فَعْلُن

مذکورہ جدول سے ظاہر ہے کہ کامل تام کے پانچ اوزان ہیں اور دو عروض ہیں۔

ا۔ پہلا عروض تامہ صحیحہ (مُتَفَاعِلُنْ) ہے اور اس کی تین ضربیں ہیں۔ پہلی ضرب تام صحیح ہے جس کا وزن متفاعلن ہے۔ دوسری ضرب مقطوع ہے (جس کے وتد مجموع کا آخری حرف محذوف اور دوسرا ساکن ہو) لہذا یہ متفاعلن سے متفاعل ہوا جو فعلاتن کے برابر ہے۔ تیسری ضرب أحذّ مُضْمَر ہے اسے حَذَذ اور اضمار لاحق ہوئے ہیں۔

حذذ: پورے وتد مجموع کے حذف کو کہتے ہیں۔

اضمار: دوسرے متحرک کے ساکن کرنے کو کہتے ہیں۔

حذذ کے سبب متفاعلن کا (علن) حذف ہوگیا اور اضمار کے سبب اس کی تا ساکن ہوگئی لہذا متفاعلن (مُتْفا) ہوگیا جو فَعْلن کے مساوی ہے۔

۲۔ دوسرا عروض حذّاء ہے اور حذذ کے سبب (علن) ساقط ہوگیا اور (مُتَفا) مساوی ہے فَعِلن کے۔ اس عروض کی دو ضربیں ہیں پہلی اسی کی طرح اخذ ہیں لہذا یہ ضرب فعِلن ہوگئی اور دوسری ضرب أحذّ کے ساتھ ساتھ مضمر بھی ہے لہذا وہ فَعْلن (عین کے سکون کے ساتھ) ہوگئی۔

ب۔کامل مجزو:

ا۔	متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن	متفاعلاتن
۲۔	"	"	"	متفاعلان
۳۔	"	"	"	متفاعلن
۴۔	"	"	"	فعلاتن

کامل مجزو میں ایک ہی عروض ہے جو صحیحہ (متفاعلن) ہے اور اس کی چار ضربیں ہیں۔ پہلی ضرب مجزوء مُرَفَّل ہے۔ ترفیل وتد مجموع میں سبب خفیف کے اضافے کو کہتے ہیں جیسے متفاعلن کا (علن) وتد مجموع ہے اس میں لام کے بعد الف اور تا کا اضافہ کر دیا گیا تو یہ متفاعلاتن ہوگیا۔

دوسری ضرب مجزوء مذیل ہے۔ تذییل وتد مجموع میں حرف ساکن کے اضافے کو کہتے ہیں جیسے متفاعلن سے متفاعلان۔ تیسری ضرب مجزوء صحیح (متفاعلن) ہے اور چوتھی ضرب مجزوء مقطوع ہے، اسے قطع لاحق ہوا ہے جس کا معنی وتد مجموع کے آخر کا حذف اور

ثانی کا سکون ہے جس سے ''متفاعلن'' ''متفاعل'' ہو گیا جو فعِلاتن کے مساوی ہے۔

۲۔مثال: وإذا صحوت فما أقصّر عن ندیً وكما علمتِ شمائلي تكرمي

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: وإذاصحو تفماأقص صرعن ندن وكماعلم تشمائلي وتكررمي

0//0/// 0//0/// 0//0/// 0//0/// 0//0/// 0//0///

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

۴۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) والنفسُ راغبةٌ إذا رغَّبتها وإذا ترد إلی قليل تقنع

(۲) كم من جميع الشمل مُلْتَئِمُ الهوی كانوا بعيشٍ ناعم فتصدعوا

16.12 بحر وافر

۱۔وزن اصلی: مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن

بحر وافر کے اشعار تام اور مجزوء دونوں آتے ہیں۔عربی شاعری میں ایک وزن تام کا اور دو وزن مجزوء کے ملتے ہیں۔

الف۔ وافر تام:

مفاعلتن مفاعلتن فعولن مفاعلتن مفاعلتن فعولن

وافر تام میں عربی شاعری میں یہی ایک وزن ملتا ہے۔اس کا عروض مقطوف ہے۔

ب۔ وافر مجزو:

۱۔ مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن

۲۔ مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن

وافر مجزو کا بھی ایک ہی عروض مجزوءة صحيحه (مفاعلتن) ہے۔اس عروض کی دو ضربیں ہیں: پہلی اسی مثل مجزوء صحيح (مفاعلَتن) ہے اور دوسری مجزوء معصوب ہے۔معصوب اس ضرب کو کہتے ہیں جسے عصب لاحق ہو جس کا معنی پانچویں متحرک کو ساکن کرنا ہے لہذا یہ ضرب لام کے سکون کے ساتھ مفاعلْتن ہو جاتی ہے۔

۲۔مثال: وافر تام

وَقَدْعَلِمَ الْقَبَائِلُ مِنْ مَعَدٍّ إِذَا قُبَبٌ بِأَبْطَحِهَا بُنِيْنا

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: وقدعلمل قبائلمن معددن إذاقببن بأبطحها بنينا

0///0// 0///0// 0 / 0 / / 0///0// 0///0// 0 / 0 / /

مفاعلتن مفاعلتن فعولن مفاعلتن مفاعلتن فعولن

۴۔مثال: وافر مجزو

کتبت إلیک من بلدي کتاب مُوَلّهٍ کَمِدِ

۵۔عروضی تحریر اور تقطیع: کتبت إلی ک من بلدي کتاب مول لهن کمدي

0///0// 0///0// 0///0// 0///0//

مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن

نوٹ: بحر وافر شعری بحور میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے استعمال سے نغمگی، شیرینی اور لطافت پیدا ہوتی ہے۔اکثر شعری موضوعات کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔اس لیے قدما اور معاصرین سبھی نے اس کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔

۴۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) سَرَی لیلاً خیالٌ مِن سُلیمی فَأَرَّقَنِي وأصحابي هجودُ

(۲) فَبِتُّ أدیرُ أمري کلَّ حَالٍ وأرقب أهلها وَهُمُ بعیدُ

16.13 بحر مدید

۱۔وزن اصلی: فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن

۲۔مستعمل اوزان:

بحر مدید کے مستعمل اوزان چھ ہیں۔یہ بحر صرف مجزو استعمال ہوتی ہے جیسا کہ ذیل کے جدول سے ظاہر ہے۔

۱۔	فاعلاتن	فاعلن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن	فاعلاتن
۲۔	”	”	فاعلن	”	”	فاعلانْ
۳۔	”	”	”	”	”	فاعلن
۴۔	”	”	”	”	”	فعْلن
۵۔	”	”	فعِلن	”	”	فعِلن
۶۔	”	”	”	”	”	فعْلن

مذکورہ ٹیبل سے یہ امر واضح ہے کہ بحر مدید کے تین عروض ہیں۔

۱۔ پہلا عروض صحیحہ ہے اور اس کا وزن فاعلاتن ہے اور اس کی ایک ہی ضرب ہے وہ بھی اسی کے مانند صحیح (فاعلاتن) ہے۔

۲۔ دوسرا عروض محذوفۃ ہے اور اس کا وزن (فاعلن) ہے اور حذف تفعیلہ کے آخر سے سبب خفیف کے اسقاط کو کہتے ہیں چنانچہ حذف لاحق ہونے سے فاعلاتن صرف (فاعِلا) رہ جاتا ہے جو فاعلن کے مساوی ہے۔اس عروض کی تین ضربیں ہیں:

۱۔ پہلی ضرب مقصور ہے۔قصر (سبب کے دوسرے حرف کا اسقاط اور پہلے حرف کی تسکین) کے سبب فاعلاتن (فاعلات) میں بدل گیا جو

فاعلان کے مساوی ہے۔

ب۔ دوسری ضرب عروض ہی کی طرح محذوف ہے اوراس کا وزن فاعلن ہے۔

ج۔ تیسری ضرب ابتر ہے جو حذف اور قطع سے مرکب ہے۔حذف کی وجہ سے سبب خفیف (تن) ساقط ہوگیا اور فاعلارہ گیا پھر قطع کے سبب وتد مجموع (علا) کا آخر ساقط ہوگیا اور لام ساکن ہوگیا جس سے فاعلا (فاعلْ) ہوگیا جو فَعْلُنْ کے مساوی ہے۔

۳۔ تیسرا عروض محذوفة مخبونة ہے۔حذف کی وجہ سے فاعلاتن (فاعلا) ہوگیا اور خبن (دوسرے ساکن کا حذف) کی وجہ سے فاعلا (فعِلا) ہوگیا جو فَعِلُنْ کے مساوی ہے۔

اس عروض کی دو ضربیں ہیں:

ا۔ محذوف مخبون یہ عرض ہی کی طرح فَعِلُنْ کے وزن پر ہے۔

ب۔ دوسری ضرب ابتر ہے اوراس کا وزن فَعْلُنْ ہے جیسا کہ ابھی ابھی گزرا ہے۔

۳۔مثال: يالَبَكرٍ أنشِرُوا لِي كليباً يَا لَبَكرٍ أين أين الفِرارُ

۴۔عرضی تحریر اور تقطیع: يالَبَكرن أُنشرو لي كليبن يالبكرن أين أي نل فِرارُو

0/0//0/	0//0/	0/0//0/		0/0//0/	0//0/	0/0//0/
فاعلاتن	فاعلن	فاعلاتن		فاعلاتن	فاعلن	فاعلاتن

۵۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) لايَغُرَنَّ امْرَأً عَيْشَه كُلُّ عَيْشٍ صَائرٌ لِلزَّوَالُ

(۲) إعلموا أني لكم حافِظٌ شاهدا ماكنت أو غائبا

16.14 بحر رمل

ا۔وزن اصلی: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

بحر رمل تام اور مجزو دونوں طرح کے اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔عربی میں اس کے معروف و مستعمل اوزان حسب ذیل ہیں۔

ا۔ رمل تام:

ا۔	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن
۲۔	"	"	"	"	"	فاعلان
۳۔	"	"	"	"	"	فاعلن

بحر رمل تام کے تین اوزان ہیں۔اس میں ایک عروض اور تین ضربیں ہیں:

عروض: محذوفة (تفعیلہ کے آخر سے سبب خفیف کا اسقاط) ہے جس سے فاعلاتن (فاعلا) ہوجاتا ہے جو فاعلن کے مساوی ہے۔

اس عروض کی تین ضربیں ہیں جو حسب ذیل ہیں:

ا۔ پہلی تام صحیح ہے اور اس کا وزن فاعلاتن ہے۔

۲۔ دوسری تام مقصور ہے اور قصر (سبب خفیف کے دوسرے حرف کا اسقاط اور پہلے کی تسکین) کی وجہ سے یہ ضرب (فاعلان) ہوگئی۔

۳۔ تیسری ضرب محذوف ہے جو عروض کے مانند (فاعلن) کے وزن پر ہے۔

ب۔ رمل مجزو:

بحر رمل مجزو کے بھی تین اوزان ہیں۔

فاعلاتن	**فاعلاتن**	**فاعلاتن**	**فاعلاتان**
"	"	"	**فاعلاتان**
"	"	"	**فاعلن**

رمل مجزو کے مذکورہ اوزان سے پوری طرح واضح ہے کہ اس میں تام ہی کی طرح ایک عروض اور تین ضربیں ہیں:

عروض: **مجزوءة صحيحة** اور اس کا وزن **فاعلاتن** ہے اور اس کی تینوں ضربیں حسب ذیل ہیں:

ا۔ پہلی ضرب مُسَبّغ ہے اور تسبیغ کا معنی ہے کہ سبب حفیف میں ایک حرف ساکن بڑھا دیا جائے جس سے یہ تفعیلہ **فاعلاتن** سے **فاعلاتان** ہوجاتا ہے۔

۲۔ دوسری ضرب صحیح ہے اور اس کا وزن **فاعلاتن** ہے۔

۳۔ تیسری ضرب محذوف ہے اور اس کا وزن **فاعلن** ہے (**فاعلاتن۔فاعلا =فاعلن**)

۲۔مثال: **رُبَّ رکبٍ قَدْ أنا خوا حولنا   يشربون الخمر بالماء الزُّلالِ**

یہ شعر رمل تام کے تین اوزان میں سے پہلا وزن ہے۔

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع:

ربب ركبن	**قدأناخو**	**حولنا**	**يشربونل**	**خمربلما**	**ءززلالي**
/0/0//0	/0/0//0	/0//0	/0/0//0	/0/0//0	/0/0//0
فاعلاتن	**فاعلاتن**	**فاعلن**	**فاعلاتن**	**فاعلاتن**	**فاعلاتن**

دوسری مثال: **أيها المبعوث فينا جئت بالأمر المطاع**

یہ شعر رمل مجزو کے تینوں اوزان میں سے پہلا وزن ہے۔

عروضی تحریر اور تقطیع:

أيُيهَلْ مب	**عوث فينا**	**جئت بل أم**	**رل مطاعي**
/0/0//0	/0/0//0	/0/0//0	/0/0//0
فاعلاتن	**فاعلاتن**	**فاعلاتن**	**فاعلاتن**

۴۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(ا) قالت الخنساء لما جئتها شاب بعد رأس هذا واشتهب

نوٹ: یہ شعر رمل کے تام کے تیسرے وزن پر ہے۔

(۲) یا عروس المجد تيهي واسحبي في مغانينا ذلول الشهب

16.15 بحر خفیف

ا۔وزن اصلی: فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن

ا۔ خفیف تام:

فاعلاتن	مستفعلن	فاعلاتن	فاعلاتن	مستفعلن	فاعلاتن
"	"	"	"	"	فاعلن
"	"	فاعلن	"	"	فاعلن

بحر خفیف تام کے اس ٹیبل سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے تینوں اوزان میں دو عروض اور تین ضربیں ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

پہلا عروض: صحیحہ ہے اور اس کا وزن فاعلاتن ہے۔اس کی دو ضربیں ہیں۔پہلی ضرب عروض ہی کے مانند صحیح (فاعلاتن) ہے۔

دوسرا عروض: محذوفہ ہے اور اس کا وزن فاعلن ہے۔اس کی ایک ضرب ہے اور وہ بھی اسی کے مثل محذوف ہے اور فاعلن کے وزن پر ہے۔

ب۔ خفیف مجزو:

ا۔	فاعلاتن	مستفعلن	فاعلاتن	مستفعلن
۲۔	"	"	"	فعولن

بحر خفیف مجزو کے مذکورہ دونوں وزنوں میں ایک عروض اور دو ضربیں ہیں۔

عروض: صحیحہ ہے اور اس کا وزن مستفعلن ہے۔

پہلی ضرب عروض ہی کی طرح مجزو صحیح ہے۔

دوسری ضرب مخبون ومقصور ہے۔خبن حرف ثانی کے ساقط کرنے کو کہتے ہیں اور قصر سبب خفیف کے دوسرے حرف کے اسقاط کا نام ہے جس سے مستفعلن (فعولن) بن جاتا ہے (مُسْتَفْعِلُنْ۔مُتَفْعِلُنْ۔مُتَفْعِلْ= فعولن)

۲۔مثال: ليت شعري هل ثم هل آتينهم أم يحولن من دون ذاك الردى

یہ شعر بحر خفیف تام کے دوسرے وزن کی مثال ہے۔

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع:

ليت شعري	هل ثمم هل	آتينهم	أم يحولن	من دون ذا	كر ردا
0/0//0/	0//0/0/	0/0//0/	0/0//0/	0//0/0/	0 / / 0 /

فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن فاعلن

۴۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) قل لأسماء أنجري الميعادا وانظري أن تزودي منک زادا

(۲) أينما كنت أو حللت بأرض أو بلاد أحييتِ تلک البلادا

16.16 بحرہزج

۱۔وزن اصلی: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

بحرہزج مجزوہی استعمال ہوتی ہے۔اس صورت میں اس کے مندرجہ ذیل دواوزان ہیں:

۱۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

۲۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن

بحرمل مجزوکاایک عروض اوراس کی دوضربیں ہوتی ہیں جوحسب ذیل ہیں:

عروض: صحیحہ،اس کاوزن مفاعیلن ہے۔

پہلی ضرب: عروض کے مثل ہی ہےیعنی وہ بھی مفاعیلن کےوزن پر ہے۔

دوسری ضرب: محذوف ہےیعنی تفعیلہ کےآخر سےسبب خفیف ساقط ہے،اس طرح مفاعیلن-مفاعی=فعولن ہوگئی۔

۲۔مثال: صفحنا عن بني ذُهل وقلنا: القوم إخوان

۳۔عروضی تحریراورتقطیع: صفحناعن بني ذهلن وقلنلقو مإخوانو

0/0/0// 0/0/0// 0/0/0// 0/0/0//

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

۴۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) عرفت المنزل الخالي عفا من بعد أحوال

(۲) عفاه كل هتان عَسوفِ الوَبْل هطّال

16.17 بحرمضارع

۱۔وزن اصلی: مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن

بحرمضارع بھی صرف مجزوہی استعمال ہوتی ہے۔

۱۔ مفاعیل فاعلاتن مفاعیل فاعلاتن

۲۔ مفاعلن فاعلاتن مفاعلن فاعلاتن

ٹیبل میں دیے گئے بحر مضارع مجزو کے دونوں اوزان سے ظاہر ہے کہ ان میں ایک میں عروض اور ایک ہی ضرب ہے اور دونوں صحیح ہیں البتہ دونوں کے حشو (عروض اور ضرب کے ماسوا ارکان) الگ الگ ہیں۔ پہلے وزن میں حشو (مفاعیل) ہے جب کہ دوسرے وزن کا حشو مفاعلن ہے۔

۲۔مثال: وإن تدن منه شبراً يقربک منه باعاً

واضح رہے کہ یہ شعر پہلے وزن کے مطابق ہے۔

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: وإن تدن منه شبرن يقرريک منه باعا

/0/0// 0/0//0/ /0/0// 0/0//0/

مفاعيل فاعلاتن مفاعيل فاعلاتن

۴۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) دعاني إلى سعاد دواعي هوى سعاد

(۲) وإن جزتَ دارَ ليلى فلا تنس ذكر عهدی

(۳) سلام على ديارٍ بها نلت كل قصيدي

16.18 بحر مقتضب

۱۔وزن اصلی: مفعولات مستفعلن مستفعلن مفعولات مستفعلن مستفعلن

بحر مقتضب بھی لازماً مجزو ہی استعمال ہوتی ہے۔ اس صورت میں اس کا وزن یہ ہوتا ہے۔

فاعلات مفتعلن فاعلات مفتعلن

وزن اصلی اور وزن مستعمل میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں کو طي (چوتھے ساکن کا حذف) لاحق ہے جس سے وہ مستفعلن سے مُستعِلن ہو گیا وہ مفتعلن کے مساوی ہے۔

۲۔مثال: أَقْبَلَتْ فَلَاحَ لَهَا عارضان كَالسَبَجِ

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: اقبلت ف لاح لها عارضان كس سبجی

/0//0/ 0 / / / 0 / /0//0/ 0 / / / 0 /

فاعلات مفتعلن فاعلات مفتعلن

۴۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) حامل الهوى تعب يستخفه الطرب

(۲) تعجبين من سَقمي صحتيي هي العجب

16.19 بحر مجتث

۱۔وزن اصلی: مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن

یہ بحر بھی مجزو ہی استعمال ہوتی ہے۔اس صورت میں اس کا وزن یہ ہے۔

مستفعلن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن

۲۔مثال: البطن منها خمیصٌ والوجه مثلُ الهلال

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: البطن من ها خمیص ول وجه مث لل هلالي

0//0/0/ 0/0//0/ 0//0/0/ 0/0//0/

مستفعلن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن

۴۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) سمعت عنک حدیثا یارب لا کان صدقا

(۲) یاألف مولاي أهلا یا ألف مولاي رفقا

16.20 متدارک (بحر محدث)

۱۔وزن اصلی: فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

اس بحر سے تام اور مجزو دونوں قسم کے اشعار آتے ہیں۔

ا۔ متدارک تام:

فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

متدارک تام کا ایک ہی وزن ہوتا ہے جو صحیح العروض والضرب ہے اور ان کا وزن فاعلن ہے۔

ب۔ متدارک مجزو:

۱۔ فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فعلاتن

۲۔ " " " " " فاعلان

۳۔ " " " " " فاعلن

متدارک مجزو کے تین اوزان ہیں۔اس کا عروض مجزوءہ صحیحہ ہے اور اس کا وزن فاعلن ہے۔اس کی تین ضربیں ہیں:

۱۔ مخبون مُزَفَّل اور اس کا وزن فعلاتن ہے اسے خبن (دوسرے ساکن کا حذف) اور ترفیل (وتد مجموع پر سبب خفیف کا اضافہ) لاحق ہے جس سے یہ فاعلن۔فعلن۔فعلاتن ہوگیا۔

۲۔ مذھل ہے اور اس کا وزن فاعلان ہے۔تذییل سے عروضیوں کی مراد وتد مجموع (عِلُنْ) میں ایک حرف ساکن (الف) کا اضافہ ہے۔

۳۔ تیسری ضرب صحیح ہے چنانچہ اس کا وزن فاعلن ہے۔

۲۔مثال: زارني زورة طيفها في الكرى فاعتراني لمن زارني مااعترى

۳۔عروضی تحریر اور تقطیع: زارني زورتن طيفها فل كرى فعترا نيلمن زارني مع ترا

0//0/ 0//0/ 0//0/ 0//0/ 0//0/ 0//0/ 0//0/ 0//0/

فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

۴۔مشق: مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے:

(۱) عجبٌ عجبٌ عجبٌ عجبٌ بقر تمشي ولها ذنب

(۲) والنخل يرى فيه بلحٌ أيضا ويرى فيه رُطب

16.21 اکتسابی نتائج

خلیل بن احمد فراہیدی نے شعری اوزان کو ۱۵ بحروں میں تقسیم کیا جس پر اخفش نے ایک بحر کا اضافہ کیا۔ ان تمام بحروں کا ایک اصلی وزن ہے اور اس وزن کے عروض اور ضرب کے اعتبار سے مختلف اوزان بنتے ہیں۔ وہ سولہ ضربیں یہ ہیں۔

۱۔بحر طویل۔ اس کا اصلی وزن ہے:

فعولن مفاعيلن فعولن مفاعيلن فعولن مفاعيلن فعول مفاعيلن

اس بحر میں عربی شاعری تین اوزان پر ہوتی ہے۔

۲۔بحر متقارب۔ اس کا اصلی وزن ہے:

فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن

بحر متقارب تام اور مجزو میں منقسم ہے تام کے چار اوزان ہیں اور مجزو کے دو۔

۳۔بحر بسیط۔ اس کا وزن اصلی ہے:

مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن

یہ بحر بھی تام اور مجزو میں منقسم ہے۔اس کے مجموعی طور پر چھ اوزان ہوتے ہیں۔

۴۔بحر رجز۔ اس کا وزن اصلی ہے:

مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

بحر رجز تام کے دو اوزان ہیں اور بحر رجز مجزو کا ایک وزن ہے۔

۵۔بحر سریع۔ اس کا وزن اصلی ہے:

مستفعلن مستفعلن مفعولات مستفعلن مستفعلن مفعولات

یہ سریع تام اور سریع مشطور میں منقسم ہے اور اس کے چھ اوزان پر اشعار کہے جاتے ہیں۔

۶۔ بحر منسرح۔ اس کا وزن اصلی ہے:

مستفعلن مفعولات مستفعلن مستفعلن مفعولات مستفعلن

اس بحر میں تام اور منسرح کے اشعار آتے ہیں۔ منسرح تام اور منہوک ہر ایک کے دو اوزان ہیں۔

۷۔ بحر کامل۔ اس کا وزن ہے:

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

اس بحر میں تام کے پانچ اور مجزو کے چار اوزان ہیں۔

۸۔ بحر وافر۔ اس کا وزن اصلی ہے:

مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن

بحر وافر میں ایک وزن تام اور دو وزن مجزو کے ملتے ہیں۔ بحر وافر میں نغمگی پائی جاتی ہے اس لیے اس کے اوزان پر کثرت سے اشعار ملتے ہیں۔

۹۔ بحر مدید۔ اس کا وزن اصلی ہے:

فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن

بحر مدید کے مستعمل اوزان چھ ہیں۔ یہ بحر صرف مجزو استعمال ہوتی ہے۔

۱۰۔ بحر رمل۔ اس کا وزن اصلی ہے:

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

بحر رمل تام اور مجزو دونوں طرح کے اشعار پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر ایک کے تین اوزان ہیں۔

۱۱۔ بحر خفیف۔ اس کا وزن اصلی ہے:

• فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن

بحر خفیف تام کے تین اور مجزو کے دو اوزان ہیں۔

۱۲۔ بحر ہزج۔ اس کا وزن اصلی ہے:

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

بحر ہزج مجزو ہی استعمال ہوتی ہے اور اس کے دو اوزان ہیں۔

۱۳۔ بحر مضارع۔ اس کا وزن اصلی ہے:

مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن

بحر مضارع بھی صرف مجزو ہی استعمال ہوتی ہے اور اس کے دو اوزان ہیں۔

۱۴۔ بحر مقتضب ۔ اس کا وزن اصلی ہے:

مفعولات مستفعلن مستفعلن مفعولات مستفعلن مستفعلن

بحر مقتضب بھی لازماً مجزو ہی استعمال ہوتی ہے اور اس کا ایک ہی وزن ہے اور وہ یہ ہے:

فاعلات مفتعلن فاعلات مفتعلن

۱۵۔ بحر مجتث ۔ اس کا وزن اصلی ہے:

مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن

یہ بحر بھی مجزو ہی استعمال ہوتی ہے اور اس کا وزن ہے:

مستفعلن فاعلات مستفعلن فاعلات

۱۶۔ بحر متدارک۔ اس کا وزن اصلی ہے:

فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

اس بحر سے تام اور مجزو دونوں قسم کے اشعار آتے ہیں۔ بحر متدارک تام کا ایک ہی وزن ہے جب کہ مجزوء کے تین اوزان ہیں۔

16.22 امتحانی سوالات کے نمونے

۱۔ بحر کامل کا اصلی وزن تحریر کیجیے۔

۲۔ بحر کو بحر کیوں کہا جاتا ہے؟

۳۔ شعری بحریں کتنی ہیں؟ تمام کے بحروں نام تحریر کیجیے۔

۴۔ بحر رجز کا وزن اصلی تحریر کیجیے۔

۵۔ بحر وافر تام کا وزن تحریر کیجیے اور اس وزن پر ایک شعر کی تقطیع کیجیے۔

۶۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تقطیع کیجیے۔

(۱)	صنت نفسي عما يدنس نفسي	وترفعتُ عن جداكل جِبْسِ	(خفيف)
(۲)	وتما سكت صيد زعزعني الده	رالتماسا منه لتعسي ونكسي	(خفيفف)
(۳)	غزال من بني الأصفر	سباني طرفه الأحور	(هزج)
(۴)	عفاة كل هتان	عَسُوفِ الْوَبْلِ هَطَّال	(هزج)
(۵)	السيف أصدق أنباء من الكتب	في حده الحد بين الجد واللعب	(بسيط)
(۶)	إذا الشعب يوما أراد الحياة	فلا بد أن يستجيب القدر	(متقارب)
(۷)	ولا بد لليل أن ينجلي	ولابد للقيد أن ينكسر	(متقارب)

16.23 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

١۔	في علم القافية	د۔أمین علي السيد
٢۔	علم العروض و القافية	د۔عبد العزيز عتيق
٣۔	دراسات في العروض و القافية	عبدالله درويش
۴۔	محيط الدائرة في علم العروض و القافية	فان دایک الأمريكاني
۵۔	العروض الواضح وعلم القافية	د۔محمد علي الهاشمي
٦۔	معراج العروض	عارف حسن خاں

M.A. Arabic: II Semester Examination Model Paper

Paper: MAAR202CCT Rhetoric and Prosody

Time: 3Hrs　　　　Marks: 70

ملاحظة:　　اشتملت هذه الورقة على ثلاثة أجزاء، تلزم الإجابة من كل جزء وفق التعليمات.

جزء "الألف" (10 × 1 = 10)

1. اختر الجواب الصحيح من بين الخيارات فيما يلي من الأسئلة.

i. مؤلف الكتاب "الصناعتين":

(A) أبو هلال العسكري　　(B) ابن طباطبا

(C) الرماني　　(D) الباقلاني

ii. توافق الفاصلتين في اللفظ الأخير:

(A) الكناية　　(B) السجع

(C) الإيجاز　　(D) المقابلة

iii. "البلاغة: تطور و تاريخ" ألفه:

(A) قدامة بن جعفر　　(B) شوقي ضيف

(C) العقاد　　(D) الجاحظ

iv. من أبرز ميزات "الأسلوب العلمي":

(A) الجمال　　(B) روعة الخيال

(C) المنطق السليم　　(D) التصوير الدقيق

v. ما حذفت منه الأداة و وجه الشبه:

(A) التشبيه المرسل　　(B) التشبيه المؤكد

(C) التشبيه البليغ　　(D) التشبيه المجمل

vi. "البديع" كتاب:

(A) ابن المعتز　　(B) المازني

(C) شوقي ضيف　　(D) الجاحظ

vii. اللفظ المستعمل في غير ما وضع له:

(A) المجاز　　(B) التشبيه

(C) الاقتباس　　(D) الإطناب

viii. زيادة اللفظ على المعنى لفائدة:

(A) الجناس (B) التورية

(C) الاقتباس (D) الإطناب

ix. الجمال والتصوير الدقيق من أبرز صفات:

(A) الأسلوب العلمي (B) الأسلوب الأدبي

(C) الأسلوب الخطابي (D) تشبيه التمثيل

x. مؤلف كتاب "البديع":

(A) الجاحظ (B) العسكري

(C) ابن قتيبة (D) ابن المعتز

جزء " ب" (5 × 6 = 30)

2. أجب عن خمسة أسئلة مما يلي، ولكل سؤال ست علامات.

i. عرف التشبيه وأنواعه مع ذكر الأمثلة.

ii. اذكر تعريف التورية مع الأمثلة.

iii. اذكر تعريف الاقتباس مع الأمثلة.

iv. ماذا تعرف عن الاستعارة؟ اكتب مع الأمثلة.

v. عرف الأسلوب واكتب خصائص الأسلوب الأدبي بالإيجاز.

vi. ماذا تفهم من الجناس؟ اكتب مع ذكر الأمثلة.

vii. عرف البحر الطويل واكتب وزنه مع تقطيع بيت من اختيارك.

viii. ما الفرق بين الخبر والإنشاء؟ اكتب مع ذكر أغراض إلقاء الخبر.

جزء " ج" (3×10 = 30)

3. أجب عن ثلاثة أسئلة فقط، ولكل سؤال عشر علامات.

i. عرف علم العروض لغة واصطلاحا، واكتب أسماء البحور الشعرية كما وضعها الخليل بن أحمد الفراهيدي.

ii. اكتب مقالة وجيزة عن تطور علم البلاغة عبر العصور.

iii. ما هي المحسنات اللفظية؟ عرف كل واحد منها مع الأمثلة.

iv. ماذا تعرف عن المجاز المرسل وعلاقاته؟ واذكر الأمثلة.

v. عرف البحر لغة واصطلاحا، واذكر أسماء البحور الشعرية مع كتابة أوزان البحر الوافر.